Complete Works

Of

Zia Fatehabadi

(Volume 1)

Urdu Poetry

(Front Cover)

کُلیاتِ ضیا فتح آبادی

باب ۱

(اردو شاعری)

The Complete Works of Zia Fatehabadi

Volume I

(Urdu Poetry)

کُلیاتِ ضیا فتح آبادی

ضیا فتح آبادی

ضیا معمولی شاعر نہیں ہیں- وہ ہر بات بہت بلندی سے کہتے ہیں-
زباں شستہ و پاکیزہ اور خیالات لطیف ہیں- دل میں جذبۂ ہمدردئ
انساں بے پا یاں ہے اور ایسا ہی شاعر مُلک و قوم کے لئے باعثِ فخر
ہوا کرتا ہے-

ابر احسنی گنّوری

۱۰ جون ۱۹٦۳

کُلیاتِ ضیا فتح آبادی

(اردو شاعری)

مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کے قطعات، رباعیات، پابند و آزاد نظمیں، غزلیں، گیت اور سونیٹ جو 'طلوُع'، 'نورِ مشرق'، 'ضیا کے سو شعر'، 'نئی صبح'، 'گردِ راہ'، 'رنگ و نور'، 'سوچ کا سفر'، اور 'نرم گرم ہوائیں' میں شامل ہیں.

ناشر :

بزمِ سیماب

نئی دہلی

فہرس

طلوُع

(قطعات جناب ضیا فتح آبادی)

بہ سلسلہ مطبوعات " ادبی مرکز " میرٹھ

شمارہ نمبر (۳)

۱۹۳۳

تعارف

آئیے آپ کو عصرِ موجود کے محشرِ علم و عمل میں ایک ایسے شخص سے ملائیں جو آج سے پہلے کبھی میدان میں نظر آنے کی طرح نظر نہیں آیا، بیٹھئے، آپ کو گلزارِ ادبیات کے اُس عندلیبِ خوش نَوا کے گیت سُنائیں جس کا دل اچھُوتے نغموں کی ایک لازوال دُنیا ہے اور جس کی خاموشی ایک عظیم گویائی کا مقدمہ معلوم ہوتی ہے

....کسی شاعر کی عظمت اُسکے "ذوق" کی صحت، "مطالعہ" کی گہرائی اور "مشاہدہ" کے روشن و عمیق ہونے سے ہوا کرتی ہے مجھے یہ دیکھکر روحانی مسرّت ہے کہ جناب ضیا فتح آبادی شاعرانہ معیار پر سہی اُترتے ہیں اور ہر چند کہ انکی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جس کو ہرگز ان کا اصلی کام قرار نہیں دیا جا سکتا مگر یہ ضرور بتاتی ہے کہ وہ اپنے اندر کافی سے زیادہ قدرت اس راہ میں کامیاب سفر کرنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی رکھتے ہیں ان کے قطعات میں تاشیراتِ مجاز،ادغام حسن و عشق، دحدت و محبّت، درد، لذّتِ استغنا اور گہرے محسوسات کی چاشنی نمایاں طور پر کام کر رہی ہے- رُوحانی طور پر ان کے قطعات صحیح اور فنیّ طور پر اغلاط سے پاک ہیں اور اکثر جگہ وہ شیرنی و بلندی پائی جاتی ہے جو کامیاب شاعر کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے وہ گوارائی اور استغنا بھی ان کے قطعات کی روحِ رواں ہے جو شاعر کا اصل اصُول ہوتا ہے – وہ انسان کو پیغامِ عمل بھی دیتے ہیں اور "رہبانیت" کے خلاف ہیں، زندگی کے مطلق ان کا مشاہدہ نہایت صحیح اور روشن ہے کہیں فنا کی تعلیم بھی ہے اور ان کا آخری قطعہ قربانی اور اشیار کا ایک لطیف پیغام ہے-

بہر حال مجموعی طور پر ہمارے شاعر کی یہ سعئ مستحسن ہے اور ہم کو کشادہ دلی سے خیر مقدم کرنا چاہئے کیونکہ ہمیں پنجاب کے مضافات میں رہنے والے "ضیا" کو "آفتاب" کی شکل میں دیکھنا ہے-

ساغر نظامی

ادبی مرکز، میرٹھ

آرزو کا نہ خوُن کر ساقی

دل دُکھانے سے کچھ تو ڈر ساقی

دیکھ گھنگھور وہ گھٹا آیئ

لا صراحی، پیالہ بھر ساقی

کر کیف کی خلّاقی ساقی

حسرت نہ رہے باقی ساقی

یوں دوَر ہو جامِ رنگیں کا

ہر لب پر ہو ساقی ساقی

چمن میں شور ہے ابرِ بہار آیا ہے

جہانِ گنچۂ و گل پر نِکھار آیا ہے

پیالہ تُو بھی مئے ارغواں سے بھر ساقی

کہ پرُ اُمید تِرا میگسار آیا ہے

کام شام و سحر ہے مستی سے

میں ہوں آزاد رنجِ ہستی سے

کیوں میں، اے فکرِ باطلِ فردا!

باز آ جاؤں مے پرستی سے

لے کالی گھٹائیں آئی ہیں

پرُ کیف ہوائیں لائی ہیں

لا بادۂ و مینا لا ساقی

ہر سمت بہاریں چھائی ہیں

دَور میں جامِ ارغوانی ہے

صحبتِ عیشِ جاودانی ہے

کیا ڈراتا ہے مجھ کو اے واعظ

میں جواں ہوں، مِری جوانی ہے

ہے غُلامی سے اسیری اچّھی

اور امیری سے فقیری اچّھی

جس میں حاصل نہ ہو آرام ضیا!

اُس جوانی سے تو پیری اچّھی

جھٹپٹا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

آسماں پر خِرام بادل کا

جان و دل کو خرید لیتی ہے

ایسے عالم میں بانسری کی صدا

جب جہاں محوِ خواب ہوتا ہے

بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے

موت دُنیا پہ دیکھ کر طاری

میں بھی روتا ہوں، دل بھی روتا ہے

شب کی تاریکیوں میں گمُ ہے جہاں

حُکمراں ہر طرف ہے خوابِ گراں

میری آنکھیں لگی ہیں تاروں سے

یہ بھی میری طرح ہیں سوز بجاں

ہے مُخالف اگر جہاں، پھر کیا

تیغ برسر ہے آسماں، پھر کیا

پانوٗں میرے نہ ڈگمگائیں گے

سخت مشکل ہے اِمتحاں، پھر کیا

داستانِ الم سُنا دوں گا

داغ ہائے جگر دکھا دوں گا

وقت کا انتظار ہے مجھکو

پردۂ راز خود اُٹھا دوں گا

سوزِ مطلق ہے داستاں میری

کہہ سکےگی نہ کچھ زباں میری

ابھی آتِشکدے میں دل کے ضیا!

بند ہے آتِشِ نِہاں میری

ہے مُخالف ہوا زمانے کی

اُن کو عادت ہے دل دُکھانے کی

اے ضیا! کام لے تحمُّل سے

ہے ضرورت یہاں نِبھانے کی

اپنی دُھن ہی میں مست رہنے دو

زحمتِ اضطراب سہنے دو

میرے بارے میں دوستو! تم سے

کوئی کہتا ہے کچھ تو کہنے دو

شمعِ احساس جلتی رہتی ہے

آگ دل میں اُبلتی رہتی ہے

لب پر آتا نہیں مگر شکوہ

چُپکے چُپکے پِگھلتی رہتی ہے

واقفِ عیش و غم شناسا ہے
نُور و ظلمت کا آئینہ سا ہے
حاملِ وسعت و نشیب و فراز
دل کی دُنیا عجیب دُنیا ہے

ابر چھایا ہے آسماں پہ ضیا
اور کیف آفریں ہے بادِ صبا
آرزوئیں ہیں اضطراب انگیز
کیا بتاؤں کہ چاہتا ہوں کیا

رات، اُف کس قدر ہے ظلمت کوش
ہیبیت افزا، ڈراونی، خاموش
دُور اِس وقت گا رہا ہے کوئی
میں سراپا بنا ہوا ہوں گوش

یہ مانا خموشی سے سب کچھ سہے گا
نہ اپنی زباں سے کبھی کچھ کہے گا
مگر تیری غمّاز نظروں سے اے دل
عیاں راز اُلفت کا ہو کر رہے گا

تجربہ ایک بار کر دیکھو
دل کو بے اختیار کر دیکھو
مجھ سے کیا پوچھتے ہو حالِ فراق
ایک دِن انتظار کر دیکھو

حُسن کو بدگمان ہونا ہے
عشق کا امتحان ہونا ہے
صبر کر اے ضیا! ابھی تیری
حسرتوں کو جوان ہونا ہے

زندگی نذرِ جامِ اُلفت ہے
یہ بھی مِل جائے تو غنیمت ہے
عشرتِ جان و دل سمجھ اِسکو
ورنہ دُنیا نہیں، مصیبت ہے

سر میں سودائے جستجو بھی ہے
دل میں مِٹنے کی آرزو بھی ہے
موردِ مرگ زندگی ہے ضیا!
ذوقِ غم بھی، مزاقِ ہُو بھی ہے

قتل کرنا ہے اگر، کر بھی دے

ہدفِ تیغِ نظر کر بھی دے

ناوکِ غمزۂ دل دوز کی خیر

ٹکڑے دل اور جگر کر بھی دے

روئے رنگیں ذرا دکھائیں تو

میرے دل کی خلِش مٹائیں تو

ساتھ غیروں کے ہی سہی، لیکن

وہ ضیا! ایک بار آئیں تو

داستانِ الم سُناؤں کِسے

داغ ہائے جگر دِکھاؤں کِسے

کوئی اپنا نہیں ہے دُنیا میں

رازداں اپنا میں بناؤں کِسے

عشق اور حُسن کو جدا سمجھے

آہ، سمجھے بھی یہ تو کیا سمجھے

میری دیوانگی پہ خنداں ہیں

"ہوش" اور "عقل" سے خدا سمجھے

درد کو ہم کنار کرتا ہوں

رات ِدن انتظار کرتا ہوں

سادہ لوہی مری کوئی دیکھے

حُسن کا اعتبار کرتا ہوں

حاصلِ سعیِ نا تمام نہ پوچھ

لذّتِ آرزوئے خام نہ پوچھ

دیکھ ہونٹوں پہ رنگِ بتخالہ

حالِ اُمیدِ تشنہ کام نہ پوچھ

مجھ سے پوچھو کہ "عشق" چیز ہے کیا؟

اور کہتے ہیں کِس بَلا کو وفا

اُن حسینوں کو کیا خبر اس کی

جن کے پیش نظر ہے صرف جفا

کون اپنا ہے یہاں اور کِسے بیگانہ کہوں

لب تک آ پہنچی ہے جو بات کہوں یا نہ کہوں

اے ضیا!عالمِ ہستی میں ہے نفسی نفسی

آہ کس سے دلِ پُر درد کا افسانہ کہوں

مفلسی کا گلہ کروں توبہ

بے بسی کا گلہ کروں توبہ

بے وطن ہوں وطن سے کوسوں دُور

پھر کسی کا گلہ کروں توبہ

آسماں سے مجھے شکایت ہے

باغباں سے مجھے شکایت ہے

پُر ہے شکووں سے داستاں میری

اک جہاں سے مجھے شکایت ہے

عاصیوں کی سزا یقینی ہے

ہر مَرض کی دوا یقینی ہے

ہے خدا کے یہاں اگر انصاف

ظلم کی انتہا یقینی ہے

رات بھر آسماں ڈراتا ہے

اور دِن آگ میں جلاتا ہے

میری نا کامیاں کوئی دیکھے

زندگی سے بھی خوف آتا ہے

حق و باطل میں امتیاز بھی ہے

ناز بھی مجھ میں ہے، نیاز بھی ہے

خود ہی ہستی کی سجدہ گاہ ہوں میں

اور پھر حسرتِ نماز بھی ہے

کام دیتی نہیں ہے کچھ تقدیر

ساتھ جب تک نہ اُس کے ہو تدبیر

ہے میرا تجربہ کہ دونوں میں

ایک پَر ہے تو ایک نوکِ تیر

اک طرف خار زار، عصیاں کا

اک طرف باغ، دین و ایماں کا

کار گاہِ جہاں میں شام و سحر

امتحاں ہو رہا ہے انساں کا

ہے انسان مجسّم کمالِ الہیٰ

امینِ صفات و جلالِ الہیٰ

نگاہِ بصیرت سے کر غور غافل

تُجھی میں چُھپا ہے جمالِ الہیٰ

فلسفی سے غرض نہیں ہے مجھے

مدّعی سے غرض نہیں ہے مجھے

مَیں تو جویا ہوں حُسنِ فطرت کا

اور کِسی سے غرض نہیں ہے مجھے

موت کو زندگی سمجھتا ہوں

بے خودی کو خودی سمجھتا ہوں

حُسن کو دیکھتا ہوں ہر شے میں

رنج کو بھی خوشی سمجھتا ہوں

سر سبز ہے گلزارِ جہاں ابرِ کرم سے

ہر پھُول یہاں کا ہے حسیں باغِ ارم سے

بے جسم بھی با جسم بھی ہے تیری تجلّی

یہ راز کُھلا سیرِ کلیسا و حرم سے

صبحِ مشرق سے آفتاب آیا

دَورِ بیدار ہمرکاب آیا

خوابِ غفلت سے آنکھ کھول ضیا!

دیکھ دُنیا میں انقلاب آیا

فائدہ کیا تمہارے ڈرنے سے
رات دن آہِ سرد بھرنے سے
ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے ہو،
کچھ نہیں ہوتا کچھ نہ کرنے سے

دست و پا تو ہِلائے حضرت
کچھ مشقّت اُٹھائے حضرت
وقت باتوں کا اب نہیں باقی
کام کر کے دِکھائے حضرت

قیدِ مزہب سے جو رہے آزاد
نہیں ممکن وہ مُلک ہو برباد
ٹکڑے ہوتی ہے اس سے "جمعیت"
قومیت اس سے ہوتی ہے ناشاد

آنکھوں سے اشکِ گرم کہاں تک بہایئے
تکمیلِ ذوق ہو چُکی، بس باز آیئے
دُنیا میں رہ کے دیکھیئے دُنیا کی محفلیں
جنگل میں جا کے خاک نہ ہر سوُ اُڑائیے

آ رہا ہوں کدھر سے، کیا معلوم

جا رہا ہوں کہاں، خدا معلوم

نہ مرے ساتھ کوئی رہبر ہے

نہ مجھے اپنا راستہ معلوم

ناامیدی ہے، بے قراری ہے

دِن پہاڑ اور رات بھاری ہے

لیکن اس پر بھی لطف یہ ہے ضیا!

زندگی جان سے بھی پیاری ہے

نشیبِ دہر، فرازِ جہاں کو دیکھ لیا

نشاط و عیش و سرور و فغاں کو دیکھ لیا

ہر ایک دستِ فنا کی گرفت میں ہے ضیا!

مکیں کو دیکھ لیا اور مکاں کو دیکھ لیا

راز اس زندگی کا کیا معلوم

کیا طلِسمات ہے خُدا معلوم

کام انساں کا خود پرستی ہے

اس سے بڑھ کر نہ کچھ ہوا معلوم

دیکھ کر بے نقاب جلوۂ نور

ہو گیا تھا سیاہ دامنِ طور

اس سے شابت ہوا کہ دُنیا میں

ظلمتیں بھی ہیں نور میں مستور

وہم ہے ہستئ باطل اپنی

چمن اپنا ہے نہ محفل اپنی

دم پہنچ کر وہیں ہم لیں گے ضیا!

قبر ہے آخری منزل اپنی

کہیں ماتم ہے، کہیں شادی ہے

کوئی نالاں، کوئی فریادی ہے

اب حقیقت یہ کُھلی مجھ پہ ضیا!

نام ویرانے کا آبادی ہے

ناشاد نہ ہو دھر سے جانے والے

پاتے ہیں خوشی رنج اُٹھانے والے

کر دیتے ہیں زندگی جو اپنی برباد

رکھتے ہیں اُنھیں یاد زمانے والے

نورِ مشرق

ضیا فتح آبادی کی نظمیں، گیت و سونیٹ

ناشر: جیوتی پرساد گپتا- گپتا پرنٹنگ ورکس، اسپلنڈ روڈ- دہلی

اشاعتِ اول دسمبر ۱۹۳۷

تعارف

مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کو میں کئی وجوہ سے عزیز رکھتا ہوں پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اُنکا قلب صاف اور وسیح ہے جسے سجہ و زنّار کی احمقانہ کشاکش سے دُور کا بھی واسطہ نہیں وہ مادرِ وطن کے سچے پرستار ہیں اور "ہندوستانی" کے سوا اور کچھ نہیں ہیں

اگر ہم، ہندوؤں اور مسلمانوں، میں یہ روح بیدار ہو جائے تو آج ہی بیڑا پار ہو جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر چند وہ ابھی نوجوان ہیں مگر ان کے تفکّر میں اُس پختگی و رسیدگی کے وہ علامات پیدا ہو چلے ہیں جو تجربہ کار پیرانہ سالی کا حصّہ ہوتے ہیں

ہر وہ شخص، جس کا دماغ اُس سے زیادہ سن رسیدہ ہو، قابلِ محبّت و عقیدت ہوا کرتا ہے

تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اُن چند گنتی کے شعرا میں سے ہیں جنہیں بخت کی یاوری اور قدرت کی فیاضی سے شاعری کا صحیح راستہ معلوم ہو گیا ہے اُن کا کلام غزل گوئی کی غیر فطری مسخرگی سے قطعاً پاک ہوتا ہے جو کچھ مطالعہ یا محسوس کرتے ہیں اُسی کو کہتے ہیں اور اس انداز سے کہتے ہیں جو دل نشین ہوتا ہے

تراکیب کی چُستی، معانی و الفاظ کی ہم آہنگی، الفاظ کی ترتیب و نشست، اندازِ بیان کی روانی و موسیقی اور طرزِ سخن کی ہمواری، تمام چیزیں، ظاہر ہے کہ مشاّقی کے نقطۂ عروض پر پیدا ہوتی ہیں ضیا صاحب نوجوان ہیں اور نو مشق اس لئے موجودہ حالات میں اُن سے تمام مندرجۂ بالا محاسن کی توقع رکھنا قبل از وقت ہے لیکن اُنکی نظموں کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ اگر اُن کی مشق اسی طرح جادۂ صحیح پر گامزن رہی اور اُن میں وہ پندارِ کمال پیدا نہ ہو گیا جو اکثر و بیشتر اُن کے سے طباّع اور خشگو شعرا میں، احباب کی تحسین و آفریں سے، پیدا ہو جایا کرتا ہے، تو یہ ایک یقینی بات ہے کہ وہ ہندوستان کے ممتاز شعرا میں سے شمار ہونے لگیں گے

ضیا صاحب نے، اس میں کوئی شک نہیں، ایک صحیح راستہ اختیار کیا ہے لیکن میں اُنھیں مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کی راہ میں ایک پتھر بھی موجود ہے اور وہ ہے نوجوانی کے با وصف اُن کی سادگی و سلامت روی جس پر نگاہ کر کے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب اور اپنے موسم کے ساتھ خلوص نہیں رکہتے ہیں ہر چند یہ خوشی کی بات ہے کہ اب تک ایسی کوئی شہادت فراہم نہیں ہوئی ہے جس سے یہ شابت ہوتا کہ وہ اپنی جوانی اور اپنے موسم کے، بعض دیگر "صالح" نو جوانوں کی طرح، باغی بھی ہیں پھر بھی اپنی فصلِ بہار سے خلوص نہ رکہنا ایک ایسی چیز ہے جو شاعر کے ادبی مستقبل کو بے سواد بنا دینے کی دہمکی دیتی رہتی ہے

بہر حال یہ ایک نہایت ہی باریک قسم کی موشگافی ہے جس پر میں سرِ دست زور دینا پسند نہیں کرتا کیونکہ ہنوز اس کا امکان باقی ہے کہ ضیا صاحب خود اپنی راہ کے پتھر کو ہٹا کر اپنے شباب سے مصالحت کر لیں

جہاں تک ضیا صاحب کے کلام کا تعلق ہے میں دوبارہ عرض کروں گا کہ وہ ہر طرح اس کا مستحق ہے کہ ہندوستانی زبان کے قدردان اُسے ہاتھوں ہاتھ لیکر اُنکی ہمّت افزائی کریں اور خاص طور سے اُنھیں مبارک باد دیں کہ فرسودہ و نقّالنہ شاعری کے ماحول میں رہتے ہوئے اُنہوں نے وہ راہ اختیار کی ہے جو حقیقی و فطری اور زندگی سے ہم آہنگ ہے

قوّت و حیات اُنھیں تا دیر سلامت رکھے اور وہ اُس منزل کو پا لیں جس کا راستہ اُنھیں مل گیا ہے

ایں دعاازمن وازجملہ جہاں آمین باد!

جوش ملیح آبادی

ایڈیٹر "کلیم" دہلی ۱۸ دسمبر ۱۹۳۸

شاعر سجدے میں

(شاعر کی تکمیل صرف اس وقت ہی ممکن ہے جب شاعر اپنے ماحول کی حقیر سے حقیر چیز کی پرستِش کرنے لگے)

اے زمیں، اے آسماں، اے زندگی، اے کائنات

اے ہوا، اے موجِ دریا، اے نشاطِ بے شبات

اے پہاڑوں کی بلندی، اے سرودِ آبشار

اے گھٹا جھومی ہوئی، اے نغمہ برلب جوئبار

اے مسّرت خیز وادی، اے فضائے کیف ریز

اے دلِ آبادِ وحشت، اے رگوں کے خونِ تیز

اے بساطِ ریگِ صحرا، بے کس و بے خانماں!

اے بگولوں کے مسلسل رقص، اے سیلِ رواں

اے سمندر ہر طرف آغوش پھیلائے ہوئے!

اے حوادش کے تھپیڑے روز و شب کھائے ہوئے

اے بہارِ صحنِ گلشن، اے نظامِ رنگ و بُو

اے گلوں کی سادگی، اے بلبلوں کی آرزو

اے پھلوں کے بوجھ سے سربر زمیں شاخِ شجر

اے پریشاں زلفِ سُنبل، چشمِ نرگس بے بصر

اے عروسِ صبحِ مستی شامِ بزم مے کدہ

اے جوانی کی نظر، دزدیدہ و ہوشو آزما

اے ستاروں کی چمک، اے گردشِ خورشید و ماہ

اے سرورِ بے گناہی، اے تقاضائے گناہ

اے دلِ بے تاب، اے موہومِ اُمیدِ سکوں

اے سکوتِ یاس، اے طوفانِ امواجِ جنوں

اے وقارِ حُسن، بزمِ زیست پر چھائے ہوئے

اے جنونِ عشق، سرد آہوں سے گرمائے ہوئے

اے نگاہِ مست و بیخود، مائلِ تخریبِ ہوش!

اے نیازِ میکاشانِ زیست، نازِ مے فروش

اے چراغِ آرزو، اے بزمِ ہستی کے شباب

اے پرِ پروانہ، اے رقصِ نشاطِ کامیاب

اے حرم، اے دیر، اے مزہب کے اندازِ حسیں

اے تخیل کی بلندی کے فریبِ بہتریں

اے فلک پر اُڑنے والے طائرانِ خوش جمال

اے زمیں پر رینگنے والے وجودِ بے مقال

اے قفس میں پلنے والے، بے زباں و بے اماں

اے اسیرانِ محن، مفلس، غریب و نا تواں

اے غمِ ایّام، اے فکرِ حصولِ روزگار

اے خیابانِ عمل، اے بازوئے مصروفِ کار

اے خمارِ بادۂ دولت میں بے ہوش و حواس

اے کہ تم سے ذرّہ ذرّہ زندگی کا ہے اُداس

بے نیازِ مستی و جام و سُبو کر دو مجھے

اپنے کیفِ مستقل سے اس طرح بھر دو مجھے

میں تمہارا بن کے سوز و جزب کا ماہر بنوں

دل سے وہ نغمے اُٹھیں، جنکے لئے شاعر بنوں

دہلی ۱۹۳٦

طلوُعِ سحر

ہوا تلوُع اُفق پر ستارۂ سحری

ملی تمام جہاں کو نویدِ جلوگری

سفر کا حکم ملا کاروانِ انجم کو

سواریِ سحر آتی ہے راہ صاف کرو

غبارِ ظلمتِ شب لے اُ ڑی نسیمِ سحر

کلی چمن میں ہوئی باعشِ شگفتِ نظر

چٹک کے غنچے نے آواز دی کہ اے گلچیں

جُھکا بھی دے درِ فطرت پر آج اپنی جبیں

گلوں نے بلبلِ شیدا سے مُسکرا کے کہا

خموش کِس لئے بیٹھی ہے چھیڑ گیت نیا

فضائیں گونج اُٹھیں دل نواز نغموں سے

ہوئی بلند صدائے رباب پتّوں سے

چمن میں جاگ اُٹھے اشجار لیکر انگڑائی

بساطِ خاک پر اک موجِ نور لہرائی

تڑپ کے لہر نے دریا سے یوں خطاب کیا

"تری خموش روی نے مجھے خراب کیا"

خموشیاں ہوئیں رخصت کہ دَورِ نو آیا

رگوں میں خون نیا دوڑتا بزور آیا

کسان بیل لئے دُور جھونپڑے سے چلا

سحر کے نشّے میں مخمور، جھونپڑے سے چلا

ہوئی بلند صدا مندروں سے گھنٹوں کی

اذاں موذنِ مسجد نے دی، فِضا جاگی

عبادتِ سحری میں جُھکا دلِ شاعر

اب ایک وجد کی منزل ہے منزلِ شاعر

خیال لے کے اُڑاتا بہ چرخِ نیلی فام

سحر کی پہلی کرن نے دیا اُسے پیغام

"کہ تجھ میں مجھ میں کوئی فرق و امتیاز نہیں"

"ہمارا نغمۂ نو ہے، سحر کا ساز نہیں"

"ترے کلام میں میرا ہی تو گداز ہے یہ"

"نمودِ صبح نہیں زندگی کا راز ہے یہ"

دہلی ۱۹۳۶

انقلابِ بہار

مژدہ اے دل، پھر گلستاں میں بہار آنے کو ہے

از سرِ نو لالہ و گل پر نکھار آنے کو ہے

بھیگی بھیگی ہیں ہوائیں روح پرور ہے فضا

پھر کوئی کالی گھٹا دیوانہ وار آنے کو ہے

انقلابی صور پھُونکا جا رہا ہے دہر میں

غم زدوں کو عشرتِ غم سازگار آنے کو ہے

چاندنی سوئی ہوئی ہے وادیِ گل پوش میں

کوہ سے گاتا ہوا اک آبشار آنے کو ہے

غرقِ مے ہونے کو ہے پھر عالمِ امکاں تمام

ساقیِ مخمور سوئے جوئبار آنے کو ہے

گوُنجتے ہیں سازِ پیمانہ پہ نغماتِ شراب

میکدے کی سمت ہر پرہیزگار آنے کو ہے

پھر نظر کے سامنے ہے جلوہ زارِ روئے دوست

روح کو آرام اور دل کو قرار آنے کو ہے

دل سے داغِ سوزِ ناکامی فنا ہو جائے گا

اب بہار آتی ہے، عالم "گل کدا" ہو جائے گا

دہلی ۱۹۳۶

دعوتِ سیر

لطافتیں بھری ہوئی ہیں دامنِ بہار میں

جوانیاں تڑپ رہی ہیں باغ کے نکہار میں

فضائے رنگ و حسن ہے ہمارے انتظار میں

لو آؤ، سیر کو چلیں

شعاعِ آفتاب وہ اُفق پہ جلوہ گر ہوئی

تمام بزمِ کائنات جنّتِ نظر ہوئی

اُٹھا یہ شور ہر طرف سحر ہوئی، سحر ہوئی

لو آؤ، سیر کو چلیں

پرندے بےخودی کے گیت گا رہے ہیں ہر طرف

فضاؤں میں پروں کو پھڑ پھڑا رہے ہیں ہر طرف

فسانہ صبحِ باغ کا سُنا رہے ہیں ہر طرف

لو آؤ، سیر کو چلیں

چمک رہے ہیں اور جگمگا رہے ہیں راستے

قدم قدم پر آئنے دکھا رہے ہیں راستے

سکوت کی زبان سے بُلا رہے ہیں راستے

لو آؤ، سیر کو چلیں

تمام رات کٹ گئی، سحر کے انتظار میں

تسلیوں میں قول کی، فریبِ اعتبار میں

نہ ٹالو کہہ کے یوں کہ " ہم ہیں نیند کے خمار میں"

لو آؤ، سیر کو چلیں

یہ وقت اور یہ سماں بھلا نصیب پھر کہاں

یہ نوَ طلوع مستیاں بھلا نصیب پھر کہاں

یہ صبحِ مستِ گلستاں بھلا نصیب پھر کہاں

لو آؤ، سیر کو چلیں

چٹک چٹک کے ہر کلی پیام دے رہی ہے یہ

ہوا کی روح پروری پیام دے رہی ہے یہ

سحر میں چُھپ کے زندگی پیام دے رہی ہے یہ

لو آؤ، سیر کو چلیں

ضرورتوں کا ذکر کیا، ضرورتوں کو چھوڑ دو

کرو نہ غور علّتوں پہ، علّتوں کو چھوڑ دو

خدا کے واسطے تمام حجّتوں کو چھوڑ دو

لو آؤ، سیر کو چلیں

تمہیں قسم ہے تابشِ جمالِ لا زوال کی

کہ جس نے میرے دل کی کائنات پائمال کی

مآل کی کِسے خبر ہے، فکر کیا مآل کی

لو آؤ، سیر کو چلیں

دیوبند ۱۹۳۳

ابرِ بہار

ابرِ بہار آیا
دیوانہ وار آیا
بے اختیار آیا

اُڑتا ہُوا ہوا پر
گاتا ہوا فضا پر
دُنیا و ما سوا پر

انگڑائی لی چمن نے
نرگِس نے، یا سمن نے
مرغانِ نغمہ زن نے

بدلا نظامِ عالم
روپوش ہو گیا غم
اُٹھا خزاں کا پرچم

ہر سمت نور پھیلا
کیف و سررور پھیلا
نزدیک و دوُر پھیلا

پروانے رقص میں ہیں
پیمانے رقص میں ہیں
دیوانے رقص میں ہیں

ہر روح مست و بے خود
بادہ پرست و بے خود
کوشر پرست و بے خود

بادہ بد وش ساقی
مستی فروش ساقی
ہے نشّہ کوش ساقی

اس دورِ عنبریں میں
اس فصلِ دلنشیں میں
اس موسمِ حسیں میں

فطرت پرست شاعر　　　　جذبات کا مُصوّر

حالات کا مبصّر

سب کچھ بھُلا چُکا ہے　　　　تخّیل آ زما ہے

تخلیق کر رہا ہے

نظریں ہیں کہکشاں پر　　　　اُڑتا ہے آسماں پر

پہنچا ہے یہ کہاں پر

یاد آ رہے ہیں اس کو　　　　تڑپا رہے ہیں اسکو

بہکا رہے ہیں اس کو

بُھولے ہوئے فسانے　　　　گزرے ہوئے زمانے

گائے ہوئے ترانے

کچھ گنگنا رہا ہے　　　　گویا کہ گا رہا ہے

اور مسکرا رہا ہے

عنوانِ نظمِ شاعر "ابرِ بہارِ ہستی"

دو لفظ ہیں یہی تو کیف و خمارِ ہستی

سکوتی ٹانڈہ ۱۹۳٤

نیا سال

لوگ کہتے ہیں سال ختم ہوا دَورِ رنج و ملال ختم ہوا
عشرتوں کا پیام آ پہنچا عہدِ نو شاد کام آ پہنچا
گونجتی ہیں فضائیں گیتوں سے رقص کرتے ہیں پُھول اور تارے
مُسکراتی ہے کائنات تمام جگمگاتی ہے کائنات تمام
مجھ کو کیونکر مگر یقیں آئے
میرے دل کو نہیں قرار اب تک میری آنکھیں ہیں اشکبار اب تک
ہیں مرے واسطے وہی راتیں قصّہ غم، فراق کی باتیں
آج کی رات تم اگر آؤ ابر بنکر فضا پہ چھا جاؤ
مجھے چمکاؤ اپنے جلووں سے دل کو بھر دو نئی اُمیدوں سے
تو میں سمجھوں کہ سالِ نو آیا

لاہور ۱۹۳۳

گھٹائیں

کافر گھٹائیں ٹھنڈی ہوائیں

جلوہ نما ہیں راحت فزا ہیں

رنگینیوں کا طوفاں ہے برپا

حسن و لطافت عیش اور نزہت

عالم پہ طاری جاری و ساری

دامن میں بھرکر لائی ہیں کوشر

میخوار آئیں ہشیار آئیں

بے تاب آئیں بے خواب آئیں

آئیں حسیں بھی اندوہ گیں بھی

دیر و حرم کے آئیں فرشتے

مفلس، تونگر سب آئیں مل کر

ساغر بھرے ہیں کوشر بھرے ہیں

میکش اُٹھا لیں پی لیں، پِلا لیں

ہے عام رحمت ہنگامِ عشرت

خالی نہ جائیں

کافر گھٹائیں

دیوبند ۱۹۳۳

آجاؤ

آجاؤ حُسن و نور کی دنیا لئے ہوئے
کیفیت و سرور کی دنیا لئے ہوئے
آجاؤ بجلیوں کو چُھپائے نگاہ میں
زیرِ نقاب طور کی دنیا لئے ہوئے
آجاؤ حشر خیز ادائے خرام سے
رفتار میں غرور کی دنیا لئے ہوئے

آجاؤ اضطراب کی دُنیا لئے ہوئے
رنگینی و شباب کی دُنیا لئے ہوئے
آجاؤ چھیڑتی ہوئی سازِ سرور و کیف
میخانہ و شراب کی دُنیا لئے ہوئے
آجاؤ پھر جھکائے ہوئے چشمِ نیم باز
نظرونمیں اک حجاب کی دُنیا لئے ہوئے

آجاؤ سوز و ساز کی دُنیا لئے ہوئے
راز و نیاز و ناز کی دُنیا لئے ہوئے
آجاؤ مُسکرراتی ہوئی سادگی کے ساتھ
ہونٹوں میں اک مجاز کی دُنیا لئے ہوئے
آجاؤ دل کو دیتی ہوئی درد کا پیام
حُسنِ جنوں نواز کی دُنیا لئے ہوئے

آجاؤ، اب کہ دل کو نہیں تابِ انتظار
حد سے گزر چُکا ہے نگاہوں کا اضطرار
آدابِ عشق سے نہیں واقف اگر چہ میں
پھر بھی مجھے ہے حُسن کے وعدوں کا اعتبار
تم بھی ضرور آؤگی، مجھ کو یقین ہے
آئی ہوئی ہے آج چمن زار میں بہار

لاہور ۱۹۳٤

بسنت کا ترانہ

بسنت کیف ریز ہے　　　　بسنت حُسن بیز ہے

بسنت عشق خیز ہے

ہوائیں دل پذیر ہیں　　　　فضائیں دل پذیر ہیں

ادائیں دل پذیر ہیں

ہیں کیاریاں گلُوں سے پُر　　　　درخت چہچوں سے پُر

چمن تجلّیوں سے پُر

دلوں میں جوشِ عاشقی　　　　سروں میں شوقِ بندگی

سرور اور بے خودی

برس پڑیں لطافتیں　　　　گزر گئیں کشافتیں

کہاں ہیں اب وہ آفتیں

نئی امنگ اور جنوں　　　　جدید حُسن کا فسوں

رگوں میں تیز تیز خوں

ہیں رنگ و بو کے کارواں　　　　زمین پر رواں دواں

اِدھر اُدھر، یہاں وہاں

اُٹھاؤ جس طرف نظر، خوشی ہے انبساط ہے

بسنت کے نکھار میں نشاط ہی نشاط ہے

لاہور ۱۹۳۳

کِس طرح قرار ہو

فضائے کوہسار میں سرودِ آبشار ہے

سمن کدے میں جلوہ گر عروسِ نو بہار ہے

تجلّیوں کی بار گاہ، صحنِ لالہ زار ہے

طلوعِ صبحِ کائنات، دشمنِ قرار ہے

تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

زبانِ کائنات پر ہے داستاں شباب کی

بڑھی ہوئی ہیں شوخیاں شعاعِ ماہتاب کی

فضاؤں میں بسی ہوئی ہیں مستیاں شراب کی

کِسی کو فکر ہی نہیں ہے زہد و اجتناب کی

تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

جہاں کے میکدے کا ساقیِ حسیں ہے آسماں

برس رہی ہیں کیا ہی ننھی ننھی رس کی بوندیاں

ہوئے ہیں کیف یاب سب زبان دار و بے زباں

رگوں میں ہے شراب، بنکے خونِ زندگی رواں

تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

وفائے عشق اور حُسن کی جفا بھی یاد ہے
کِیا تھا جس نے بے قرار وہ ادا بھی یاد ہے
نظر سے جو خطا ہوئی تھی وہ خطا بھی یاد ہے
تمہارا مُسکرا کے مجھ کو دیکھنا بھی یاد ہے
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

تمہاری آنکھ میں وہی شرابِ لالہ فام ہے
اُسی طرح لبوں پہ رنگِ مستیِ دوام ہے
وہی ہے قامتِ جواں، وہی حسیں خرام ہے
تمہارا حُسن ہے تمام، چاند نا تمام ہے
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

اسیرِ عشق سر نثار و دل فروش ہے وہی
جہانِ رنگ و بو میں بے نیازِ ہوش ہے وہی
سکوں سے نا اُمید، اضطراب کوش ہے وہی
تصّوراتِ حُسن میں جنوں بد وش ہے وہی
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

تمہاری یادِ جاں نواز آرہی ہے رات دن
جنونِ آرزو مِرا بڑھا رہی ہے رات دن
مناظرِ سکوں مجھے دِکھا رہی ہے رات دن
ستا رہی ہے رات دن، مِٹا رہی ہے رات دن
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

نہ تم یہاں، نہ مدّتوں سے نامہ و پیام ہے

نہ میرے عشق کا تمہارے دل میں احترام ہے

تمہاری بزمِ ناز میں جفا وفا کا نام ہے

وفا پرست ہوں مگر مجھے وفا سے کام ہے

تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

دیوبند ۱۹۳۳

آمدِ حُسن

ہر پھُول ہے نشاطِ گلستاں لئے ہوئے

افسانۂ بہار کا عنواں لئے ہوئے

وہ آ رہی ہے صحنِ چمن زار میں پھر آج

رنگینیِ حیات کا ساماں لئے ہوئے

آنکھوں میں ایک منظرِ سحر و فسوں اثر

ہونٹوں پر اک تبسّمِ رقصاں لئے ہوئے

شرمِندہ کر رہی ہے عروسِ بہار کو

دامن پہ داغِ خونِ شہیداں لئے ہوئے

تفسیر کر رہی ہے کتابِ حیات کی

ہر جنبشِ نظر میں چراغاں لئے ہوئے

کالی گھٹا کا ہوش کِسے ہے بہار میں

وہ آ گئی ہے زلفِ پریشاں لئے ہوئے

اے ہمنشیں ذرا مِرے دل کو سمبھالنا

اک حشر سا ہے فتنۂ دوراں لئے ہوئے

ہنگامہ در نظر ہوں میں صد فتنہ دزنگاہ

ششدر کھڑا ہوں دیدۂ حیراں لئے ہوئے

دل ہے ازل سے حُسن پرست و سکوں فروش

پہلو میں اضطرابِ فراواں لئے ہوئے

بیٹھا ہوں کشتیِ جگرِ پاش پاش پر

آنکھوں میں اپنی حاصلِ طوفاں لئے ہوئے

لاہور ۱۹۳٤

بوندوں کا ساز

نشاط افروز شامِ رنگیں لطافتوں کو بڑہا رہی ہے

لئے ہوئے ساز بدلیوں کا شباب کے گیت گا رہی ہے

دلوں میں بیتاب ولولے ہیں، دماغ اور ہوش کھو چلے ہیں

نگاہ کے سامنے تجلّی بہار کی جگمگا رہی ہے

اگر چہ خورشید چُھپ گیا ہے مگر ابھی تک شعاعِ آخر

کہیں کہیں بادلوں میں منظر حسین و دل کش بنا رہی ہے

نشاط تقسیم ہو رہی ہے، چمن چمن جنّتیں بنیں گی

ٹپک رہی ہے جو بوند رس کی فلک سے،غنچے کِھلا رہی ہے

دلوں میں وحشت، سروں میں سودا، نگاہ مضطر، حواس غائب

گرج گرج کر سیاہ بدلی ہزار فتنے جگا رہی ہے

ہوا بھی رنگیں، فزا بھی رنگیں، زمیں بھی رنگیں، فلک بھی رنگیں

غروبِ خورشید بھی ہے رنگیں، طلوعِ شب کی جھلک بھی رنگیں

وہ پیکرِ حُسن جس نے میرے دماغ کو جزب کر لیا ہے

نثار قدموں پہ جِسکے، مدّت ہوئی، دلِ زار ہو چکا ہے

مرے تصّور کے آئنے میں ہے جس کا پرتَو جمالِ ایمن

جو میرے ٹوٹے ہوئے سفینے کا بحرِ ہستی میں نا خدا ہے

جو میری آنکھوں کی روشنی ہے، جو میرے دل کا قرارِ مطلق

جسے مرا ہر نفس، سمجھ کر خدا کا اوتار، پوجتا ہے

سمٹ کے جس میں سما رہی ہیں تمام تابانیاں جہاں کی

غلط سراسر غلط جو میں یہ کہوں کہ وہ ماہتاب سا ہے

کہ اُس کا دونوں جہاں میں ثانی نہیں ہے کوئی نہیں ہے کوئی

وہ آپ ہی ہے نظیر اپنی، وہ آپ ہی اپنا دوسرا ہے

وہ سُن رہی ہے میں داستاں اُسکو اپنے دل کی سُنا رہا ہوں

جو ساز بوندوں کا بج رہا ہے اُسی پہ میں گیت گا رہا ہوں

نہ ختم ہو گیت یہ ابد تک، یہ کیف یونہی رہے الٰہی

رہے ہمیشہ محیطِ عالم یہ شام کی پُرفسوں سیاہی

ٹھہر ابھی آفتابِ روشن نہ ڈوب مغرب کی پستیوں میں

کہ عہدِ اُلفت کی میرے دینی پڑےگی اک دن تجھے گواہی

گھٹاؤ تم آج خوب برسو، اُچھال دو کُل سمندروں کو

محل و موقع سے بے تعلق ہے اب تمہاری یہ کم نگاہی

وہ سُن رہی ہے فسانۂ شوق میرا اور مُسکرا رہی ہے

خموشیِ حُسن پھر ہے آمادۂ ستم، مائلِ تباہی

یہ بندگانِ گناہ و عصیاں ہوس سمجھتے ہیں عشق کو بھی

کھٹک رہی ہے تمام دُنیا کی آنکھ میں میری بے گناہی

ہوا زمانے کی ہے مخالف، خدا مجھے کامیاب کر دے

یہیں ٹھہر جائے توسنِ وقت، یہ دعا مستجاب کر دے

دیوبند ۱۹۳۳

مطربہ سے

وہ گیت چھیڑ جس سے جھُوم جائے روحِ زندگی

بجے ربابِ کائنات، گائے روحِ زندگی

وہ سوز ہو، وہ ہو اثر

تڑپ اُٹھیں دل و جگر

تمام دل قرار اور سکوں سے بے نیاز ہوں

خودی کے عالمِ خودانما میں سر فراز ہوں

مری بہار ہے یہی کہ گائے جا بجائے جا

دل و دماغ میں مرے اک آگ سی لگائے جا

ترب کی ندّیاں بہا

چراغ کیف کے جلا

تمام کائنات نغمہ ریز و نغمہ بار ہو

بہارِ صد نشاط ہو، نشاطِ صد بہار ہو

مرے مزار پر نہ رو، نہ جھونک مجھکو آگ میں

کہ میری جنّتیں چُھپی ہوئی ہیں تیرے راگ میں

نہ روک ہاتھ مطربہ

لطیف گیت گائے جا

مری اِس آخری اُمید کو نہ پائمال کر

شہیدِ آرزو کی التجاؤں کا خیال کر

میرٹھ ۱۹۳۵

تصویر

تری تصویر سے پیدا کمالِ حُسن و شوخی ہے

نشاطِ روح تنویرِ جمالِ حُسن و شوخی ہے

نگاہِ شوق ساماں پائمالِ حُسن و شوخی ہے

برستی ہے تری چشمِ فسوں گر سے نئی مستی

وہ مستی منحصر جس پر ہے کیفِ عالمِ ہستی

وہ مستی جس سے ہے مدہوش ہر ویرانہ، ہر بستی

ترے رخسارِ رنگیں پر گماں ہے صبحِ گلشن کا

ترے انوار پر ہوتا ہے دھوکا برقِ خرمن کا

چراغِ طور ہے گویا ستارہ تیرے دامن کا

ترے جلووں کا ہے ممنوں اُجالا محفلِ دل کا

نہیں خورشید کو تابِ رخِ پُرنور کا یارا

ضیائے حُسنِ عالم گیر سے روشن ہے کلُ دُنیا

تیری تصویر سے وابستہ ہے رنگینیِ عالم

تری تصویر ہے پیغامِ تسکینِ دلِ پُرغم

مگر دل میں مرے کیوں بڑھ رہی ہے کلی ہر دم

ستارے رات کو جب آسماں پر جگمگاتے ہیں

شعاعوں کا خزانہ ظلمتستاں میں لُٹاتے ہیں

تری تصویر کے آگے مجھے سجدے میں پاتے ہیں

منادی صبح کی کرتا ہے جب خورشید مشرق سے

ہویدا سب پہ کر دیتا ہے دھوکے خوابِ غفلت کے

مجھے سجدے میں پاتا ہے تری تصویر کے آگے

بہار آتی ہے جب لیکر چمن میں لالہ و گُل کو
سِکھا دیتی ہے فردوسی ترانے لحنِ بلبل کو
مرا مسجود پاتی ہے تری تصویرِ کاکُل کو
تری تصویر سے میں داستانِ شوق کہتا ہوں
اُمیدِ ساحلِ مقصود کی موجوں میں بہتا ہوں
فریبِ آرزو کی اپنے دل پر چوٹ سہتا ہوں
سہارا ہے یہی طوفانِ امواجِ تمنّا میں
اِسی سے روشنی ہوتی ہے پیدا چشمِ بینا میں
جھلکتا ہے اِسی کا رنگِ مستی جامِ صہبا میں
بھروسے پر تری تصویر کے زندا ہوں میں اب تک
ستم سہتا ہوں دُنیا کے، وفا کرتا ہوں میں اب تک
تجھی سے ہم کلام و ہم سخن گویا ہوں میں اب تک

امرتسر ۱۹۳۰

آئنے کے سامنے

تمہارے رخسار رنگ و نورِ شباب سے جگمگارہے ہیں

تمہارے رنگین ہونٹھ سازِ بہار میں مُسکرا رہے ہیں

تمہارے شبگوں سیاہ گیسو، حواسِ عالم اُڑا رہے ہیں

تمہاری آنکھوں میں مستیاں ہیں

کہ مستیوں کی یہ بستیاں ہیں

جہاں فقط مے پرستیاں ہیں

تمہاری روشن جبیں میں تارے نشاط کے جِھلمِلا رہے ہیں

تم آئنے میں سنور رہی

کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے بساطِ گردوں پہ جلوہ گر ہیں

یہ عالمِ جزب و بیخودی ہے کہ فرض سے اپنے بے خبر ہیں

یہ جاتے خورشید کی شعاعیں نڈھال ہو کر بھی شوخ تر ہیں

تمہیں دریچے سے جھانکتی ہیں

تجلّیاں نذر کر رہی ہیں

تمہیں پہ گویا مِٹی ہوئی ہیں

سرورِ نظّارۂ جمال و نشاطِ رنگیں سے کیف پر ہیں

تم آئنے میں سنور رہی ہو

مرے دلِ پُر اُمید میں آرزوئیں کروٹ بدل رہی ہیں

وہ آرزوئیں جو میرے سینے سے آہ بنکر نکل رہی ہیں

وہ آرزوئیں جو میرے ہونٹوں پہ کھیلنے کو مچل رہی ہیں

بنا ہوا ہوں نظر سراپا

ہے خُشک اب آنسؤں کا دریا

تمہارا چہرہ ہے کتنا پیارا

بر آئیں گی اب وہ سب اُمیدیں جو دل میں برسوں سے پل رہی ہیں

تم آئنے میں سنور چُکی ہو

دیوبند ۱۹۳۳

حُسنِ گمراہ

مجھکو معلوم ہے تو حُسن میں لا ثانی ہے

ساری دُنیا تری سودائی ہے دیوانی ہے

تیری آنکھوں میں ہے کیفیتِ جامِ مئے ناب

سو بہاروں کا ہے آئینہ ترا حُسنِ شباب

رخِ رنگیں سے ترے پھُول بھی شرماتے ہیں

سامنے آتے ہوئے ڈرتے ہے کتراتے ہیں

کالی زلفیں تری لہراتی ہیں جب شانوں پر

بجلیاں کوندھتی ہیں عشق کے ایوانوں پر

مُسکراتی ہے تو گوہر سے لُٹا دیتی ہے

میٹھی آواز سے فطرت کو جگا دیتی ہے

نور پاتی ہیں زمانے کی نگاہیں تجھ سے

روشن اُمید و تمنّا کی ہیں راہیں تجھ سے

نو جوانی سے بھی تیری مجھے انکار نہیں

میں مگر تیری محبّت میں گرفتار نہی

کچھ بھی ہو مجھکو نہیں حُسن کے یہ طور پسند

میری تخّیل کو ہے رنگ کوئی اور پسند

دیکھنا مجھکو کنکھیوں سے ترا ٹھیک نہیں

اور پھر کیا ہے جو یہ حُسن کی تضحیک نہیں

ہر سہیلی سے مرا ذکر کیا کرتی ہے

مجھے پیغام محبّت کا دیا کرتی ہے

اُنگلیوں سے مری جانب یہ اشارے تیرے

خوب معلوم ہیں دھوکے مجھے سارے تیرے

تجھ کو دراصل محبّت سے نہیں کوئی لگاؤ

تیری دانست میں سب کچھ ہے سنگھار اور بناؤ

تُو مجھے کس لئے بد نام کیا کرتی ہے

اور رُسوا سحر و شام کیا کرتی ہے

میری غیرت جو کبھی جوش پر آ جائگی

حُسنِ گمراہ کو رستے پہ لگا لائیگی

لاہور ۱۹۳۲

سال کی آخری رات

ختم ہوتا ہے سال آجاؤ　　دُور کردو ملال آجاؤ

بھُول جاؤ مرے گناہوں کو　　شب کے نالوں کو، دِن کی آہوں کو

جو ہوا اُس کا غم فضول ہے اب　　داستانِ الم فضول ہے اب

نا مرادی کا ذکر، جانے دو　　کامرانی کا دَور آنے دو

آؤ پھر بیٹھ جاؤ پاس مرے　　ولولے کیوں رہیں اُداس مرے

آؤ ہم پھر پئیں، پلائیں کہیں　　موسمِ نو کا لطف اٹھائیں کہیں

آؤ پھر چھیڑ دیں شباب کا ساز

ہونے والا ہے سالِ نو آغاز

سرد و تاریک اور طویل ہے رات　　عشرتِ صبح کی دلیل ہے رات

آج کی رات غم کسیکو نہیں　　رقص کرتے ہیں آسمان و زمیں

یہ ستارے جو جِھلمِلاتے ہیں!

پریم کی راگنی سُناتے ہیں

میرٹھ ۱۹۳۵

دعوتِ نظر

سحر کے آفتاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
لطافتِ گلاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
حیاتِ کامیاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
مری طرف بھی دیکھ لو

طلوعِ ما ہتاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
صراحیِ شراب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
بہار کے شباب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
مری طرف بھی دیکھ لو

تبسّمِ بہارِ گلستاں بھی دیکھتی ہو تم
شباب و رنگ و بو کے کارواں بھی دیکھتی ہو تم
زمیں بھی دیکھتی ہو آسماں بھی دیکھتی ہو تم
مری طرف بھی دیکھ لو

نکھار دیکھتی ہو تم عروسِ کائنات کا
عروسِ کائنات کا، سمن کدے کی رات کا
اگر تمہیں ہے پاس کچھ بھی عشق کی حیات کا
مری طرف بھی دیکھ لو

مری طرف بھی دیکھ لو نگاہِ نیم باز سے

نگاہِ نیم باز سے، ادائے دل نواز سے

ادائے دل نواز سے، غرور اور ناز سے

مری طرف بھی دیکھ لو

تمہاری اک نظر کا انتظار مدّتوں سے ہے

دلِ الم نصیب بے قرار مدّتوں سے ہے

مری نگاہِ شوق اشکبار مدّتوں سے ہے

مری طرف بھی دیکھ لو

مری طرف بھی دیکھ لو کہ میں بھی کم نصیب ہوں

سکوں سے بے نیاز و بے قرار و غم نصیب ہوں

تمہارے حُسن کا اسیر ہوں، ستم نصیب ہوں

مری طرف بھی دیکھ لو

خموش ہو گئی ہو کس لئے مرے سوال پر

گراؤ بجلیاں مرے دلِ شکستہ حال پر

دلِ شکستہ حال پر، حیاتِ پائمال پر

مری طرف بھی دیکھ لو

میرٹھ ۱۹۳۵

نہ جاؤ ابھی

ہیں موآج ندیاں تو پُر شور نالے

کناروں نے بھی اپنے ہتھیار ڈالے

نہ کشتی، نہ کشتی کو ہیں کھینے والے

نہ جاؤ نہ جاؤ ابھی تم نہ جاؤ

فلک پر ہیں روپوش چاند اور تارے

ہیں ظلمت بداماں زمیں کے نظارے

ہیں سہمے ہوئےخوف و ہیبت سے سارے

نہ جاؤ نہ جاؤ ابھی تم نہ جاؤ

اندھیرا سا ہر سمت چھایا ہوا ہے

فضاؤں میں طوفان آیا ہوا ہے

زمانے کا دل ڈگمگایا ہوا ہے

نہ جاؤ نہ جاؤ ابھی تم نہ جاؤ

مری زندگی کا سہارا تمہیں ہو

مری چشمِ حسرت کا تارا تمہیں ہو

مرے دردِ الفت کا چارا تمہیں ہو

نہ جاؤ نہ جاؤ ابھی تم نہ جاؤ

ذرا مسکراؤ، ذرا مسکراؤ

اُمنگوں میں میری قیامت اُٹھاؤ

سما جاؤ میرے دل و جاں میں آؤ

نہ جاؤ نہ جاؤ ابھی تم نہ جاؤ

میرٹھ ۱۹۳٦

محویتِ محبّت

ہَوا پھُولوں سے دل بہلا رہی ہے

عجب نزہت سی ہر سُو چھا رہی ہے

فضائے باغ نغمے گا رہی ہے

ستاروں میں چمک سی آ رہی ہے

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

نظر میں مستیاں لے کر چلی ہو

ادائیں، شوخیاں لے کر چلی ہو

جنوں سامانیاں لے کر چلی ہو

عجب رعنائیاں لے کر چلی ہو

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

بہاریں ہیں چمن زاروں میں آؤ

گلوں کے ساتھ تم بھی مُسکراؤ

شباب و کیف کے نغمے سُناؤ

گھٹا بن کر جہانِ دل پہ چھاؤ

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

خمار آلود آنکھوں میں تمہاری

سمٹ آئی ہے کوشر کی جوانی

جو یہ ہے برہمی زلفِ رسا کی

ہواؤں کو کبھی تسکیں نہ ہوگی

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

گل و لالہ کی رنگیں شوخیوں کا

زباں پر سارے گلشن کی ہے چرچا

مسلسل بج رہا ہے سازِ دریا

جوانی ہر طرف ہے رقص فرما

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

قیامت ہے تمہارا مُسکرانا

نظر مِلتے ہی وہ آنکھیں جھُکانا

لبِ خاموش سے نغمے سُنانا

گلوں کو زینتِ گیسو بنانا

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

زمیں مرکز سے ہٹکر جھُومتی ہے

نظر میں موجِ کوشر جھُومتی ہے

اُدھر زلفِ معنبر جھُومتی ہے

اِدھر ناگن سی دل پر جھُومتی ہے

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

چمن میں ایک تم ہو اور میں ہوں

نہ دیکھوں میں تمہیں تو کِسکو دیکھوں

اجازت ہو تو میں اک بات پوچھوں

تمہارے نقشِ پا پر سجدہ کر لوں؟

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

غرورِ حُسن کا انجام ہو تم

نظر کے میکدے کا جام ہو تم

دماغ و قلب کا آرام ہو تم

مجسم شعر ہو، الہام ہو تم

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

خرد سے کر چکا ہوں میں کنارا

درائے راہ ہے دل کا اشارا

میں لوں کیا دین و ایماں کا سہارا

تصّور مجھ کو سب کچھ ہے تمہارا

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

نہ ہوش اپنا نہ دُنیا کی خبر ہے

یہ دردِ دل ہے یا سوزِ جگر ہے

یہ نغمہ ہے کہ آہِ بے اثر ہے

مجھے معلوم لیکن اس قدر ہے

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

تمہیں ہو یا نہ ہو مجھ سے محبّت

نہیں یہ سوچنے کی مجھ کو فرصت

یقیں اِسکا بھی ہے مجھ کو غنیمت

مرے دل کو یہی کافی ہے راحت

مجھے تم سے محبّت ہو رہی ہے

دہلی ١٩٣٦

کِرن

جب اُبھرتا ہے اُفق کی سُرخیوں سے آفتاب

کھیلتا ہے سرمدی نغموں سے فطرت کا رباب

دوڑتی ہے پیکرِ عالم میں جب روحِ شباب

کیف میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے چشمِ نیم خواب

آسماں کی رعفتوں کو چھوڑ کر آتی ہے تُو

تیرگی کے آئینوں کو توڑ کر آتی ہے تُو

تُو بظاہر اک کرن ہے بے شبات و بے وقار

تیری آمد ہے فقط خورشید کا اک اشتہار

ہر روش سے تیری ظاہر ہے مزاقِ اضطراب

تُو بھی فانی ہے، ترا جلوہ بھی ہے نا پائیدار

منتظر تیرا مگر ہر دم کلی کا سینہ ہے

تیرے ہی جلووں سے پُر انوار یہ آئینہ ہے

اجنبی ہوں مطلقاً میں شب ستانِ دہر میں

سب سے پیچھے ہوں ابھی تک رہروانِ دہر میں

کامیاب اب تک نہیں ہوں امتحانِ دہر میں

میرا دل بھی اک کلی ہے گلستانِ دہر میں

اِس کلی کو بھی تبسّم کی کبھی تعلیم دے

میرے اوراقِ پریشاں کو نئی تنظیم دے

اے کرن، مجھ کو عطا کر ایک شعلہ نور کا

دے مرے ذوقِ نظر کو ظرف کوہِ طور کا

میرا دل مرکز بنے کیفیتِ مسرور کا

راز سارا کھول دوں میں ناظر و منظور کا

مادیت مطمئن ہو روح تو کیا چیز ہے

میں بتا دونگا کہ سب نا چیز ہے نا چیز ہے

میرٹھ ۱۹۳۵

ڈیوک آف وِنڈسر

محبّت کا جہاں میں بول بالا کر دیا تونے

فضاؤں میں محبّت کی اُجالا کر دیا تونے

زمانہ قیس کی تاریخ کو افسانہ سمجھا تھا

محبّت کرنے والوں کو فقط دیوانہ سمجھا تھا

یقیں آتا نہ تھا فرہاد کے ایشار پر اِس کو

ہنسی آتی تھی شاعر کے نشاطِ کار پر اِس کو

سمجھتا تھا محبّت اک فریبِ خوبصورت ہے

نہ کچھ اس کی حقیقت تھی، نہ کچھ اس کی حقیقت ہے

مگر تُونے یہ شابت کر دیا افرادِ عالم پر

کہ ہیں موجود اب بھی مِٹنے والے "شوق مبہم" پر

کلاہ و تاج کی پرواہ نہیں دیوانۂ غم کو

ہوس ہے طوفِ شمعِ حُسن کی پروانۂ غم کو

یہ اہلِ عشق ہیں آزاد دُنیا کے بکھیڑوں سے

انہیں تو کام ہے امواجِ طوفاں کے تھپیڑوں سے

محبّت رہ نہیں سکتی کبھی خاموش سینے میں

جھلکتی ہیں ہزاروں بجلیاں سی آبگینے میں

بغیرِعشق کیفِ زندگی حاصل نہیں ہوتا

بغیر اس کے کوئی انساں کبھی کامل نہیں ہوتا

محبّت میں ہیں وہ آزادیاں جو مل نہیں سکتیں

ہلانے سے بھی بنیادیں جنوں کی ہل نہیں سکتیں

صدا تحسیں کی اُٹھےگی وفا کے آبشاروں سے

لِکھا جائےگا تیرا نام گردوں پر ستاروں سے

دہلی ۱۹۳۵

خوبصورت ارادے

جب گھٹائیں آسماں پر چار جانب چھائیں گی
بادۂ تسنیم و کوشر خاک پر برسائیں گی
مجھ کو تڑپائیں گی لیکن تجھ کو بھی تڑپائیں گی
تو مجھے یاد آئے گی اور میں تجھے یاد آؤں گا

جب چمن میں منعقد ہوگی گلوں کی انجمن
رقص پر آمادہ ہوگی عندلیبِ نغمہ زن
ہر کلی کے لب پہ ہوگا نعرۂ توبہ شکن
دل مجھے تڑپائےگا اور دل کو میں تڑپاؤں گا

جب مرا ساقی مجھے بھر بھر کے دے گا جامِ مے
بھُول جاؤں گا کہ دُنیا میں کوئی شے غم بھی ہے
سازِ ہستی سے کروں گا اک نئی ایجاد نَے
اور اسی سے میں نئی مستی کے نغمے گاؤں گا

طور کا رومان پھر دُنیا میں ہوگا جلوہ گر

نور سے بھر کر چھلک جائے گا ہر جامِ نظر

منتظر گلُ ہوں گے آغوشِ مسرّت کھول کر

میں بھی اپنے بازوؤں کو دُور تک پھیلاؤں گا

جب مہ و خورشید ہو جائیں گے بے نور و ضیا

ہر طرف چھا جائے گا جب ظلمتوں کا سلسلہ

رہنما کو بھی نہ ہوگا راہِ منزل کا پتا

خود بھی بہکوں گا، زمانے کو بھی میں بہکاؤں گا

جب خودی کو بھُول کر ہو جائے گی دُنیا تباہ

ہر دلِ نا کام سے نکلے گی اک پُر سوز آہ

دین و دُنیا میں کسی صورت نہ ہوگا جب نباہ

میں ہی پھر بھٹکے ہوؤں کو راستے پر لا ؤں گا

جب طلسمِ رنگ و بو کو توڑ کر نکلوں گا میں

گلشنِ ہستی کا بھانڈا پھوڑ کر نکلوں گا میں

شورش آبادِ جہاں کو چھوڑ کر نکلوں گا میں

اپنے ماضی پر نظر ڈالوں گا اور پچھتاؤں گا

جب سکوں کی گود میں مدہوش ہوگی کائنات

نغمہ زاروں میں سراپا گوش ہوگی کائنات

صورتِ ہنگامۂ خاموش ہوگی کائنات

میں اُٹھوں گا اور سکوں پر بجلیاں چمکاؤں گا

جب نہیں ہوگا بلند و پست میں کچھ امتیاز

نیکیاں ہوں گی نگوں سر، عیب ہونگے سر فراز

بھُول جائے گا زمانہ جب حق و باطل کا راز

پھر وہی دَورِ شعور و عقل واپس لاؤں گا

ا

جب خزاں بے کیفیوں کو ساتھ لیکر آئے گی

جب گُل و لالہ کے چہرے پر اداسی چھائے گی

جب بساطِ بادہ گلشن سے اٹھالی جائے گی

کھو کے اس دُنیا کو پھر میں آپ بھی کھو جاؤں گا

میرٹھ ۱۹۳۵

روح کا پیمانہ

بھر دے میرا جام اے ساقی بھر دے میرا جام

آیا ہوں میں دُور سے ساقی، بھر دے میرا جام

کیفیت اور نور سے ساقی، بھر ساقی، بھر دے میرا جام

نور وہ جس سے روشن دل کا کاشانہ ہو جائے

کیف وہ جس میں ڈوب کے ہستی میخانہ ہو جائے

زیست جسے کہتی ہے دُنیا، مستی کا ہے نام

بھر دے میرا جام

مشرق سے وہ سورج اُبھرا، پہنے زرّیں تاج

چاند ستارے چھوڑ کے بھاگے اپنا اپنا راج

بیداری کے نغموں سے بے تاب ہوا ہر ساز

تُو بھی اے میرے ساقی، دے مجھ کو آواز

میری اُمیدیں بھی کیوں رہ جائیں تشنہ کام

بھر دے میرا جام

بے خود ہے نشّے میں رنگ و بو کے کُل گلزار

فرق نہیں ہے مطلق کوئی گُل ہو یا ہو خار

دوُر کہیں اک گلشن ہے اِس گلشن سے بھی خوب

دل تو دل، ہو جاتی ہیں جس سے روحیں مغلوب

اُس گلشن کے بھید بتا کر، مجھکو کر لے رام

بھر دے میرا جام

بادل کرتے ہیں گردوں پر بے تابی کا رقص

خاک کا ہر ذرّہ کرتا ہے شادابی کا رقص

بُھول چُکے ہیں اکثر تجھ کو، ہو کر نا اُمید

نا اُمیدی ہی تو ہے بربادی کی تمہید

مجھ کو بھی اِس طرح نہ رکھ تو نومید و نا کام

بھر دے میرا جام

پی کر میں بے خود ہو جاؤں، گاؤں تیرے گیت

میری جیت حقیقت میں ہے ساقی، تیری جیت

دیکھ کے میری مستی دُنیا پھر مستی میں آئے

اِس عالم میں مجھ کو کھودے اور تجھے پا جائے

مجھ سے غفلت کیوں، میں تو ہوں رندِ مے آشام

بھر دے میرا جام

مدّت سے تیرا میخانہ ہے بے رنگ و نور

کیا اِس کا انجام تجھے ایسا ہی تھا منظور

ہار کے جا بیٹھے ہیں گوشے میں سارے مے خوار

جو بھی ہے اس محفل میں، ہے مستی سے بیزار

لیکن مجھ کو دیکھ، کہ میرا شوق نہیں ہے خام

بھر دے میرا جام

تیرے ہی یہ بندے ہیں سب با ہوش و بے ہوش

زیب نہیں دیتا ہے تجھ کو ہو جانا خاموش

اے کیف و مستی کے خالِق مستی کر تقسیم

پھر اِن تشنہ روحوں کو دے تسکیں کی تعلیم

لا اپنی وہ خاص صُراحی، رنگین و گلفام

بھر دے میرا جام اے ساقی، بھر دے میرا جام

میرٹھ ۱۹۳۵

شاعر

وہ عندلیبِ خزاں درنگاہ ہے شاعر

فضا بہار کی نغموں سے جس کے ہے مسحور

دہن میں جس کے زبانِ کلیم ہے گویا

ہے جس کے سینے میں روشن چراغِ محفلِ طور

ہیں نقش ذہن پہ جس کے حقائقِ عالم

جسے نصیب ہوئی ہے عجیب تبحِ غیور

رسائی جس کے تخّیل کی آسماں سے بلند

ہے جس کی جنبشِ لب غیریتِ تبسّمِ حور

ہر ایک چیز میں جو دیکھتا ہے حُسنِ ازل

ہوا ہے جس پہ عیاں راز ناظر و منظور

چمن میں وجہِ شگفتِ گل و نشاطِ بہار

قفس میں باعشِ تسکینِ بلبلِ مہجور

نگاہ جس کی ہے آئینہ دارِ فطرتِ حُسن

ہے جس کا ساغرِ دل کیفِ عشق سے معمور

جو اتّحاد کا پیغام بر ہے دُنیا میں

جو خانہ جنگی سے رہتا ہے دوُر اور نفور

مشالِ بانگِ درا راز دارِ منزل ہے

ہے ایک ذرۂ پا مال منزل اسکے حضور

اسی کے گیت کا طاری ہے مجھ پہ کیف و سرور

اسی کے گیت میں پنہاں ہے ہستیِ جمہور

میرٹھ ۱۹۳۵

خوابِ رند

اک رندِ خرابات سے گویا ہوا اک شیخ

مستی مئے عرفاں سے مئے تاک میں کم ہے

پینے ہی سے فرست نہیں ملتی تجھے دن رات

اس ہستیِ دو روزہ میں مرنے کا بھی غم ہے

کیا تجھ میں نہیں قوّتِ تمیزِ بد و نیک

پیتا ہے جسے شہد سمجھ کر وہی سم ہے

فانی ہے یہ ہستی بھی یہ بادہ بھی سبو بھی

باقی ہے نہ اب جام، نہ اب محفلِ جم ہے

اللہ کرے تجھ پہ کرم، رندِ بلا نوش

پینا بھی ستم ہے ترا جینا بھی ستم ہے

ہر جزو تری زیست کا رم اور برانڈی

اب نامِ خدا لے کہ تو آمادۂ رم ہے

دل میں حرکت بھی نہیں، بیکار ہیں اعضأ

یہ عمر کا حصّہ تو نہایت ہی اہم ہے

منہ پھیر کے ساقی سے مخاطب ہوا یوں رند

"گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"

"رہنے دو ابھی ساغرومینا میرے آگے"

دہلی ۱۹۳٦

شاہکارِ فطرت

ایک دن آدم نے فطرت سے کہا

مجھ سے مشکل ہے تری مدح و شنأ

خاک سے مجھ کو بنایا آدمی

آدمی کو دولتِ احساس دی

روشنی سے میں تری تا بندہ ہوں

تیرے ظِلِ عاطفت میں زندہ ہوں

حکم سے تیرے فرشتوں نے مجھے

سر جُھکا کر شوق سے سجدے کئے

میری خاطر تُونے اے درد آشنا

بزم سے ابلیس کو باہر کیا

وقف جنّت کو کیا میرے لئے

جامِ کوشر بھر دیا میرے لئے

جانتا ہوں میں کہ ہے اے با خبر

میری راحت ہی ترے مدّ نظر

کچھ پہنچ سکتا نہیں مجھ کو گزند

ہوں دل و جاں سے ترا احسانمند

میری گستاخی اگر کر دے معاف

بات دل کی تجھ سے کہدوں صاف صاف

سب مہیا ہیں یہاں سامانِ عیش

اس قدر ہونگے کہاں سامانِ عیش

لیکن اِن حُسن آفریں نظاّروں میں

کیف باراں نقرئی فوّاروں میں

نکہتِ گلہائے دل افروز میں

جرعۂ سہبائے وجد آموز میں

یہ حقیقت ہے کہ دلچسپی نہیں

راحت و تسکیں مرے دل میں نہیں

دل میں اُٹھتا ہے مرے اک درد سا

جس سے ہوجا تا ہے چہرہ زرد سا

چاہتا ہوں کیا، بتا سکتا نہیں

چیر کر سینہ دکھا سکتا نہیں

سُنکے یہ، فطرت کو بھی صدمہ ہوا

سطِح عالم پر اندھیرا چھا گیا

آدم اُسکو جان و دل سے تھا عزیز

اُسکے آگے ہیچ تھی ہر ایک چیز

دیکھ سکتی تھی کب اپنی آنکھ سے

اس کا بندہ اور رنج و غم سہے؟

محوِ حیرت تھی کہ ہے وہ درد کیا

جس میں دم آدم کا ہے اٹکا ہوا

مشورہ اُس نے فرشتوں سے کِیا

عقدۂ مشکل نہ لیکن حل ہوا

ہو کے فطرت اس طرح نا کامیاب

ہو گئی خلوت میں محوِ اضطراب

آگیا اُس کو یکایک اک خیال

مٹ گئے چہرے سے آشارِ ملال

کامیابی کا وسیلہ مل گیا،

راحتِ آدم کا حیلہ مل گیا

آبِ کوشر سے روانی مانگ لی

باغِ جنّت سے جوانی مانگ لی

لی گلوُں سے نکہتِ جان آفریں

بلبلوں سے نغمہ ہائے دل نشیں

مانگ لی نرگس سے چشمِ نیم باز

شاخِ طوبیٰ سے ادائے دل نواز

موجِ بادِ صبح سے رفتار لی

سوسنِ خاموش سے گفتار لی

زلفِ سنبل سے درازی مانگ لی

سرو سے پھر سر فرازی مانگ لی

گنچہ ہائے نو سے لی معصومیت

لی فضائے جانفزا سے عطریت

لالۂ صحرا سے سُرخی مانگ لی

بادۂ کوشر سے مستی مانگ لی

انجمِ تاباں سے لیں تابانیاں

ماہ کے آئنے سے حیرانیاں

مہرِ روشن سے شعاعوں کو لیا

اقتباسِ جلوۂ سوزاں کیا

لیں فرشتوں سے سکوں آمیزیاں

موجِ غم سے اضطراب انگیزیاں

لی کشش کی تاب مقناطیس سے

اور مانگی سرکشی ابلیس سے

سب کو فطرت نے بہم یکجا کیا

اور اس کو نام "عورت" کا دیا

شاہکارِ فطرتِ حُسن آفریں

کس قدر ہے خوبصورت اور حسیں

اسکے جلوے سے ہے روشن کائنات

ہر نفس اس کا ہے دُنیا کی نجات

آدمِ بے تاب کو چین آ گیا

ایک رنگیں کیف اس پر چھا گیا

امرتسر ۱۹۳۲

حیات و موت

توفان ہو یا ہو سخت آندھی سر گرمِ سفر ہے ماہ و خورشید

موجوں کو نہیں ہے فکرِراحت ہردم ہے روانیوں میں تجدید

فطرت کو قیام سے نہیں کام کرتا ہے زمانہ اس کی تائید

ہستی ہے سفر کا دوسرا نام

منزل کا نظارہ، موت کی دید

دہلی ١٩٣٦

انسان اور فرشتہ

انسان

قرار زیرِ فلک مجھکو صبح و شام نہیں

فرشتہ

خدا کا دل میں ترے شاید احترام نہیں

انسان

عبادتوں سے ہے حاصل، نہ ہے دعا میں اثر

خدا گواہ، نہیں ہے ترے خدا میں اثر

فرشتہ

شکیب و صبر کی دولت؟

انسان

نہیں ہے میرے لئے

فرشتہ

اُمیدِ راحتِ جنّت؟

انسان

نہیں ہے میرے لئے

فرشتہ

دل و دماغ پہ قبضہ ہے تیرے شیطاں کا

گُماں ہے قطرۂ باغی پہ تجھکو طوفاں کا

انسان

ترے خدا ہی نے پیدا کیا ہے شیطاں کو

فرشتہ

مگر سمجھ بھی تو دی ہے اُسی نے انساں کو

کہ خوب غور سے ہر ایک بات کو تولے

پھر اپنی منزلِ اصلی کی راہ پر ہولے

انسان

یہ امتحان کا انداز دل پسند نہیں

خدا کی شان کے شایاں نہیں، بلند نہیں

اِس امتحان میں مجبور عقلِ انساں ہے

ہے صرف نام کا انسان ورنہ حیواں ہے

خدا کے ایک اشارے پہ منحصر ہے جہاں

وہ چاہتا ہے جو ہوتا ہے صبح شام یہاں

قصوروار مگر آدمی ہی بنتا ہے

ذرا بتاؤ تو انصاف یہ کہاں کا ہے

فرشتہ

فریبِ دہر میں آہی گیا دماغ ترا

بُجھا دیا تری تاویل نے چراغ ترا

غلام خود کو بتاتا ہے تو خدا کا، مگر

یہ واقعہ ہے کہ شیطان ہے قوی تجھ پر

ابھی تو راز مشّیت کے کچھ نہیں سمجھا

ابھی تو فیصلے قدرت کے کچھ نہیں سمجھا

خدا نے تجھ کو نکالا ہے اپنی جنّت سے

کہ اپنی روح کو تو آشنائے غم کر لے

جسے سمجھ کے "الم" مضطرب ہے تو دن رات

ترے لئے ارے وحشی، وہی ہے وجہِ نجات

ترے خیال میں جو "غم" ہے وہ "محبّت" ہے

جو خار زار ہے وہ گلستانِ جنّت ہے

مصیبتوں میں نہ اپنے خدا سے ہو باغی

دغا ، فریب، سے مکر و ریا ، سے ہو باغی

دہلی ۱۹۳۶

اے مرے ہندوستان

آسماں پر جلوہ گر ہے آفتابِ زرفشاں

ہو چکیں رخصت جہاں سے رات کی تاریکیاں

طائرانِ خوش نوا گاتے ہیں اپنی داستاں

ہیں اگر چہ نا تواں

نا تواں و بے زباں

بے زباں و بے اماں

غفلتوں پر غالب آخر آگئیں بیداریاں

آہ طاری ہے مگر تجھ پر ابھی خوابِ گراں

اے مرے ہندوستاں!

ہو گئی ہے غفلتِ اسلاف اب خواب و خیال

وہ گزشتہ رفعتیں سب ہو چکی ہیں پائمال

کارواں کے ساتھ اب چلنا بھی ہے تیرا محال

لڑکھڑاتے ہیں قدم

بارِ سر ہیں رنج و غم

زندگی بے کیف و کم

یہ زمانہ یہ زمانے کی زمانہ سازیاں

یہ تری تقدیر کی لا چاریاں، نا سازیاں

اے مرے ہندوستاں!

آہ راما ین کا عہدِ دل فریب و دل نشیں

آستانِ عشق پر جب خم تھی انساں کی جبیں

بادۂ نورِ فلک تھا اور جامِ مرمر یں

صبح، پیغامِ نشاط

شام، الہامِ نشاط

جزبۂ عامِ نشاط

آسمانی طاقتیں کرتی تھیں تنظیمِ جہاں

کاش تو دُہرا سکے پھر اپنی رنگیں داستاں

اے مرے ہندوستاں!

وہ مہابھارت کی جنگی داستانیں کیا ہوئیں

کیا ہوئے وہ تیر وہ بانکی کمانیں کیا ہوئیں

سرفروشی اور وفاداری کی آنیں کیا ہوئیں

وہ فسانے یاد ہیں؟

وہ ترانے یاد ہیں ؟

وہ زمانے یاد ہیں ؟

وہ زمانے جبکہ تھا تُو بھی جواں، دل بھی جواں

عشرتِ تازہ سے رہتا تھا ہمیشہ شادماں

اے مرے ہندوستاں!

وقت ہے اب بھی سنبھل اے کاروانِ منتشر

حال، ماضی سے بھی نازک ہے، ذرا تو غور کر

ساغرِ نو میں شرابِ کہنۂ اسلاف بھر

اُٹھ قدامت کو مٹا

وضع کر آئیں نیا

قومِ خفتہ کو جگا

جگمگا دے نورِ شمعِ عشق سے کون و مکاں

پھر وہی جذبات ہوں ہر قلبِ مردہ میں جواں

اے مرے ہندوستاں!

اس طرح کب تک رہے گا تُو اسیرِ یاس و غم

تا بہ کے مل کر نہ بیٹھیں گی تری قومیں بہم

تا بہ کے شیخ و برہمن، تا کجا دیر و حرم

یہ عداوت تا کجا

یہ جہالت تا کجا

بغض و نفرت تا کجا

اس طرح تو اور بھی بڑھ جائیں گی نا کامیاں

اتفاقِ باہمی سے ہے نشاطِ جاوداں!

اے مرے ہندوستاں!

کھول کر آنکھیں زمانے کی ذرا رفتار دیکھ

ہو رہی ہیں سازشیں کیا کیا پسِ دیوار دیکھ

آج ہے کس فِکر میں ہر قافلہ سالار دیکھ

دیکھ رنگِ کارزار

دیکھ یہ خونیں بہار

دیکھ یہ جیت اور ہار

یا اسی لمحے سے کر آغازِ تقلیدِ جہاں

یا جہاں والوں کو تُو اپنا بنا لے ہم زباں

اے مرے ہندوستاں!

دیوبند ۱۹۳۳

چُپ

کلی سے یوں کہا بادِ سحر نے تجھے پالا ہے آغوشِ قمر نے

ستارے رات بھر گاتے رہے ہیں تجھے گیتوں سے بہلاتے رہے ہیں

گھٹا تیرے لئے پیمانہ بر کف تُو خود اک ساقیِ میخانہ بر کف

بہاریں جس پہ نازاں ہیں وہ تُو ہے

گلستاں جس سے خنداں ہیں وہ تُو ہے

کلی نے جب سُنی تعریف اپنی تو وہ بادِ سحر گآہی سے بولی

ہے بالکل ٹھیک جو تُو کہہ رہی ہے لبوں سے تیرے گنگا بہہ رہی ہے

چمن کی زندگی ہوں، جان ہوں میں چمن والوں کا دین ایمان ہوں میں

کلی یہ کہتے کہتے ہو گئی چُپ،

نسیمِ صبح نے بھی سادھ لی چُپ

دہلی ۱۹۳٦

کرشن

جس طرح مشرق سے ہنگامِ طلوعِ آفتاب

چہرۂ گیتی سے اُٹھ جاتا ہے ظلمت کا نقاب

بالکل ایسے ہی ترے جلووں سے چمکی کائنات

پیکرِ مردہ میں تُو نے پھُونک دی روحِ حیات

زندگی سے تیری اہلِ دہر پر روشن ہوا

زندگی سے زندگی کی کشمکش ہے مدعا

بے عمل تا دیر اس دنیا میں رہ سکتا نہیں

کاوشیں دشوارئ ہستی کی سہہ سکتا نہیں

فرضِ اوّل ہے عمل ہی آدمی کے واسطے

ہے یہی آوازِ منزل رہبری کے واسطے

کھل گیا جس پر بقیدِ زندگی سِرّ حیات

ہو گیا وہ کامیاب و کامگارِ کائنات

کرشن! تُونے کُل جہاں کو درسِ آزادی دیا

دل جو تھے برباد اُن کو رنگِ آبادی دیا

جزب روحوں کو کیا اک بانسری کے گیت سے

کر لیا قابو میں آوارہ سَروں کو پریت سے

تُونے دُنیا پرکیا وہ رازِ فطرت آشکار

عقلِ انساں کس میں تھی اُلجھی ہوئی لیل و نہار

" روح لا فانی حقیقت ہے کبھی مرتی نہیں"

"جسم ہوتا ہے فنا، یہ بے رُخی کرتی نہیں"

سر زمینِ ہند کو اے کرشن تجھ پر ناز ہے

یہ جنم بھومی ہے تیری، اس لئے ممتاز ہے

منصُور کی موت

دُور وہ ہم سے بظاہر ہے مگر دُور نہیں

کون کہتا ہے کہ اب بزم میں منصور نہیں

یوں بھی جاتا ہے کوئی چھوڑ کر اپنوں کو بھلا

مشربِ عشق و وفا میں تو یہ دستور نہیں

مستیِ بادۂ عشرت میں جدائی کا الم

ہم کو منظور نہیں، اس کو بھی منظور نہیں

اور اگر سچ ہے کہ وہ چھوڑ گیا ہے ہم کو

نقصِ تقدیر ہے، انسان کا مقدور نہیں

اُٹھ گیا محفلِ احباب سے منصور احمد

کوئی تسکین کی صورت، دلِ رنجور نہیں

منحصر قوّتِ بینائی تھی جس پر، نہ رہا

شمع روشن ہے مگر بزم میں وہ نور نہیں

یہ کرشمہ بھی ہے ادراک کی حد سے باہر

آدمی زیست پہ مجبور ہے، مجبور نہیں

چشمِ ظاہر سے اگر دُور ہے منصور تو کیا

اے ضیا دیدۂ باطل سے تو مستور نہیں

دہلی ۱۹۳۷

اے گُل

اے گلِ نووارِدِ اقلیمِ حُسن
سوز کی لذّت سے تو واقف نہیں

مست تو اپنے ہی رنگ و بو سے ہے
حُسن کی فطرت سے تو واقف نہیں

ہے تبسّم ریز ہر شام و سحر
گردشِ قسمت سے تو واقف نہیں

راہِ تسکیں پر ہے سر گرمِ سفر
منزلِ وحشت سے تو واقف نہیں

خود نمائی، خود پرستی، خود روی
دوسروں کی مت سے تو واقف نہیں

ہے اسیرِ تنگنائے نازِ حُسن
عشق کی وسعت سے تو واقف نہیں

دل ترا آلائشِ غم سے ہے پاک
یاس اور حسرت سے تو واقف نہیں

اضطرابِ دل ترے نزدیک ہیچ
حاصلِ کلفت سے تو واقف نہیں

خود ہی ساقی، خود ہی میخانہ ہے تو
خود ہی بادہ خود ہی پیمانہ ہے تو

دیکھ، وہ مشرق سے نکلا آفتاب
نور ریز و نور پاش و نور بار

لیکر انگڑائی اُٹھا گلشن تمام
خوابِ غفلت سے ہو تُو بھی ہوشیار

دیکھ دُنیا کی فنا انجامیاں
جاودانی یہ نہیں تیری بہار

ہر بہارے را خزانے لازم است
زندگی کا کِس طرح ہو اعتبار

آ گیا ہے کیوں فریبِ حُسن میں
حُسن پر ناداں ہے کس کو اختیار

پھُول لاکھوں اور بھی ہیں باغ میں
یہ حقیقت ہے نہایت نا گوار

یہ تبسّم، یہ مسّرت، سب غلط
تُو تو ہے پروردۂ آغوشِ خار

اندلیبانِ چمن کے گیت سُن
کر جگر کے پیرہن کو تار تار

پی شراب کہنۂ عشق و جنوں
جاودانی کیف سے ہو ہم کنار

دل میں کر مہمان اپنے، سوز کو
بھُول جا فردا کو اور امروز کو

سوز ہے مضرابِ سازِ زندگی
صورتِ نغمہ بغیر اس کے کہاں

سوز سے روشن ہے بزمِ کائنات
گود میں اس کی ہوئی دُنیا جواں

سوز سے ہر دل حرارت آشنا
آرزو کا خون رگ رگ میں رواں

ساقیِ میخانۂ ہستی ہے سوز
اس کی نظروں میں شرابِ ارغواں

داستانِ سوز کے عنواں ہیں سب
آفتاب اور چاند، تارے، کہکشاں

وہ حقیقت در حقیقت سوز ہے
جس سے ہے یہ ربطِ باغ و باغباں

دل بغیرِ سوز دل ہوتا نہیں
سوز ہی ہے صرف دل کا رازداں

ہے یہی سعیِ مسلسل کا سبب
سوز سے ہوتا ہے انساں کامراں

کاروانِ زیست کی منزل ہے سوز
سوز ہے اصلِ نشاطِ جاوداں

میکاشانِ درد کا ساقی ہے سوز
حُسن فانی ہے مگر باقی ہے سوز

دہلی ۱۹۳۷

اگر خدا ہے

اگر خدا ہے تو پھر زمانے میں رنج و اندوہ و درد کیوں ہے
زبانِ بلبل پہ نالہ کیا ہے، یہ روئے گُل زرد زرد کیوں ہے
اگر خدا ہے تو کیوں نہیں ہے بہار عالم کی جاودانی
ہر ایک شے بے ثبات اس کی، ہر ایک شے اسکی آنی جانی
اگر خدا ہے تو کس لئے ظلم ڈھائے جاتے ہیں بے کسوں پر
فلک سے کیوں بجلیاں سی گرتی ہیں بے نواؤں پہ، بے بسوں پر
اگر خدا ہے، اگر خدا نے بنائی ہے کائنات ساری
تو کیوں ہر اک سمت پھر ہیں فتنے فریب و مکر و ریا کے جاری
اگر خدا ہے تو ایک حالت پہ کیوں نہیں ہے نظامِ ہستی
کہیں شب و روز شورشیں ہیں، کہیں بلندی، کہیں ہے پستی
اگر خدا ہے تو کیوں نہیں ہے تمام دُنیا وفا کی حامی
کہیں حکومت ہے مست و سرخوش، تڑپ رہی ہے کہیں غلامی
اگر خدا ہے تو کیوں نہیں ہیں نشاط و غم دونوں اختیاری
رگوں سے دُنیا کی کیوں ہے دن رات خون بے چارگی کا جاری
اگر خدا ہے تو پھر اُمیدوں کے ساتھ خوف و ملال کیا ہے
زوال کیوں ہے مسرّتوں کو، غموں کو حاصل کمال کیا ہے
اگر خدا ہے تو کیوں نہیں ہے خدا کے بندوں میں عشق و اُلفت
نہ جسم کو ہے قرار حاصل، نہ روح کو ہے نصیب راحت

اگر خدا ہے تو کیوں نہیں اس کو اپنی دنیا کی فکر و پروا
ازل سے سویا ہے یوں کہ بیدار تا ابد اب نہ ہوگا گویا
اگر خدا ہے ترا یہی، اے فرشتۂ نیک نام سُن لے
میں حشر تک بھی نہیں بنوں گا ترے خدا کا غلام، سُن لے
نہ بھول اپنی حقیقتوں کو کہ ابنِ آدم ہے نام تیرا
ابھی فلک کی بلندیوں پر ہے تذکرہ صبح و شام تیرا
زباں پہ تاروں کی ہیں ابھی تک تری جوانی کے گیت جاری
ہیں آبشاروں کے سازِ دل کش پہ کامرانی کے گیت جاری
بہار تیرے لئے چمن کا سنگھار کرتی ہے رنگ و بو سے
خزاں پھر آگاہ اس کو کرتی ہے تیری فطرت سے اور خو سے
ترے ہی سامانِ دلکشی ہیں یہ روز و شب، مہر و ماہ تارے
عروسِ فطرت تجھی کو کرتی ہے پردۂ ابر سے اشارے
یہ واقعہ کل کا ہے کہ سجدے کئے ملائک نے تیرے آگے
فضائے جنّت میں ہو رہے ہیں ابھی تری عظمتوں کے چرچے
وہ دن ہے محفوظ ذہنِ فطرت میں جب ہیولہ بنا تھا تیرا
خیال دل میں مصّورِ دو جہاں کے پیدا ہوا تھا تیرا
خدا کو تو یاد ہے ابھی تک خدا تجھے یاد ہی نہیں ہے
بُھولا کے جنّت کی عشرتوں کو تُو اب غلامِ غمِ زمیں ہے
ترے تغافل کا ہے یہ دھوکا، غم و الم ورنہ کچھ نہیں ہے
جُھکی ہوئی آستانِ شیطاں پہ روز و شب کیوں تری جبیں ہے
وجودِ شیطاں تو اک نتیجہ ہے ذہنیت کی غلط روی کا
یقین کر اس کی پیروی سے تجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا

اگر نہ بزمِ جہاں کا مقصد تغیّر و انقلاب ہوتا

اُبھر کے نا کامیوں کی پستی سے کیوں کوئی کامیاب ہوتا

خدا سے منکر ہے ابنِ آدم فریبِ عالم کا سحر، توبہ

چُھپا لیا ہے گلوں کا پرتَو، نمودِ شبنم کا سحر، توبہ

وہ دیکھ مشرق سے نور اُبھرا لئے ہوئے جلوۂ حقیقت

مجاز کی ترک کر غلامی کہ توُ تو ہے بندۂ حقیقت

دہلی ۱۹۳٦

محروم سے

سکوں نہیں ہے مقدّر میں اہلِ عالم کے

نہ کر شکایتِ سامانِ اضطراب نہ کر

نہ چھوڑ دامنِ اُمید، نا اُمیدی میں

دلِ خراب کو یوں اور بھی خراب نہ کر

ازل سے رندی و مستی ہے مشربِ ہستی

شراب و ساقی و ساغر سے اجتناب نہ کر

غمِ فراق ہی دراصل ہے نشاطِ وصال

یہ رازِ عشق زمانے پہ بے نقاب نہ کر

شکیب و صبر سے اوُنچی نہیں کوئی منزل

فریبِ دہر میں آکر اسے خراب نہ کر

نشیب بھی ہے زمانے میں اور فراز بھی ہے

نیازمند بھی انساں ہے، بے نیاز بھی ہے

میرٹھ ۱۹۳۵

تلاش

گُل فروشوں کو چمن میں جلوۂ گل کی تلاش

میگساروں کو صراحی اور قلقل کی تلاش

خشک کھیتوں کو نشاطِ ابرِ باراں کی تلاش

رہروانِ راہِ حق کو دین و ایماں کی تلاش

دیدۂ بیمارِ نرگس کو ضیاؤں کی تلاش

طائرانِ خار برلب کو نواؤں کی تلاش

چشمِ پروانہ کو نورِ شمعِ محفل کی تلاش

کشتیِ بے نا خدا کو امنِ ساحل کی تلاش

وادیِ ایمن کو عزمِ پائے موسیٰ کی تلاش

بجلیوں کو خرمنِ، ہوش و تمنا کی تلاش

بے خودوں کو عالمِ امکاں میں ہے اپنی تلاش

ہے مگر صحرائے ہستی میں مجھے تیری تلاش

دہلی ١٩٣٦

تعلیمِ اسلام

کرو تلاش حقیقت کی بزمِ باطِل میں　　کہ لغزشیں ہیں کہاں پائے عزمِ کامل میں

خدا ہے ایک، نہیں ہے کوئی شریک اُسکا　　کہاں روا ہے بُتِ خانہ ساز کی پُوجا!

نجات مزہب و ملّت کے اتّحاد میں ہے　　نویدِ عشرتِ باقی خدا کی یاد میں ہے

غلط رووں کو رہِ مستقیم پر لاؤ !!　　مقابلہ ہو اگر موت کا، نہ گھبراؤ

گدا و شاہ میں کچھ امتیاز تم نہ کرو　　کسی غلام سے بھی احتراز تم نہ کرو

ستم کا نام مٹا دو جہانِ ہستی سے　　کرو دلوں کو منحسّر سرور و مستی سے

پیامِ ملّت و دیں کلُ جہاں کو پہنچاؤ　　مشالِ ابرِ بہاراں فضا پہ چھا جاؤ

خدا کے نام کو سارے جہاں میں عام کرو　　دلوں کو بادۂ وحدت سے شاد کام کرو

بصد شکوہ، بصد شانِ احترام اُٹھو　　خدا کے کام کو، لیکر خدا کا نام، اُٹھو

جہاں کی ہیچ ہیں سب قوّتیں، جہاں تم ہو　　زمیں پہ صورتِ پنہائے آسماں تم ہو

جیؤ تو ذوقِ عبادت کی مستیاں لیکر　　مرو تو خونِ شہادت کی سُرخیاں لیکر

دہلی ۱۹۳۷

ہندوستان

ہوئی مدّت کہ اک تارہ فلک پر جگمگاتا تھا

سرور و کیف میں ڈُوبے ہوئے نغمے سُناتا تھا

بلندی سے شعاعیں پھینکتا تھا اہلِ عالم پر

رموزِ عیش کرتا تھا نُمایاں بزمِ ماتم پر

زر وسیم و جواہر دہر والوں میں لٹاتا تھا

نشاں تاریکیوں کا نور سے اپنے مٹاتا تھا

کیا کرتا تھا صبح و شام سجدے آفتاب اُسکو

دیا کرتا تھا بوسے بزمِ گردوں کا شباب اُسکو

اچانک سوئے مغرب ایک طوفانی گھٹا اُٹھی

سکندر اور نادرشہ کا لے کے حوصلہ اُٹھی

اُٹھی اور دم زدن میں آسماں پر چھا گئی ہر سو

بلند و پست اور کون و مکاں پر چھا گئی ہر سو

بڑہایا ظلمتوں نے دستِ استبداد یوں اپنا

بنایا سارے عالم کو غلام و سر گرم اپنا

بقدرِ نور وہ تارا رہا محوِ ضیا باری

نقابِ ابر لیکن ہو گیا آخر بہت بھاری

چھُپا ایسا کہ چشمِ دہر نے دیکھا نہ پھر اسکو

کسی محمود یا تیمور نے تاکا نہ پھر اسکو

میرٹھ ۱۹۳۹

گلِ نو شگفتہ

نَو شگفتہ پُھول، تیرا مُسکرانا ہے بجا

بلبلوں کے گیت سُنکر جھوم جانا ہے بجا

رنگِ جورِ گلستاں دیکھا نہیں تونے ہنوز

جبرِ دَورِ آسماں دیکھا نہیں تونے ہنوز

تو ابھی نا آشنا ہے انقلابِ دہر سے

تو ابھی واقف نہیں رازِ سرابِ دہر سے

تو نسیمِ صبح کی آغوش کا پالا ہوا

رنگ و بو کے دل نشیں سانچے میں ہے ڈہالا ہوا

ناچتی ہے تیرے ایوانِ تصّور میں بہار

بج رہا ہے پتّیوں کا دل کش و رنگیں ستار

تیرے کانوں تک خزاں کا نام بھی پہنچا نہیں

تجھ کو کیفِ حال میں اندیشۂ فردا نہیں

منہ دُھلاتی ہے عروسِ صبح شبنم سے ترا

شیشۂ دل پاک ہے آلائشِ غم سے ترا

ذہن میں تیرے نہیں ہے صورتِ گلچیں ابھی

تونے سمجھے ہی نہیں اندازِ بغض و کیں ابھی

تو ہے اک جامِ شگفتہ چشمِ ظاہر کے لئے

اور الہامِ مجسّم قلبِ شاعر کے لئے

دہلی ١٩٣٦

نیک و بد

وہ گُل جو زینتِ بزمِ چمن ہے

وہی گُل دیدۂ گلچیں میں ہے خار

وہ مے جو شیخ کی نظروں میں باطل

اُسی مے سے ہے تازہ روحِ میخوار

وہ بُت جن سے حرم کی شان و شوکت

وہی بُت صحنِ کعبہ میں ہیں بے کار

وفا مغرب میں جنسِ ہیچ مایہ

مگر ہر مشرقی اس کا خریدار

وہی شے نیک بھی ہے اور بد بھی

تو پھر تمیزِ نیک و بد ہے دشوار

دہلی ۱۹۳٦

ہندوستانی نو جواں سے

ہیں جواں چہرے پہ کیوں آ شارِ نومیدی عیاں

کیا پسند آئی نہیں تجھ کو بہارِ گلستاں

جلوہ زارِ گل سے کیا محظوظ تو ہوتا نہیں

نغمۂ بلبل سے کیا محظوظ تو ہوتا نہیں

کیا رگوں میں ہو گیا ہے منجمد خونِ شباب

کیوں نہیں ہے تو جوانی میں بھی مجنونِ شباب

سوچتا کیا ہے مآلِ گردشِ شام و سحر

تو زمیں پر ہے مگر افلاک پر تیری نظر

چشمِ بینا ہے تو کر نظّارۂ بزمِ جہاں

یوں جوانی میں نہیں زیبا مآل اندیشیاں

تونے دیکھے ہیں کہاں اب تک بلند و پستِ دہر

کیا کریگا اے غلط اندیش، بندوبستِ دہر

تو جواں ہے، مست رہ، دُنیا کی کچھ پروا نہ کر

خوف کیسا، مشکلوں کا سامنا کر بے خطر،

دوُر ہے منزل ابھی، دشوار راہوں سے گزر

قوّتوں سے کام لے، ذوقِ عمل پر رکھ نظر

دے جہاں والوں کو تو بھی زندگانی کا ثبوت

زندگانی کا ثبوت، اپنی جوانی کا ثبوت

یاس و غم کا اپنے چہرے سے اُٹھا بھی دے نقاب

جلوہ گر پردوں سے ہے تیرا یہ خورشیدِ شباب

گل تبسّم ریز ہیں، سامانِ رست و خیز کر

خونِ گرمِ زندگی اپنی رگوں میں تیز کر

دہلی ۱۹۳۷

بلند و پست

چلی جو تُند ہوا حادشاتِ عالم کی تو تاب لا نہ سکی گُل ہوا چمن کا چراغ

نہ وہ ترانۂ بلبل، نہ وہ تبسّمِ گل ہوا ہے جبرِ خزاں سے اداس منظرِ باغ

مگر یر راز بھی اہلِ نظر پہ روشن ہے

بلند و پستِ جہاں سے نہیں نظر کو فراغ

دہلی ۱۹۳۷

صبح کا ستارہ

ستارہ صبح کا بامِ فلک پہ جب چمکا　　　تو ہمکلام ہوا اس سے قطرہ شبنم کا
کہ تو پیامِ اجل بہرِ ہستیِ شب ہے　　　تری نمود سے لرزاں وجودِ کوکب ہے
سترہ ہوکے بھی دشمن ہے تو ستاروں کا　　　تجھے پسند نہیں جلوہ ماہ پاروں کا

یہ راز کیا ہے، کہ اپنوں سے بے نیاز ہے تو
سحر کے دامنِ روشن سے سر فراز ہے تو

دیا جواب ستارے نے اس طرح ہنس کر　　　تری نگاہ یقیناً نہیں نتیجے پر
ستارہ ہوں میں، ستاروں سے پیار ہےمجھ کو　　　مگر نظر پہ ابھی اختیار ہے مجھ کو
میں دیکھتا ہوں کہ انجام شب کا کیا ہوگا　　　مآل عشرت و عیش و ترب کا کیا ہوگا

پیام دیتا ہوں خطرے کا دہر والوں کو
پھراپنی نذرِ حزیں صبح کے اجالوں کو

دیوبند ۱۹۳۳

آس

جیون ساگر ٹھاٹھیں مارے

گھور اندھیرا، دُور کِنارے

من کی نیّا، پریم سہارے

پیا ملن کی آس

سکھی ری! پیا ملن کی آس

کوئی پھول چڑھنے آئی

کوئی گیت سُنانے آئی

میں بھی پریم جتانے آئی

پریم ہی میرے پاس

سکھی ری! پیا ملن کی آس

پریم کی جوت جرے جس من میں

وہ من بھی رہتا ہے تن میں

کوئل کُوک رہی ہے بن میں

پھُولوں میں ہے باس

سکھی ری! پیا ملن کی آس

کیونکر روؤں، شور مچاؤں

پریمی منوا کو بہکاؤں

اُن کے نینن سے گِر جاؤں

مُورکھ ہوت اُداس

سکھی ری! پیا ملن کی آس

دہلی ۱۹۳۶

کس اور ؟

پیا گئے کس اور

پپیہے! پیا گئے کس اور

بدری روئے، شور مچائے

بجلی کو بھی چین نہ آئے

ناچیں کیونکر مور

پپیہے! پیا گئے کس اور

رات اندھیری کچھ نا سُوجھے

پی بِن کوئی بات نا بُوجھے

جائے کہاں چکور

پپیہے! پیا گئے کس اور

پربت اونچا ہو کر دیکھے

اور ساگر پاتال میں ڈھُونڈے

ندی مچائے شور

پپیہے! پیا گئے کس اور

میرٹھ ۱۹۳۵

من کی بُھول

دنیا والے، لوبھی بندے

مایا کے ہیں سارے پھندے

دُنیا داری کے سب دھندے

پریم ہے من کی بُھول

سکھی ری پریم ہے من کی بُھول

جھُوٹا دن اور رات بھی جھُوٹی

مدہ ماتی بر سات بھی جھُوٹی

ساون کی سوغات بھی جھُوٹی

جھُوٹے ہیں یہ پھُول

سکھی ری پریم ہے من کی بھُول

پریت کے جس نے بھید بتائے

پریت کے جس کو گیت سُنائے

وہ پریمی پردیش کو جائے

اُڑتی جائے دھُول

سسکھی ری پریم ہے من کی بھُول

دہلی ١٩٣٦

برہن کا گیت

پیتم نا ہیں آئے

سکھی ری ساون بیتا جائے

پیتم بِن سنسار ہے سُونا

دیس، نگر، گھر، بار ہے سوُنا

یہ پھُولوں کا ہار ہے سُونا

کون اِسے پہنائے

سکھی ری پیتم نا ہیں آئے

پیتم کا پردیس میں باسا

بھاری ہے مجھ پر چو ماسا

ٹوُٹ چلی ہے من کی آسا

کون اب دھیر بندھائے

سکھی ری پیتم نا ہیں آئے

نیلا امبر، کارے بادل

جیسے ہو نینوں میں کاجل

من مورا ہے پریم کی کونپل

کھِلتے ہی مُرجھائے

سکھی ری پیتم نا ہیں آئے

بِجلی چمکے، پانی برسے

سکھیوں کا دل کانپے ڈر سے

پی کارن نِکلی میں گھر سے

نِکلی جوگ رمائے

سکھی ری پیتم نا ہیں آئے

جھُوٹے جگ کی پریت ہے جھُوٹی

مایا، موہ، کی ریت ہے جھُوٹی

کیا میری بھی میت ہے جھُوٹی

کون مجھے جھُٹلائے

سکھی ری ساون بیتا جائے

چین نہیں ہے مورے من کو

پریت کی آگ لگی ہے تن کو

آگ لگاؤں اس جوبن کو

پی درشن نا پائے

سکھی ری ساون بیتا جائے

میں پاپن، قسمت کی ماری

کر کے پریت ہوئی دُکھیاری

اب تو میں بھی رو رو ہاری

کوئی اُنہیں لے آئے

سکھی ری ساون بیتا جائے

سکھوتی ٹانڈہ ۱۹۳٤

من کا گیت

پھُولوں پر بھنورا منڈلائے

جھرنا اپنی دھُن میں گائے

بدری جگ کا جی للچائے

میرے من کا گیت

اُن بِن کون سُنے میرے من کا گیت

تارے چمکیں، چلیں ہوائیں

سُکھیوں کا سُکھ چین بڑہائیں

دُکھ میں یہ بھی آگ لگائیں

جھُوٹی جگ کی پریت

اُن بِن کون سُنے میرے من کا گیت

چندرماں ہے مُرجھایا سا

دھرتی کا دل بھی ہے پیاسا

من کو کیا ہو دھیرج، آسا

گئی بسنت بھی بیت

اُن بِن کون سُنے میرے من کا گیت

دہلی ۱۹۳٦

نہ روک

پریم کا بیج جو من میں بوئے

اس کو کیونکر دھیرج ہوئے

رونے سے نہ روک

سکھی ری، رونے سے نہ روک

کاری کاری بدری روئے

آنسو سے آنچل کو دھوئے

اُس کو بھی تُو ٹوک

سکھی ری، رونے سے نہ روک

پاپی من ہے پریم پُجاری

لگی کلیجے بِرہ کٹاری

ہوش گئے پرلوک

سکھی ری، رونے سے نہ روک

میرٹھ ۱۹۳۵

پی بِن

پیا بِن سُونا کُل سنسار

کس کے نینوں میں چھپ جاؤں

کس کو پریم کے گیت سناؤں

سُونا کُل سنسار

سُوکھا بیتا سارا ساون

کیونکر قابو میں آئے من

پیا بسیں اُس پار

ڈگمگ ڈولے من کی نیّا

پریم بِنا ہو کون کھویا!

پریم ہی ہے پتوار

دہلی ۱۹۳۶

جوانی

بہار و شعر و موسیقی لئے دامانِ رنگیں میں
جوانی ہر نظر کو حُسن کا پیغام دیتی ہے
امید و آرزو اور شوق کے ایوانِ رنگیں میں
شرابِ بے خودی کے جام صبح و شام دیتی ہے
جوانی سُرمدی نغمے کچھ اِس ڈھب سے سُناتی ہے
جنہیں سُنکر یقیں انساں کو آ جاتا ہے ہستی پر
کہیں چشمے بہاتی ہے، کہیں غنچے کِھلاتی ہے
کہیں مجبور کرتی ہے چمن کو خود پرستی پر
دلِ آزاد میرا بے نیازِ بانگِ رہبر ہے
یہ جس رستے پہ لے جاتا ہے اُس رستے پہ چلتا ہے
نہ ڈر تنقیدِ عالم کا، نہ خوفِ قہرِ داور ہے
جوانی ڈھالتی ہے مجھ کو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں
یہی دن ہیں جوانی کے، محبّت کے مسّرت کے
ضیفی کو مبارک حوصلے زہد و عبادت کے

لاہور ۱۹۳٤

محبّت

محبّت لفظ تو سادہ سا ہے، لیکن ضیا اِس میں

سمٹ آئی ہیں سب رنگینیاں گلزارِ ہستی کی

کرے تفسیر اس کی کوئی، اتنی تاب ہے کِس میں

کہ یہ تو آخری منزل ہے راہِ کیف و مستی کی

محبّت سے ہے وابستہ ترقی روحِ انساں کی

یہ رازِ عالمِ ایجاد سے آگاہ کرتی ہے

یہی تنظیم کرتی ہے خیالاتِ پریشاں کی

دلوں کو بے نیازِ حُسنِ مہر و ماہ کرتی ہے

رواں ہیں میری رگ رگ میں محبّت کی حسیں لہریں

نفس کی ہر صدا سے راگنی اُلفت کی سُنتا ہوں

تماشا حُسن کا کرتا ہوں اکثر اس کے نغموں سے

محبّت کی نوا سامانیوں پر سر میں دھُنتا ہوں

محبّت اک حسیں نشتر ہے، جو جزبِ رگِ جاں ہے

محبّت میرا مزہب ہے، محبّت میرا ایماں ہے

لاہور ۱۹۳٤

دل

دل بظاہرخون کا اک قطرۂ نا چیز ہے

اس میں لرزاں ہے مگر موجِ شرابِ زندگی

اس کے آگے جلوۂ رنگِ شفق کیا چیز ہے

منحصر اس کی نمو پر ہے شبابِ زندگی

جیسے روشن ہو فلک پر آفتابِ زرنگار

اس طرح دل خاک دانِ دہر میں ہے نور پاش

عقل کا رہتا نہیں احساس پر جب اختیار

دل ہی کرتا ہے فریبِ رنگ و بو کے راز فاش

دل اور الفت، لفظ تو دو ہیں مگر مطلب ہے ایک

منسلک دونوں ازل سے ایک ہی رشتے میں ہیں

جس طرح آغاز و انجامِ مہ و کوکب ہے ایک

ایک ہی منزل ہے انکی، ایک ہی جادے میں ہیں

آدمی کو آشنائے غم بنا دیتا ہے دل

عشرتِ جاوید کا محرم بنا دیتا ہے دل

لاہور ١٩٣٤

اپنی میرا سے

کہوں میں آہ کیوں کر، مجھ کو تجھ سے پیار ہے میرا

تصّور سے ترے دن رات ہم آغوش رہتا ہوں

کچھ ایسا کیف پرور عشق کا آغاز ہے میرا

کہ اس نشّے میں ہر دم بے خود و مدہوش رہتا ہوں

نہ دنیا کی خبر مجھ کو، نہ اپنا ہوش ہے مجھ کو

بس اتنا جانتا ہوں، تو ہے، تیری یاد ہے میرا

نہ فکرِ عالمِ فردا، نہ رنجِ دوش ہے مجھ کو

محبّت واقعی ہر قید سے آزاد ہے میرا

میں کہہ تو دوں مگر میرا دلِ مجبور ڈرتا ہے

کہ یہ جرّات نہ باعش ہو پریشانی و وحشت کا

یہی غم میری اُمیدوں میں رنگِ یاس بھرتا ہے

یہی غم راہ بر ہے منزلِ دردِ محبّت کا

تجھے معلوم ہی ہے جو میرے دل پر گزرتی ہے

تو پھر کیوں امتحاں لیکر مجھے نا کام کرتی ہے

لاہور ١٩٣٤

یاد

وہ نغمے، وہ مناظر، وہ بہاریں یاد ہیں مجھ کو

یہی وہ نقش ہیں جو مِٹ نہیں سکتے مِٹانے سے

وہ راتیں اور وہ ساون کی پھواریں یاد ہیں مجھ کو

یہی افسانے اکثر کہتا رہتا ہوں زمانے سے

وہ تیرا مُسکرا کر چاند کو تا بندگی دینا

شرابِ عشق سے مخمور ہو جانا فضاؤں کا

وہ تیری مست آنکھوں کا نویدِ زندگی دینا

وہ اکثر کھیلنا زلفِ پریشاں سے ہواؤں کا

مرا دل ہو گیا ہے گردشِ ایّام سے واقف

بلند و پستِ عالم پھر رہے ہیں میری آنکھوں میں

مزاقِ دل بری ہے عشق کے پیغام سے واقف

تصّور ہے مرا کھویا ہوا سا تیری آنکھوں میں

تُو مجھ سے دوُر ہے لیکن تجھے میں یاد کرتا ہوں

نہ جب فریاد کرتا تھا، نہ اب فریاد کرتا ہوں

دیوبند ١٩٣٤

دھوکا

تم نے کیوں دیکھا مری جانب نگاہِ ناز سے

مجھ کو یہ دھوکا ہوا بیدار قسمت ہو گئی

وہ نگاہِ ناز، جس سے سینکڑوں پردے اُٹھے

داغِ نا کامی مرے دامانِ دل سے دھو گئی

ہو گیا خونِ تمنا میری رگ رگ میں رواں

فتنے جو سوئے ہوئے تھے لیکر انگڑائی اُٹھے

چھا گیا دنیا پر افسونِ شبابِ جا وداں

بے نیازِ ہوش ہو کر مست و سودائی اُٹھے

تم نے دیکھا ہے اگر مجھ کو نگاہِ لطف سے

نکتہ چین سارا زمانہ ہے تو میں غم کیا کروں

جلوہ گر ہردم رہو میری نظر کے سامنے

دیکھنے کی تاب ہے جب تک، تمہیں دیکھا کروں

دل لیا ہے، روح بھی لے لو خدا کے واسطے

میں تمہارے واسطے ہوں، تم ہو میرے واسطے

دہلی ۱۹۳۷

اضطراب

ستارے آسماں پر مضطرب ہیں، خاک پر زرّے
نہ اُنکو چین حاصل ہے، نہ اِن کو چین حاصل ہے
فضا لرزاں، ہوا بے کل، سکوں نا آشنا پتّے
پریشاں بحر میں موجیں ہیں اور بے تاب ساحل ہے
گل و لالہ ہیں سینہ چاک، بے چینی کا ماتم ہے
فضا میں تھر تھراتی ہیں نوائیں عندلیبوں کی
اسیرِ اضطراب و درد و غم یہ بزمِ عالم ہے
تمناؤں سے ٹکراتی ہیں آہیں نا شکیبوں کی
مجھے بھی فطرتِ سیماب نے بخشی ہے اک دولت
مرا دل بھی کسی کی یاد میں بے تاب رہتا ہے
حقیقت میں یہی بے چینیاں ہیں باعشِ راحت
اسی تسکیں کی موجوں میں مرا ہر شعر بہتا ہے
شباب و اضطراب و عشق سے تخلیقِ ہستی ہے
اِسی تشلیش پر قایم نظامِ کیف و مستی ہے

میرٹھ ۱۹۳۵

جدائی

جدائی، آہ یہ اک لفظ کتنا یاس آگئیں ہے

تصّور اِس کا امیدوں پہ پانی پھیر دیتا ہے

ہزاروں کوس اِس سے منزلِ آرام و تسکیں ہے

جو اِس سے ہو گیا واقف وہ پھر کب چین لیتا ہے

جدائی باغ کی رنگینیوں کو چھین لیتی ہے

شراب و رقص سے محروم کر دیتی ہے انساں کو

جہاں آرائیوں، خود بینیوں کو چھین لیتی ہے

چُھپا دیتی ہے مایوسی کی تاریکی میں ارماں کو

یہ سب کچھ ٹھیک ہے، مگر مجبور ہے میرا دلِ محزوں

محبّت پرورش پاتی رہی ہے اِس کے دامن میں

جمالِ دوست سے مہجور ہے میرا دلِ محزوں

وہ دشمن دوست تڑپایا تھا جس نے مجھ کو ساون میں

اُنہیں ہاتھوں میں دیدی ہے عنانِ آرزو میں نے

بھروسے پر خدا کے چھوڑ دی ہے جستجو میں نے

لاہور ١٩٣٤

دیوی

تجھے دیوی بنا کر پُوجتا ہوں دل کے مندر میں

ترے ہی گیت سازِ دو جہاں پر گاتا رہتا ہوں

جبینِ شوق جُھک کر تیرے قدموں سے نہیں اُٹھتی

اُمیدوں سے دلِ معصوم کو بہلاتا رہتا ہوں

پُجاری بن کے تیرا، بے نیازِ دین و دنیا ہوں

تعلق اب خدا و حشر سے کچھ بھی نہیں مجھ کو

چمن میں رہ کے بھی اہلِ چمن سے دُور رہتا ہوں

کہ ہردم دیکھتا ہوں میں گلوں کے رُوپ میں تجھ کو

"پُجاری" اور "دیوی"، دیکھنے کو ہستیاں دو ہیں

مگر دونوں کی روحیں ایک ہیں کیفِ محبّت میں

"نیازِ عشق" و "نازِ حُسن " یونتو مستیاں دو ہیں

مگر دل پر اثر ہے ایک دونوں کا حقیقت میں

یہ تکمیلِ جنوں ہے، حاصلِ صد بیقراری ہے

پُجاری ہے کبھی دیوی، کبھی دیوی پُجاری ہے

دہلی ۱۹۳۷

ضیا کے سو شعر

(جناب مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کے ایک سو منتخب اشعار کا مجموعہ)

مرتبہ

گجندر لال سونی .موہن بلڈنگ.نزد لایڈز بنک. دہلی

۱۹۳۸

تقریب

ہر انسان اپنے جذبات کی قدر کرتا ہے اور اپنے جذبات کی قدر کرنا ہی دراصل انسانیت کا شبوت دینا ہے.

شاعر کا درجہ انسانیت کی انجمن میں بہت بلند ہے صرف اپنے جذبات کی قدر نہیں کرتا بلکہ اُن کو لفظی جامہ پہنا کر تمام دنیا کو ابداللہ باد تک اُن کی قدر و منزلت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے.

در حقیقت وہی شعر کامیاب ہے جس کو شاعر کے جذبات کا صحیح آئینہ کہا جا سکتا ہے. کامیاب شعر لوحِ عالم پر نقشِ دوام ہے.

ضیا فتح آبادی

دہلی

یکم اکتوبر ۱۹۳۸

ضیا کے سو شعر

کافر بنا دیا کہ مسلماں بنا دیا

فطرت کا شکر کر، تجھے انساں بنا دیا

اب تو چھیڑ دو کوئی گیت سازِ موج پر

قیدِ آبشار تھی، آبشار آ گیا

بجلیوں نے کر دیا آشیاں کو مشتِ خار

مجھ کو اپنی زیست پر اعتبار آگیا

فطرتِ غم کو گوارا نہ ہوا یہ بھی مگر

جینا مشکل تھا تو مرنا مجھے آساں ہوتا

خون روتا ہوں کہ انساں بھی نہیں ہے انساں

یہ بڑی بات تھی انساں اگر انساں ہوتا

دل اگر عشرتِ فردا کی نہ رکھتا اُمّید

کیوں مہیا غمِ امروز کا ساماں ہوتا

کشتی ساحل پر ڈوبی ہے

موجیں ہوتیں، دریا ہوتا

مرگِ ضیا پہ کِس لئے روئے خوں بہائیے
اچھا ہوا کہ مر گیا، زندۂ جاوداں ہوا

کر رہا ہے چاند تاروں سے کلام
ہو گیا ہے یہ تجھے دیوانے کیا

میں اُن سے بھی نہیں کہتا ہوں وجہِ اضطرابِ دل
زمانے پر کہیں رازِ نہاں ظاہر نہ ہو جائے

چاہا بُتوں کو میں نے تو میں بے قصور تھا
بُت مجھ سے تھے قریب خدا مجھ سے دُور تھا
فصلِ خزاں جو آئی تو مُرجھا کے رہ گئے
پھُولوں کو اپنے حُسن پہ کتنا غرور تھا
وہ وقت کیوں شمار ہو میعادِ زیست میں
وہ وقت جب میں تیرے تصّور سے دوُر تھا

گلوں سے رنگ اُڑا گلستاں سے کچھ نہ ہوا
خزاں جو آئی تو پھر باغباں سے کچھ نہ ہوا
جلا کے خاک ہی بلبل کو کر دیا آخر
گری جو برق تو پھر آشیاں سے کچھ نہ ہوا

ہوئی تقسیم جب محبّت کی

میرے حصّے میں انتظار آیا

روشِ میکدہ بدل دیتا

کوئی ایسا نہ ہوشیار آیا

منزلِ ہوش میں کچھ بھی تو نہیں غم کے سوا

راستہ کوئی دکھا دے مجھے میخانے کا

رازِ بقا سمجھ نہ سکا جب بقیدِ زیست

فردا کی اک اُمید پر انساں فنا ہوا

اُس نے بھُولا دیا تجھے، تھی یہ بھی مصلحت

لیکن تُو اُس کو بھُول گیا، یہ بُرا ہوا

محفل میں اور کوئی نہیں اپنا رازداں

ہم سوز اک دِیا ہے سو وہ بھی بُجھا ہوا

گمرہی میں ہے ایک لطف ضیا

جاؤ میں راہ پے نہہیں آتا

موت غم سے نجات کیا دیگی

اس سزا کی نہیں کوئی میعاد

اب چمن میں بہار کیوں آئے

اب نہ بجلی ہے اور نہ ہے صیّاد

بہت اچھا کیا اے برق اِسے برباد کر ڈالا
چمن والوں کی آنکھوں میں کھٹکتا آشیاں کب تک

دست و پا محرومِ جنبش، عقل مجبورِ جنوں
اس پہ بھی ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہیں آزاد ہم
تُو ہماری بے کسی پر خون کے آنسو بہا
رو رہے ہیں حال پر تیرے دلِ ناشاد ہم

مجھے ڈر ہے کہ سوزِ غم کہیں ارزاں نہ ہو جائے
لگادوں آگ اپنے سوزِ غم سے قلبِ دوراں میں

دیکھنا تھا مجھ کو طوفانوں کا زور
آگیا یہ بیچ میں ساحل کہاں
آخری ہِچکی میں تھا رازِ حیات
مجھ کو دُنیا نے کیا قائل کہاں

اُن کو بھی روندتی ہوئی دُنیا چلی گئی
کلیاں سی کچھ کِھلی تھیں شبِ ما ہتاب میں
تا آدمی کرے نہ فرشتوں کی ہمسری
نا کامیاں ہیں درج محبّت کے باب میں

کروں نا خدا سے اُمیدِ کرم کیا

خدا کو بھی نا مہرباں دیکھتا ہوں

مآلِ جوانی، محبّت کا حاصل

اک اُجڑا ہوا آشیاں دیکھتا ہوں

ممکن نہیں کہ حُسن نہ لے عشق سے اثر

وہ سامنے تو آئیں، ذرا گفتگو کریں

صیّاد کی نگاہ اُنہیں بلبلوں پہ ہے

گلشن میں جو مخالفتِ رنگ و بُو کریں

ہو آرزوئے زیست کہ ہو آرزوئے مرگ

ممکن نہیں ہے کچھ بھی توکیا آرزو کریں

میں نے اُسی کے سامنے عشق کا راز کہہ دیا

مجھ سے یہ بھُول ہو گئی عالمِ اضطرار میں

جس نے سمجھ لیا کہ زیست نام ہے اضطراب کا

اُس کو سکون مل گیا گردشِ روزگار میں

آخرِ کار یاس نے عقل کو یہ دیا فریب

زیست پر اپنا بس نہیں موت ہے اختیار میں

جب تصّور میں کسی کے کبھی کھو جاتا ہوں

زندگی کے وہی لمحات حسیں ہوتے ہیں

زمانہ قصّۂ مجنوں پہ کیوں کرے حیرت

کہ آج کل بھی تو دیوانے پائے جاتے ہیں

وہی تو ہوتے ہیں باعش خزاں کی آمد کا

جو گلُ بہار سے پہلے کِھلائے جاتے ہیں

یہ مقامِ عشق ہے بالائے فہم

تجھ کو پاکر آپ کھو جاتا ہوں میں

داستانِ دل ہے کہنے کے لئے

داستانِ دل کہے جاتا ہوں میں

اس کے دل میں بھی ہے داغِ سوزِ عشق

چاند کو ہم داستاں پاتا ہوں میں

ازل میں جب ہوئی تقسیم عالمِ فانی

بطورِ خاص ملا سوزِ جاوداں مجھ کو

خزاں ہی لوٹ کر آجائے، آشیاں تو ملے

کیا بہار نے محرومِ آشیاں مجھ کو

خدا، سُنا ہے مددگار ہے غریبوں کا

کبھی تو پوچھ ہی لےگا کہ ماجرا کیا ہے

امتحانِ بے خودی تو ہو چکا

امتحانِ ہوش ہونا چاہئے

چاہئے مجھ کو ایک دل، ہاں مگر ایسے ظرف کا

درد کی ساری کائنات جس میں سمٹ کے آ سکے

یا مری زندگی کو دے اپنی نگاہ میں اماں

یا مجھے اس طرح مٹا پھر نہ کوئی مٹا سکے

مجھے دیوانگی کا درس دے کر

خفا کیوں ہو مرے دیوانہ پن سے

باقی ہے مرے پیمانے میں تھوڑی سی شرابِ مجبوری

جینا ہے ابھی کچھ روز مجھے، مرنے والوں کا غم ہی سہی

مل گیا جو جس کی قسمت میں تھا آتے ہی بہار

خندۂ گل باغ کو اور چاک دامانی مجھے

اے زباں، یہ تابِ گویائی کی پہلی شرط ہے

ذکرِ حُسنِ دوست صبح و شام ہونا چاہئے

اتنا رہے خیال او مخمور و بے نیاز

نا کام لوٹتا ہوں تری بار گاہ سے

تارے مری طرح ہیں جگر سوز و بے قررار

تاروں کو مانگتا ہوں شبِ رو سیاہ سے

نہ ہستی پر یقیں مجھ کو نہ مستی پر یقیں مجھ کو

مری فطرت ازل سے بد گماں معلوم ہوتی ہے

بھٹکتا ہے ابھی تک کارواں منزل نہیں ملتی

یہ تدبیرِ امیرِ کارواں معلوم ہوتی ہے

کوئی نا کامِ تمّنا ہی کرے اندازہ

مدعائے دلِ نا کامِ تمّنا کیا ہے

رونا اس بات پر آتا ہے کہ سوچا کیا تھا

اور اس بات پر ہنستا ہوں کہ ہوتا کیا ہے

تیری کشتی نے مصیبت میں دیا تجھ کو جواب

نا خدا تیرے خدا کا بھی بھروسا کیا ہے

او بے نیاز تُونے یہ سوچا بھی ہے کبھی

نکلے جو تیری بزم سے پھر وہ کہاں رہے

منزل سے بے نیاز رہیں اہلِ کارواں

یہ فرضِ کارواں ہے کہ ہردم رواں رہے

آ یا نہ شاخِ گلُ پہ کبھی بُلبُلوں کو چین

گلُ ہیں کہ نوکِ خار پہ بھی شاد ماں رہے

ہے یہی تو در حقیقت حاصلِ سعیِ جنوں

سامنے وہ ہوں اُنھیں تا عمر دیکھا کیجئے

ہو نہ جائے منکشف دُنیا پہ رازِ بے خودی

مست آنکھوں سے مری جانب نہ دیکھا کیجئے

مرے جنوں نے تری سادگی سے پیدا کی

وہ بات جس کو نہ سمجھا ہوں میں نہ تو سمجھے

وہ عندلیب رہے سیرِ باغ سے محروم

جو ایک پھُول کو گلزارِ رنگ و بو سمجھے

خودی کا راز زمانے میں اُن پہ فاش ہوا

تری تلاش کو جو اپنی جستجو سمجھے

ضیا یہ بھی مقدر تھا، وگرنہ

تعلق بجلیوں کو آشیاں سے

کہتے رہے فسانۂ گل قصّۂ بہار

کہنا جو تھا مگر نہ کہا اور رو لئے

اک نا مرادِ شوق سے ہم نے کہا ضیا

رونا نہیں جنوں میں روا اور رو لئے

دادِ وفا ملے نہ ملے اے خدائے عشق

اِتنا تو ہو کہ ہم پہ جفا بھی نہ ہو سکے

جانِ عزیز تُو ہمیں کتنی عزیز تھی

ہم آشیاں کے ساتھ فنا بھی نہ ہو سکے

ستارے نیند سے محروم سینے چاک پھُولوں کے

دل اپنی داستانِ بیکسی کِس کو سُناتا ہے

وہ آئے ہیں تو میرے منہ پہ رونق کیوں نہ آجائے

بہار آتی ہے گلشن میں تو غنچہ مُسکراتا ہے

یکایک بند ہو جائے نہ دھڑکن قلبِ مضطر کی

مجھے پھر چاندنی راتوں میں کوئی یاد آتا ہے

طے کر چکا ہوں منزلیں آغازِ شوق کی

اب انتظار ہے نہ شبِ انتظار ہے

ساقی کو بیدار کرو، میخانہ کیوں سُونا ہے

بادل گِھر کر آئے ہیں، میکش بھی آجائیں گے

اُن سے کہنے جاتے ہیں بے تابی دل کی لیکن

وہ رودادِ غم سُن کر دیکھیں کیا فرمائیں گے

پھُولو، تم محفوظ رہو بادِ خزاں کے جھونکوں سے

اب ہم رخصت ہوتے ہیں پھر کب واپس آئیں گے

زندگی ہے بزاتِ خود اک موت

موت کا انتظار کون کرے

کون پامالِ روزگار نہیں

شکوۂ روزگار کون کرے

باعثِ آمدِ خزاں ہے بہار

آرزوئے بہار کون کرے

ساقی تلاش کر نئے جام و سبو کہ پھر

ہے تیرے میکدے پہ نظر ہوشیار کی

دل وسعتِ جنونِ محبّت سے تنگ ہے

گنجایش اب کہاں ہے غمِ روزگار کی

انسان بن کے حرص کا دامن ہوا دراز

تکلیف دی تجھے کرمِ بے شمار کی

دلِ مایوس، مجبورِ فنا ہے

تباہی ہے، تباہی ہے، تباہی

دلِ نا فہم کا کہنا نہ مانو

ضمیر اپنا نہ دے جب تک گواہی

شاید ہے یہی منزلِ تکمیلِ محبّت

اب اُن کی جفا بھی تو با اندازِ وفا ہے

کچھ دن کے لئے کشمکشِ دہر ہے ورنہ

مرنا ہے جب اک روز تو پھر زیست میں کیا ہے

ہستی کا مقصد کچھ بھی نہیں، اور کچھ ہے تو اتنا ہے

عقبیٰ کو کھو کر پانا ہے، دُنیا کو پاکر کھونا ہے

آؤ جب تک بیدار ہیں ہم رودادِ دل کہہ لیں، سُن لیں

معلوم نہیں کب اور کیونکر اک گہری نیند میں سونا ہے

اِس پر بھی دل کو چین نہیں مجبور ہے سعی و جنبش پر

تقدیر کے سارے بندے ہیں جو ہونا ہے وہ ہونا ہے

یہ بالکل ٹھیک ہے ہم ہیں، ہمارے لالہ و گل ہیں

مگر کچھ بھی نہیں ممکن خلافِ آسماں ہم سے

ہماری نا اُمیدی میں بھی ہے اُمّید کا پہلو

کہ سعیِ رایگاں سے ہم ہیں، سعیِ رائیگاں ہم سے

چاند بھی کہہ کے تھک گیا، شمع بھی کہ کے بجھ گئی

حُسنِ ازل کی داستاں قصّۂ نا تمام ہے

عشق کی وسعتوں میں کچھ دخل نہیں ہے ہوش کو

اُس کو خرد سے کام کیا، جس کو جنوں سے کام ہے

ہلکا سا تبسّم ہے، دل سوز و جنوں پرور

اب حُسن کی رعنائی، گیسو ہے نہ شانہ ہے

نئی صبح

ضیا فتح آبادی کے لکھے قطعات، رباعیات، نظمیں و گیت

نا شر : ماہنامہ "سیماب" ، دریا گنج، دہلی

اشاعتِ اول ۱۹۵۲

تعارف

ضیا فتح آبادی کی شاعری

(پروفیسر مبشر علی صدیقی)

فروری ۱۹۵۰ کا زمانہ تھا. میں آگرہ میں مقیم تھا "شاعر" سالنامہ ۱۹۵۰ میں ایک نظم "فنکار" نظر سے گزری. اس نظم کے کئی بند مجھے پسند آئے اور دوسرے دن میں نے اعجاز صاحب سے پوچھا "ضیا فتح آبادی" کون ہیں. انکی نظم "فنکار"مجھے پسند آئی ہے. میں سالنامہ کے ریویو میں اسکا ذکر کرونگا. اعجاز صاحب نے مجھے ضیا کے مطلق بتایا کہ وہ سیماب اسکول کے ایک معزز رکن ہیں. میں شعر و ادب میں گروہ بندی کا سخت مخالف ہوں. لیکن اچھے ادب کی ہر صورت میں قدر کرتا ہوں. اسکے بعد میں نے ضیا کی متعدد نظمیں اور غزلیں پڑھیں جو "شاعر" میں شا یع ہو چکی تھیں. میری اور ضیا کی پہلی غایبانہ ملاقات نظم "فنکار" تھی اور مجھے خوشی ہے کہ انکی بعد کی نظموں نے اس ملاقات کو اور استوار کر دیا. حال میں رسالہ "سیماب دہلی" میں انکی غزلوں، رباعیوں اور قطعوں کا انتخاب شا یع ہوا ہے اور اس میں کئ ایسی چُھپی چنگاریاں ہیں جو آگے چل کر شعلے کی لپک بن سکتی ہیں. ضیا اپنے سماج اور ماحول کی پیداوار ہے. وہ نام نہاد ترقی پسند شاعر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں ترقی پسند شاعر ہے. اسکے یہاں کسان، مزدور اور طوائف پر نظمیں نہیں ہیں وہ مارکسزم کا پروپگنڈہ اپنی شاعری میں نہیں کرتا لیکن سماج کے رستے ہوئے نا سوروں کو ایک کامیاب سرجن کی طرح غلاظت سے پاک کرنا چاہتا ہے. وہ پرانا بھی ہے اور نیا بھی اور بقول فراق گورکھپوری اسکے یہاں ایک مفکرانہ اور شاعرانہ انداز کا حسین امتزاج ہے جس پر نقالی یا تقلید کی ہلکی سی بھی پرچھائیں نہیں پڑنے پاتی. وہ نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتا ہے اور چونکہ اسکے یہاں خلوص ہے اسکے بعض اشعار دل میں اتر جاتے ہیں. اسکے یہاں خامیاں بھی ہیں مثلاً بعض جگہ عامیانہ رنگ آگیا ہے.
ملاحضہ ہو —

ایک الہڑ دیہاتی لڑکی　　　پٹواری کو باپ بناکر

صاحب کی بانہوں میں پہنچی　　　لوٹی عزّت لاج گنوا کر

مگر اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے.

ضیا نے متعدد نظمیں لکھی ہیں اسکا خیال ہے کہ نظم یا غزل اچھی بری نہیں ہوتی بلکہ شاعر اچھے برے ہوتے ہیں. ایک کامیاب فنکار نظم کی ہر صنف کو کندن بنا دیتا ہے.میں پھر اس کی نظم "فنکار"کی طرف اشارہ کرونگا. اس نظم میں ضیا نے دکھایا ہے کہ موجودہ سماج نے جن گوناگوں مصائب میں فنکار کو مبتلا کر دیا ہے. اس میں سب سے بڑا سوال پیٹ بھرنے کا ہے. حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ فنکار اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرے. جذبی ڈنکے کی چوٹ اعالان کرتے ہیں:

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں ، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے

اس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے، اس وقت یہ قطرہ موتی ہے.

ضیا نے اپنی غزلیات کے انتخاب کا نام "سوزِ دوام " رکھا ہے. سرورق پر یہ شعر درج ہے –

ازل میں جب ہوئی تقسیمِ عالمِ فانی

بطورِ خاص ملا سوزِ جاوداں مجھ کو

ضیا کی غزلوں میں ایک لوچ ہے، بانکپن ہے اور ایک قسم کی دبی ہوئی شوخی ہے. وہ پنجاب کا رہنےوالا ہے. لیکن زبان نہایت پاکیزہ اور با محاورہ استمعال کرتا ہے. سیماب جیسے کہنہ مشق استاد کا یہ فیضان ہے. دو ایک جگہ غلط محاورے استمعال کئے ہیں لیکن انکو نظر انداز کیا جا سکتا ہے. اسکی غزلیات کے اشعار میں دیکھیں گے کہ اسکے دلی تا شرات و کیفیات اسکی غزلوں میں کس طرح سموئے ہوئے ہیں. اسکے بعز اشعار میں حسرت کا رنگ جھلکتا ہے.

تابِ نظر اگر ہو تماشا کریں کلیم

اب ہر طرف ضیا ہی ضیا انجمن میں ہے

پھُولوں سے نمایاں ہے جوانی میری

تاروں سے درخشاں ہے جوانی میری

ہستی کی حسیں ادائیں اس کی ممنون

اک عالمِ رقصاں ہے جوانی میری

پھُولوں کی مہک میں ہے جوانی میری

بلبل کی چہک میں ہے جوانی میری

میخانۂ ہستی کی ہے تجھ سے رونق

جاموں کی کھنک میں ہے جوانی میری

پھُولوں کا نکھار ہے جوانی میری

گلشن کی بہار ہے جوانی میری

اے بادِ صبا تیری لطافت کی قسم

مستی بکنار ہے جوانی میری

گلشن میں غزلخواں ہے جوانی میری

کُہسار پہ رقصاں ہے جوانی میری

ساحل بھی ہوئے ہیں اسکے آگے پامال

اک موجۂ طوفاں ہے جوانی میری

مہکا ہوا گلزار جوانی میری

اک ابرِ گہُر بار جوانی میری

پُر جوش ہے جزبۂ عمل سے ہردم

ہے کسل سے بیزار جوانی میری

بادل کی جوانی ہے جوانی میری

بُوندوں کی کہانی ہے جوانی میری

سیلابِ حوادث کی قسم ہے مجھ کو

موجوں کی روانی ہے جوانی میری

بادل کی اُمنگ ہے جوانی میری

موجوں کی ترنگ ہے جوانی میری

کرنا ہے مجھے نظامِ دُنیا برہم

آمادۂ جنگ ہے جوانی میری

تاروں کا رُباب ہے جوانی میری

غنچوں کا شباب ہے جوانی میری

حیرت میں ہیں اہلِ قدس و اہلِ دُنیا

بیداری کا خواب ہے جوانی میری

اُمڑا ہوا بادل شبِ گیسو پہ نثار

جذبات کا پھیلاؤ جوانی کا اُبھار

آنکھوں میں ٹپکتے ہوئے انگور کا رس

گالوں پہ دمکتے ہوئے پُھولوں کا نِکھار

سنگم پہ طلوعِ صبح مستی کا سماں

اٹھکیلیاں کرتی ہوئی امواجِ رواں

آکاش پہ بُجھتے ہوئے تاروں کے چراغ

سورج کی بڑھاتا ہوا لَو حُسنِ جواں

سورج کی کرن سے آبِ سنگم روشن

چپوُ کی صدا سے تال اور سم روشن

جو نورِ شباب پھُوٹ پڑنے کو ہے

بھیگی ہوئی ساری سے ہے کم کم روشن

زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹاؤں کا خیال

مطلع ہیں اُمید و شوق کا گورے گال

سنگم پہ، ہجومِ گلرخاں ہے ایسے

جس طرح شبِ وصل ستاروں کا ہو جال

بکھری ہوئی زلفوں میں گُلِ تر کی مہک

بہکی ہوئی آنکھوں میں ستاروں کی چمک

احساسِ شباب سے دھڑکتا ہوا دل

بھیگی ہوئی ساری میں شراروں کی لپک

مہندی رچے ہاتھ سُرخ چُوڑے کی کھنک

ماتھے پہ حیا کے کِھلتے پھُولوں کی دمک

گٹھ جوڑا کئے کھڑی ہے گوری جل میں

کہتی ہے رہے سُہاگ ہوں میں جب تک

شفّاف فضائیں گنگناتی لہریں

انگڈائیاں لیتی وہ کنول کی شاخیں

اک خاص حیا کے ساتھ رس کی پُتلی

اُتری ہے نہانے پاک سنگم جل میں

پلکوں کے طویل اور بوجھل سائے

نینوں کے دئیوں سے نور ہستی پائے

وہ نرم بدن کا لمس وہ حُسنِ شباب

سنگم کی روانیوں کو نیند آ جآئے

بارش ہے کہ ہوتی ہی چلی جاتی ہے

حسرت دیدار کی رہی جاتی ہے

اے ساقئ مست میری جانب بھی بڑھا

وہ آگ جو پیالوں میں پی جاتی ہے

مستی سی فضا میں چھا گئی ہو جیسے

لَو شمع کی تھرتھرا گئی ہو جیسے

تکتے ہوئے راستہ کسی مہ رُو کا

دیوانے کو نیند آ گئی ہو جیسے

گردوں پہ گھٹا تُلی ہوئی ہے اب تک

نشّے میں فضا گھُلی ہوئی ہے اب تک

شب ختم ہوئی حُسن کے شانوں پہ مگر

زلفوں کی گِرہ کھُلی ہوئی ہے اب تک

دھوکا ہے، فریب ہے، یہ ہستی کیا ہے

بیگانگی ہوش ہے مستی کیا ہے

"ہے" اور "نہیں" کی کشمکش ہے ابدی

انسان کی وہم پرستی کیا ہے

اپنے ہیں پرائے دوستی دھوکا ہے

ہر سر میں یہی جنوں، یہی سودا ہے

مزہب ہی وہ کیا، جس کی ہو ایسی تعلیم

انسان کو انسان سے ڈر لگتا ہے

مُرجھانے کو گلشن میں کلی کھلتی ہے

کھونے کو سمندر سے ندی ملتی ہے

روتا ہوں تو ہوتی ہے شگفتہ خاطر

ہنستا ہوں تو کائناتِ دل ہلتی ہے

آزاد ہوئے تھے کہ جنوں نے گھیرا

ڈالا غم و اندوہ نے ہر سو ڈیرا

تہذیب کو قربان کیا مزہب پر

کچھ اس میں مِرا قصور ہے کچھ تیرا

ہر سمت ہے موت اپنے پر پھیلائے

بڑھتے چلے جاتے ہیں ڈرانے سائے

کیا زیست کی قدر، وہ سمے آ پہنچا

جب آنکھ میں فطرت کی بھی آنسو آئے

لاشوں کی سڑاند، جلتے ڈھانچوں کا دھواں

سہمے ہوئے سینوں میں گھُٹی آہ و فغاں

او منتظرِ حشر قیامت ہے یہی

پانی سے زیادہ خونِ انساں ارزاں

پھیلا کے ترے حضور باہیں یارب

لیتا ہے مقّدر کی پناہیں یارب

انسان ابھی تک ہے جہالت کا شکار

دے اسکو بصیرت کی نگاہیں یارب

اب مزہب و ملّت کا خدا ختم ہوا

بے چارہ ضرورت کا خدا ختم ہوا

دیتا تھا جو انسان کو جنّت کا فریب

وہ دَورِ جہالت کا خدا ختم ہوا

مل جائے اگر خدا مجھے تو پوچھوں

رندوں کے خلاف ہے ترا زاہد کیوں

دوزخ بھی ترا ہے اورجنّت بھی تری

چاہوں میں کسے اور نہ کس کو چاہوں

بستی سے تعلق نہ رکھو، کیا معنی
ہستی سے تعلق نہ رکھو، کیا معنی
بادے کی تلاش میں رہو سرگرداں
مستی سے تعلق نہ رکھو، کیا معنی

محرومِ سرورِ جام ہونا تھا تجھے
اک ہستئ نا تمام ہونا تھا تجھے
فطرت بھی ستم ظریف ہے اے زاہد
حوروں کا مگر غلام ہونا تھا تجھے

آفتاب سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے
ظُلمات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے
گردش میں زمیں و آسماں ہیں پیہم
دن رات سے نہیں ہیں ڈرنے والے

پژمردہ گلوں سے اپنا دامن بھر لوں
بلبل کی حسیں موت کا ماتم کر لوں
میں دَورِ بہار کو تو کر لوں رخصت
پھر دَورِ خزاں کو سر آنکھوں پر لوں

زندگی کیا ہے، کوئی کیا سمجھے

آگہی کیا ہے، کوئی کیا سمجھے

آدمی جب نظر نہیں آتا

آدمی کیا ہے، کوئی کیا سمجھے

ساقیا مجھ کو ساغرِ مے دے

جس کی قیمت نہیں ہے وہ شے دے

بدلیاں گِھر کر آئی ہیں سرِ کوہ

تیری آنکھوں میں جو بھری ہے، دے

چاندنی رات دامنِ دریا

ڈوب کر پھر اُبھار کشتی کا

اور کشتی میں وہ ہیں میرے ساتھ

سوچتا ہوں کہ آج کیا ہوگا

شبِ غم پُر اُمید ہوتی ہے

دل تڑپتا ہے آنکھ روتی ہے

تارے مجھ سے کلام کرتے ہیں

چاندنی میرے ساتھ سوتی ہے

بے خودی میں اسیر رہتا ہوں
غم کو شادی سمجھ کے سہتا ہوں
لوگ جس کو فراق کہتے ہیں
میں اُسی کو وصال کہتا ہوں

انجم و ماہ کہاں تک دیکھوں
اثرِ آہ کہاں تک دیکھوں
کب تک آؤ گے یہ معلوم تو ہو
اس طرح راہ کہاں تک دیکھوں

سورج کو نکلتے ہوئے میں نے دیکھا
شعلوں کو اُبلتے ہوئے میں نے دیکھا
پھُولوں کے دمکتے ہوئے رخساروں پر
شبنم کو مچلتے ہوئے میں نے دیکھا

پھُولوں کو مہکتے ہوئے پایا میں نے
بلبل کو چہکتے ہوئے پایا میں نے
جب آنکھ کھُلی تو سوزِ اُلفت میں ضیا
سینوں کو دہکتے ہوئے پایا میں نے

ہر آنکھ ہے مدہوش،   الہیٰ توبہ

ہر قلب ہے مینوش،   الہیٰ توبہ

سمجھے کوئی کس طرح، یہ دُنیا کیا ہے

ہر ذرّہ ہے خاموش،   الہیٰ توبہ

میری آنکھوں کا نور چھین لیا

میرے دل کا سرور چھین لیا

بہت اچھا کیا فرشتۂ موت

آدمی کا غرور چھین لیا

چاند اب بھی طُلوع ہوتا ہے

دل میں رومانِ غم سموتا ہے

تُو نہیں تو بغیر تیرے یہاں

چین کی نیند کون سوتا ہے

پھُول بننے سے پیشتر جو کلی

تابِ ہستی نہ لا کے مُرجھائی

وہ بھی گلشن کی خاکِ رنگیں پر

اپنا ننھا نشان چھوڑ گئی

کنجِ خلوت میں نرم پتّوں سے

چاندنی یوں نِکھر کے آتی ہے

جیسے سمٹی ہوئی عروسِ نو

سر سے پا تک سنور کے آتی ہے

چاندنی رات کتنی دل کش ہے

گنگناتے ہیں آسماں پہ نجوم

جیسے آنچل سے حُسن چھنتا ہو

جیسے خوابوں کا قصّۂ منظوم

پُر سکون و خموش لمحوں میں

یاد اب بھی کسی کی آتی ہے

جیسے پُر ہول تیرہ راتوں میں

سنسنی دل میں تیر جاتی ہے

چاندنی میں دُھلی ہوئی دُنیا

ایسی ہے جیسے اک عجیب خیال

جیسے گوشے میں ذہنِ شاعر کے

ایک نادیدہ شکل کے خد و خال

ظلمتوں کی گھٹا، یہ زلفِ سیاہ

شانۂ حُسن پر پریشاں ہے

یا جوانی کی مست راتوں کی

ذہنِ دَوراں میں یاد رقصاں ہے

منزلیں ہیں ابھی تو اور بہت

ایک منزل کو پا لیا بھی تو کیا

دل میں ہے درد کی کسک باقی

تجھ کو اپنا بنا لیا بھی تو کیا

بھُوک جہد وعمل کا اک پیغام

بھُوک نعمت ہے آدمی کے لئے

مٹ گئی یہ تو مٹ گئی دُنیا

بھُوک زندہ ہے آدمی کے لئے

سوچتا ہوں کہ قسمتِ انساں

بے بسی اور بندگی کیوں ہے؟

شوق و اُمید کے تللاطم میں

موت انجامِ زندگی کیوں ہے؟

ایک الہڑ دیہاتی لڑکی

پٹواری کو باپ بنا کر

صاحب کی باہوں میں پہنچی

لوٹی عزّت لاج گواں کر

جدھر بھی موڑ دے رخ وقت کی رفتار بر حق ہے

یہاں بھیڑیں ہی بھیڑیں ہیں، لکیری کی فقیری ہے

مری آوارگی دراصل ہے پیغامِ آزادی

کہ پابندی اصولوں کی بہ اندازِ اسیری ہے

چمکتا ریشمی ملبوس یا کھدّر کا پیراہن

بہانہ چاہئے کوئی مجھے تن ڈھانپنا تو ہے

اٹھانا ہی پڑیگا، دھوپ ہو طوفانِ باراں ہو

یہ بارِ زیست میری تبعِ نازک پر گراں گو ہے

ہزاروں سال سے انساں اسیرِ ہستی ہے

میں آج کیوں نہ طلسمِ جہاں کو توڑ ہی دوں

اجل کو تابع فرماں مجھے بنانا ہے

سڑی گلی ہوئی لاشوں کو اب جھنجھوڑ ہی دوں

سوزِ دوام

کلی جو صبح کے دامن میں آنکھ ملتی ہے

وہ رنگ شامِ سمن زار کا بدلتی ہے

وہ اک امید جو آغوشِ دل میں پلتی ہے

حیات اُسی سے نئی کروٹیں بدلتی ہے

رُبابِ روح کے تاروں پہ چھیڑ دو نغمے

چراغِ بادہ بجھا دو کہ رات ڈھلتی ہے

یہ رازِ عشق نہ پروانہ پا سکا جل کر

کہ شمع شام سے کیوں تا سحر پگھلتی ہے

حیاتِ تازہ کے نغموں سے گونجتی ہے فضا

نئی اُمنگ نئی کروٹیں بدلتی ہے

یہ سوزِ عشق کی پیہم نوازشیں ہی تو ہیں

پڑی تھی برف جو احساس پر پگھلتی ہےمے

میں شاعرانہ لطافت سے ہمکنار رہوں

عمل کے سانچے میں جب تک حیات ڈھلتی ہے

فریب کھا نہیں سکتے سرورِ بادہ کا

وہ اہلِ دل جنہیں تیری نگاہ چھلتی ہے

ہنوز دیدۂ ساحل ہے منتظر اُس کا

جو ناؤ موجۂ طوفاں میں بہہ نکلتی ہے

سکوتِ یاس کے لب پر ہے نغمۂ اُمید

کرن سحر کی شبِ تار ہی میں پلتی ہے

سکوں پذیر بہت روز سے ہے جانِ ضیا

نقاب رخ سے الٹ دو نظر سنبھلتی ہے

انتظارِ دوست کا غم کھائیں کیا

ہم فریبِ آرزو میں آئیں کیا

چٹکیاں لیتی ہے دل میں یادِ یار

اشک اپنی آنکھ میں بھر لائیں کیا

دن وہی ہیں اور راتیں بھی وہی

ہم دلِ مایوس کو بہلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غم کیا چیز ہے

خود نہیں سمجھے اُنھیں سمجھائیں کیا

شکریہ تُو نے الٹ تو دی نقاب

تیرے دیوانوں کے سر جھُک جائیں کیا

جب مشیّت ہے خلافِ آرزو

حوصلے انسان کے کام آئیں کیا

تابِ ارضِ مدعا ہم کو نہیں

دیکھ کر خاموش، وہ فرمائیں کیا

زندگی جن کی ہے شعلوں کی لپک

وہ عذابِ موت سے گھبرائیں کیا

اے ضیا آغازِ وحشت ہے ہنوز

ہم خدا کا نام لب پر لائیں کیا

تم چلے آئے تو ساری بے کلی جاتی رہی

زندگی میں تھی جو یکگونہ کمی جاتی رہی

دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی جس کو دیکھ کر

سرمگیں آنکھوں کی وہ جادُوگری جاتی رہی

اُن سے ہم اور ہم سے وہ کچھ اس طرح گھُل مل گئے

دو ملاقاتوں میں سب بیگانگی جاتی رہی

دل لگاتے ہی ہوئے رخصت قرار و صبر و ہوش

جو میّسر تھی کبھی آسودگی جاتی رہی

اُن کے جلووں میں کچھ ایسے کھو گئے ہوش و حواس

عاشقی میں فکرِ صبح و شام بھی جاتی رہی

خارِ عشرت میں اُلجھ کر دامنِ دل رہ گیا

تھی جو لذّت اضطرابِ روح کی جاتی رہی

وہ تو رخصت ہو گئے، چھا کر دماغ و قلب پر

یاد ان کی دم بدم آتی رہی، جاتی رہی

رنگ لے آئی وفا کوشی مری انجامِ کار

مجھ سے اُن کی بے نیازی بے رُخی جاتی رہی

دل میں روشن شمعِ الفت جب سے کی ہم نے ضیا

خود نُمائی، خدروی، خود پروری جاتی رہی

بے خودی و ہوش میں امتیاز ہے تو کیا

راہِ عشق میں نشیب ہے، فراز ہے تو کیا

انتظارِ دوست پھر انتظارِ دوست ہے

آس انتظار میں چارہ ساز ہے تو کیا

عشق ہے وفا پرست اور اپنی دھُن میں مست

حُسن اُسکے حال سے بے نیاز ہے تو کیا

زیست کا غلام ہے، موت کا شکار ہے

رندِ مست ہے تو کیا، پاک باز ہے تو کیا

عشق پھر بھی عشق ہے حُسن کے حضور میں

سر فگندہ ہے تو کیا، سر فراز ہے تو کیا

میں نیاز مند ہوں، میرا غم ہے جاوداں

بے نیازیوں پہ گر اس کو ناز ہے تو کیا

دل کا حال لب پر آئے یا نہ آئےاے ضیا

کھُل ہی جائے گا، اگر آج راز ہے تو کیا

چلتے چلتے جا پہنچینگے ہم اک دن اپنی منزل پر

جب تک شوقِ بے حد ہے، ہم کو ہے بھروسا اپنے دل پر

سوئی اُمنگیں جاگ اُٹھیں، کلیاں مُسکائیں، پھُول کِھلے

صبحِ محبّت نے کچھ ایسا جادُو پھُونکا اہلِ دل پر

جس نے خدا و شیطاں میں بھی پُھوٹ کی بنیادیں رکھ دیں

سر دُھنتے رہتے ہیں فرشتے اُس ترکیبِ آب و گِل پر

تعمیر و تخریب کے سائے گہرے ہوتے جاتے ہیں پھر

ڈُوب رہا ہوں میں طوفانوں میں اور چراغاں ہے ساحل پر

سوزِ محبّت کی چنگاری جاگ اُٹھی ہے ہر دل میں

کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے ساری محفل پر

دونوں جہاں ایسے ٹکرآئے، جینا مرنا ایک ہوا

وہ جو گئے تو آئی قیامت، یاس نے قابو پایا دل پر

صدیوں تک تیری باتوں میں آ کے ہوئے گُمراہ ضیا

ہم وہ مسافر ہیں کہ پہنچ کر ہی دم لیں گے اب منزل پر

دھڑکتا ہے لے کر وفا کا سہارا

وہ دل جس کو غافل نگاہوں نے مارا

وہ چمکا اُفق پر سحر کا ستارا

سلام اے شبِ تیرہ بختی ہمارا

کہاں کا سفینہ کہاں کا کنارا

تہِ موجِ گرداب ہے گھر ہمارا

حسیں انکھڑیوں سے محبّت نے جھانکا

زبانِ خاموشی سے دل کو پکارا

محبّت کو تم ہی کہو میں کہوں کیا

اُسی نے ڈبویا اُسی نے اُبھارا

مجھے اُس خدا پر بھروسہ ہے جس نے

بنایا مٹایا، بگاڑا سنوارا

بگڑنے میں تھا بات بننے کا پہلو

نہ سمجھا مگر میں ہی اُن کا اشارا

کہیں ڈوب جائے نہ دل کا سفینہ

بہت تیز رو ہے جوانی کا دھارا

جو کھویا وہ پا یا ، جو پا یا وہ کھویا

جو ہارا وہ جیتا، جو جیتا وہ ہارا

ترا شکریہ اے فریبِ محبّت

تمنّاؤں میں مجھ کو الجھا کے مارا

مذاقِ غزل نا مکمّل ہے اس کا

ضیا کو بھی اک جرعۂ غم خدارا

رات جاتی ہے سحر آتی ہے

موڑ پر زیست نظر آتی ہے

بارہا روند چُکے ہم جِسکو

پھر وہی راہ گزر آتی ہے

میری خلوت میں ترے حُسن کی یاد

آ نہ سکتی تھی مگر آتی ہے

تیری صورت میں اب اے دوست مجھے

اپنی صورت ہی نظر آتی ہے

غمِ عشرت ہو کہ ہو عشرتِ غم

آنکھ ہر بات پہ بھر آتی ہے

رات کے سائے سمیٹو پھینکو

لیتی انگڑائی سحر آتی ہے

موت کے روپ میں ہر بار ضیا

نئی ہستی کی خبر آتی ہے

دنیا پے اعتبار نہ تھا دیکھتے رہے

کچھ زور و اختیار نہ تھا دیکھتے رہے

جاتی ہوئی بہار کی دلچسپیاں نہ پوچھ

پھُولوں پہ گو نکھار نہ تھا دیکھتے رہے

حالِ دلِ تباہ نہ آیا زبان پر

کوئی بھی غمگسار نہ تھا دیکھتے رہے

آ نا نہ تھا اُنھیں باہمہ وعدہ و قرار

پا یانِ انتظار نہ تھا دیکھتے رہے

شبنم کے اشک، گُل کی ہنسی، رقصِ انقلاب

منظر یہ خوشگوار نہ تھا دیکھتے رہے

پروانہ جل کے راکھ ہوا شعلۂ حیات

مغموم و سوگوار نہ تھا دیکھتے رہے

وہ سامنے تھے پھر بھی نہ آیا یقینِ دید

آنکھوں پہ اعتبار نہ تھا دیکھتے رہے

اک شمع ہی پگھلتی رہی تا دمِ سحر

اور کوئی اشک بار نہ تھا دیکھتے رہے

کہہ کر غزل تو لائے تھے ہم بھی ضیا مگر

اپنا کہیں شمار نہ تھا دیکھتے رہے

روشن دن، سُندر راتیں ہیں
یہ میرے دل کی باتیں ہیں

تم پریت نبھاؤ تو جانیں
ورنہ باتیں ہی باتیں ہیں

مہتاب کی سیمیں کرنوں سے
نکہری ہوئی اپنی راتیں ہیں

سلجھا نہ سکے گی عقل اِنہیں
اُلجھی ہوئی دل کی باتیں ہیں

اب حیراں حیراں آنکھوں میں
کھوئی کھوئی برساتیں ہیں

مست آنکھوں کا اُن کی عالم
مدھ میں ڈوبی برساتیں ہیں

کِسنے دُکھتی رگ چھیڑی ضیا
کیوں غمگیں غمگیں باتیں ہیں

سانچے میں جنوں کے دل کو ڈھالیں ہوش اور خرد کا بھید پالیں

رخ سے جو نقاب وہ اُٹھالیں ہم ذوقِ نظر کو آزمالیں

اے عقل نہ دے فریب ہم کو کھوئے ہوئے ہیں کہ اُنکو پالیں

ہستی اک راگ ہے ادھُورا اس کی نہ گتیں ہیں نہ تالیں

پنہاں وہ یہیں کہیں تو ہوں گے ہر شئے کو بغور دیکھیں بھالیں

ہم چلتے ہیں تیرے ساتھ اے موت انجامِ حیات تو سُنالیں

ہر سمت ہے قہقہوں کی جھنکار کیا ہم بھی ذرا سا مُسکرالیں

جی میں ہے ضیا کہ اپنے دل کو

بیگانۂ آرزو بنالیں

کون چھیڑے گا ضیا سازِ چمن میرے بعد

کس کو تڑپایگی پھر یادِ وطن میرے بعد

تم نے اب خار سمجھ کر تو نکالا ہے مجھے

اور جو محسوس ہوئی تازہ چُبھن میرے بعد

لے کر آئے ہیں مری موت کا پیغام مگر

سینہ کوٹیں گےغم و رنج و محن میرے بعد

چاندنی رقص کرے گی یونہی میرے پیچھے

مُسکرائے گا اسی طرح چمن میرے بعد

انقلابات کا آغاز ہے میرا انجام

خود بدل جائے گی ہر رسمِ کہن میرے بعد

جانتا ہوں مری نظموں کی، مری غزلوں کی

قدر پہچانیں گے یارانِ سخن میرے بعد

ظلمتِ شب کو مجھ سے تھی عداوت شاید

سینۂ شرق سے پھُوٹی ہے کرن میرے بعد

جزبۂ شوقِ شہادت بھی کہیں مٹتا ہے

ہے وہی سلسلۂ دار و رسن میرے بعد

مطمئین کوئی نظامِ چمنستاں سے نہیں

اے ضیا لالہ و گل مسرورِ سمن میرے بعد

تاروں کو درخشاں دیکھ چُکے، ذرّوں کو فروزاں دیکھیں گے

اے سوزِ محبّت ہم تجھ کو، ہر شے میں نُمایاں دیکھیں گے

جب کالی گھٹاؤں میں گردوں، چُھپ جائگا، کھو جائگا

ہم حُسن کے شانوں پر ناگن زلفوں کو پریشاں دیکھیں گے

ہم پست و بلندِ گلشن کا نظّارہ بھی کر سکتے ہیں

پھُولوں کو خنداں دیکھیں گے، شبنم کو گریاں دیکھیں گے

اُلفت کا اثر کچھ ہونے دو، ناز اور نیاز میں فرق نہیں

وہ ہم کو پریشاں پائنگے، ہم اُن کو پریشاں دیکھیں گے

امواج پہ لرزہ طاری ہے، گرداب میں ہلچل پیدا ہے

ساحل کی تمنّا کون کرے اب زورِ طوفاں دیکھیں گے

آزاد فضاؤں میں ہونگے ہم بھی محوِ پرواز اک دن

اُجڑا ہوا زنداں دیکھیں گے، آباد گُلستاں دیکھیں گے

تاروں کی چمک، کلیوں کی چٹک، موجوں کا ترنم، حُسنِ جواں

ہم تجھ کو ضیا اس عالم میں مدہوش و غزاخواں دیکھیں گے

خوبصورت فریب شادی ہے
فطرتِ غم ہی مُسکرا دی ہے

ہم نے چھیڑا ہے جب بھی سازِ جنوں
تیرگی شب کی گنگنا دی ہے

عالمِ وجد و بے خودی میں تجھے
ہم نے آواز بار ہا دی ہے

اے زمیں ہم نے تیرے قدموں پر
آسماں کی جبیں جُھکا دی ہے

ہم نے طوفانِ شور و شیون سے
کشتیِ جبر ڈگمگا دی ہے

کوششِ امن تو بجا ہے مگر
آدمی فطرتاً فسادی ہے

اے خدا تو نے اپنے بندوں کو
زندگی کی کڑی سزا دی ہے

اے ضیا قلبِ عشق پرور میں
حُسن نے آگ سی لگا دی ہے

جنّت کھو کر دنیا پائی
دیکھی انساں کی چتُرائی

مدھ برساتی بدلی آئی
دُنیا نے لی مست انگڑائی

حُسن کی آنکھوں میں نشّہ ہے
جیسے سمندر کی گہرائی

غم کی دولت پا کر خوش ہیں
عشق و محبّت کے سودائی

بیٹھ گئے منزل کو پا کر
ہم نے جہاں بھی ٹھوکر کھائی

دل ہے غم سے مُضطر مُضطر
آنکھیں پتھرائی پتھرائی

کلجُگ آیا، کلجُگ آیا
رام دُہائی، رام دُہائی

گھُونگھٹ سے یوں اُسنے جھانکا
کوئی کلی جیسے مُسکائی

آگ سے کھیلا، لپکا، بہکا
پروانے نے جان گنوائی

اس نے کالی زلفیں کھولیں
امبر پر بدلی لہرائی

ہجر کی رات کٹے گی کیونکر
شام ہوئی، دُنیا سنولائی

قلبِ ضیا میں موج افزا ہے
صبحِ محبّت کی انگدائی

تیرے بغیر اک گھڑی مجھ کو نہیں قرار دیکھ

بیٹھا ہوں رہگزار میں خستۂ انتظار دیکھ

اے دلِ درد آشنا اُجڑی ہوئی بہار دیکھ

باغِ خزاں شکار میں، پھول نہیں تو خار دیکھ

تو نے کہا تھا زندگی صرف فریبِ ہوش ہے

مجھ کو جہانِ زیست پر آگیا اعتبار دیکھ

شمع سرِ مزار بھی اب تو بجھی بجھی سی ہے

بادہ کشِ حیات کا اُترا ہوا خمار دیکھ

کیا ہے مآلِ ذوقِ عشق، حُسن کی کائنات میں

اے دلِ بے قرار سوچ، دیدۂ اشکبار دیکھ

لب پر شکایتِ ستم، دل میں ہے آرزوئے غم

موت سے بھی عزیز ہے ہستیِ مستعاردیکھ

روح بھی کر چُکا ہے یہ اپنی سپردِ اہرمن

یوں تو ہے ذہنِ آدمی اب بھی خدا شکار دیکھ

تیری حیات گوش و ہوش، میری حیات خامشی

اے مرے رازدار سُن، اے مرے غمگسار دیکھ

تیرا سرور عارضی، میرا سرور مستقل

تجھ پہ جہاں ہے خندہ زن فطرتِ بادہ خوار دیکھ

گلکدۂ حیات میں آج خزاں کا راج ہے

اُس کی طرف بھی گاہ گاہ فتنہ گرِ بہار دیکھ

مجلسِ ششجہات میں ہوں میں اسیر یا کہ تُو

اپنے کئے پہ ہم میں کون آج ہے شرمسار دیکھ

تیرے بغیر زندگی تشنگیِ دوام ہے

روح بھی بے قرار ہے، دل بھی ہے سوگوار دیکھ

آہی گیا فریب میں حُسن کے تُو بھی اے ضیا

سجدے میں ہے سرِ نیاز، اپنا مآلِ کار دیکھ

رات کو جب تارے اپنے روشن گیت سنائیں گے

ہم بھی دل کی گرمی سے دنیا کو گرمائیں گے

پھُول ذرا کھلجانے دے صحنِ گلشن میں ساقی

اک پیمانہ چیز ہے کیا، مے خانہ پی جائیں گے

ان کے دیوانوں کا ہے کوچے کوچے میں چرچا

وہ اپنے دیوانوں کو کب سمجھانے آئیں گے

ساقی کو بیدار کرو، میخانہ کیوں سُونا ہے

بادل تو گھر آئے ہیں، میکش بھی آجائیں گے

اُن سے کہنے جاتے ہیں بیتابی اپنے دل کی

وہ رودادِ غم سُن کر دیکھیں کیا فرمائیں گے

پھُولو تم محفوظ رہو بادِ خزاں کے جھونکوں سے

اب ہم رخصت ہوتے ہیں، اک دن پھر بھی آئیں گے

ساون کی برساتوں میں تیرا ملہاریں گانا

یہ لمحے یاد آئیں گے، یاد آکر تڑپائیں گے

وہ سوتے ہیں سونے دو، وا ہے آغوشِ اُلفت

کہتے کہتے افسانہ ہم بھی تو سو جائیں گے

باقی اک رہ جائے گا نقش ضیائے اُلفت کا

دنیا بھی مٹ جائے گی اور ہم بھی مٹ جائیں گے

کبھی وہ مُسکرا دیتے ہیں یکدم یوں بھی ہوتا ہے

کبھی وہ مجھ سے ہو جاتے ہیں برہم یوں بھی ہوتا ہے

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے

نظامِ کائناتِ عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے

میں بند آنکھوں سے رازِ قلبِ گیتی دیکھ لیتا ہوں

مرتّب بیخودی کا ایک عالم یوں بھی ہوتا ہے

فسانہ بن کے رہ جاتی ہے آخر دل کی بیتابی

فروغِ شمع حُسن و عشق مدھم یوں بھی ہوتا ہے

امیدیں جاں بلب کچلی ہوئی دل کی تمنّائیں

میں ہنستا ہوں کہ اک اندازِ ماتم یوں بھی ہوتا ہے

ٹپکتا ہے جو آنکھوں سے ترے دردِ جدائی کا

چمکتا ہے وہ آنسو بن کے شبنم یوں بھی ہوتا ہے

ضیا میں چھیڑ دیتا ہوں ترانہ کیف و مستی کا

شروعِ انقلابِ بزمِ ماتم یوں بھی ہوتا ہے

کائناتِ زیست میں انقلاب آگیا
شورشیں لئے ہوئے کیا شباب آ گیا

دلربا حیاتِ نو ہر طرف ہے نغمہ ریز
پھر مسّرتوں کا دَورِ کامیاب آ گیا

شب کی ظلمتوں کا ذکر ساقیِ حسیں نہ چھیڑ
روشنی بکھیرتا آفتاب آ گیا

چاندنی میں دھُل گئی کائناتِ رنگ و بُو
گلشنِ حیات میں ما ہتاب آ گیا

پھر نہ کیوں مچل اُٹھیں خفیہ ولولے ضیا
حُسن کو حضورِ عشق پھر حجاب آ گیا

زندہ دلوں کی جیب میں وسعتِ کائنات ہے
کون و مکاں پہ حکمراں میں ہوں میری حیات ہے

لے کے چراغِ بیخودی صبحِ نشاط کر تلاش
دسترسِ خودی سے دُور حُسنِ ازل کی ذات ہے

چھیڑ ترانۂ اُمید، قلب و نظر جھنجھوڑ دے
کھوئی ہوئی سی یاس میں، محفلِ ششجہات ہے

غم سے نجات کیا ملے غم جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے

نورِ حیات تجھ سے ہے، کیفِ حیات تجھ سے ہے
دن ہے نہ دن ترے بغیر اور نہ رات رات ہے

درسِ جنوں ہے گمرہی، خضر کی بات پر نہ جا
موت قیام کا ہے نام اور سفر حیات ہے

چاند نے جگمگا دیا، شمع نے گنگنا دیا
عشق نہیں تو زندگی ایک اندھیری رات ہے

حُسن فریبِ ذوقِ دید، عشق طلسمِ سوزِ قلب
حُسن نہیں ہے پائدار، عشق بھی بے شبات ہے

گوشۂ ذہن میں ترے میرا کہیں نشاں نہیں
یاد ہے تُو مگر مجھے یہ بھی عجیب بات ہے

شادی و غم سے اے ضیا کوئی اثر نہ لیجئیے
نُور فشاں ہے دن کہیں اور کہیں کالی رات ہے

اُن کو بنایا من ادھیکاری

میں نے جیتی بازی ہاری

پریم کی بازی میں نے اکثر

ہار کے جیتی، جیت کے ہاری

عشق میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے

پھر بھی دُنیا ہے بیوپاری

اُن کو نفرت مجھ کو اُلفت

مشکل آن پڑی ہے بھاری

جانِ بہار آ پہنچا شاید

کیفِ جنوں ہے باغ پہ طاری

دروازے سے ہی لوٹ آیا

اُف رے احساسِ خود داری

اُمڑا ہوا ہے دل میں سمندر

اشکوں کا پانی ہے کھاری

میخانہ بردوش گھٹا ہے

مستی کی ندّی ہے جاری

جسکو ضیا دیکھو ہے شاعر

بڑھتی جاتی ہے بیکاری

اک قیامت مری حیات بنی گرمئیِ بزمِ کائنات بنی

آشنائے سکوں تھی لا علمی آگہی فکرِ شش جہت بنی

موت نے جب فنا کی دی تعلیم وہ گھڑی مژدۂ حیات بنی

موسمِ بر شگال خوب آیا اک دلہن ساری کائنات بنی

دامنِ ضبط میں سکوں پا یا شور و شیون سے جب نہ بات بنی

پھر وہی رات صبح بنتی ہے جو سحر شام ہوکے رات بنی

جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا جب ارادوں کی کائنات بنی

کس زمیں میں غزل کہی ہے ضیا

کہ بنائے سے بھی نہ بات بنی

نہیں شام و سحر کے درمیاں دل شاد کام اپنا

اسی کا نام دنیا ہے تو دنیا کو سلام اپنا

زباں پر اُنکی آ جاتا ہے بھُولے سے جو نام اپنا

سمجھتا ہوں کہ میں نے پا لیا آخر مقام اپنا

مجھے معلوم ہے میخانہ اپنا ہے نہ جام اپنا

خدا کا شکر ہے، اک جرعۂ غم ہے دوام اپنا

وقارِ ضبط کیسا ہمّتِ ایذا طلب کیسی

وفاؤں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے ذوقِ خام اپنا

کبھی مندر کبھی مسجد میں مصروفِ پرستش ہے

نہیں پایا ابھی تک تیرے بندے نے مقام اپنا

فضاؤں میں گھٹاؤں کو اُمڑ کر چھا تو جانے دو

پھر اپنا میکدہ ہے اپنا ساقی اور جام اپنا

اُبھرنے دو ادب کو اے ضیا ظلماتِ پستی سے

ستارہ بن کے چمکے گا یہی روشن کلام اپنا

ہر بہار و ہر خزاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

صبح و شامِ گلستاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

گِھر کے آتا ہے، برستا ہے، چلا جاتا ہے ابر

اور پہروں آسماں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

واقفِ آغاز بھی ہوں، محرمِ انجام بھی

بجلیوں میں آشیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

میری پروازِ تخیّل ہے ابھی وسعت طلب

تنگئی کون و مکاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

راہِ منزل اور منزل ایک دھوکا اک فریب

اپنی سعئ رایگاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

اُف مری مجبوریاں، محرومیاں، لاچاریاں

حادثاتِ ناگہاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

اے ضیا تیری متاعِ فکر کا قائل نہیں

حُسنِ اندازِ بیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

گیت تیرے حُسن کے گاتا ہوں میں　　　　چاند کی کرنوں کو تڑپاتا ہوں میں

منزلِ مقصود ہوتی ہے قریب　　　　راستے سے جب بھٹک جاتا ہوں میں

دے رہا ہوں رات دن غم کو فریب　　　　دل کو اُمیدوں سے بہلاتا ہوں میں

میرے استقبال کو ساقی اُٹھے　　　　میکدے میں جھُومتا آتا ہوں میں

اِسکے دل میں بھی ہے داغِ سوز و عشق　　　　چاند کو ہم داستاں پاتا ہوں میں

چھیڑتی ہے صبح جب سازِ حیات　　　　وجد میں آکر غزل گاتا ہوں میں

خود تڑپتا ہوں تڑپ کر اے ضیا

اہلِ محفل کو بھی تڑپاتا ہوں میں

بے کراں زندگی کی راہوں پر ہے رواں کاروانِ شام و سحر

عشق ہے اضطرابِ قلب و جگر حُسن ہے اعتبارِ ذوقِ نظر

بے نیازی اُنھیں مبارک ہو میں ہوں نا زاں نیازمندی پر

دَورِ مے روک، چاہتا ہوں میں تنصرہ حادثاتِ عالم پر

حُسن بکھرا ہوا ہے ہر جانب مژدہ اے ذوقِ چشمِ جلوہ نگر

راہ کے پیچ و خم وہ کیا جانے جس نے کھائی نہیں کبھی ٹھوکر

بحرِ جذبات میں تلاطم ہے شبِ مہتاب کا حسیں منظر

جام گردش میں ہے ضیا جب تک

گردشِ آسماں پہ غور نہ کر

بسے دل میں آنکھوں سے مستورہو کر　　　قریب آ گئےاور بھی دُور ہو کر

ترا بندہ اے خالقِ ہوش و مستی　　　ترا نام لیتا ہے مجبور ہو کر

سکوں ذہن و خاطر کا بھی تُو نے کھویا

ضیاء کیا ملا تجھ کو مشہور ہو کر

روایاتِ ماضی فراموش کر دے

حکایاتِ فردا سُناتا چلا جا

نئی صبح

بہت جا چُکی ہے شبِ تیرہ ساماں

اُجالوں کے سائے اُفق پر ہیں رقصاں

وہ تارا، یہی تو ہے تارا سحر کا

یقیناً نہیں اس میں دھوکا نظر کا

بہت سو چکا میں، بہت ہو چُکا گمُ

مجھے لوریاں اب ہواؤں نہ دو تُم

مجھے نیند کچھ راس آئی نہیں ہے

کہ راحت مرے پاس آئی نہیں ہے

بڑے ضبط سے غم اُٹھایا ہے میں نے

اندھیروں میں سب کچھ لُٹایا ہے میں نے

امیدِ طلوعِ سحر کے سہارے

حوادش کے طوفاں ہیں سر سے گزارے

مگر صبر کا جام اب بھر چُکا ہے

اُمیدوں کا جادُو اثر کر چُکا ہے

میں تخریب کی قوّتوں سے لڑوں گا

زمانے کو تعمیر کا درس دوں گا

اُٹھاؤں گا سر پر فلک کو فُغاں سے

زمیں پر گریں گے یہ محل آسماں کے

پُرانے بُتانِ حرم توڑ دوں گا

میں تہذیبِ انساں کا رُخ موڑ دوں گا

خدا کا بھرم کھول دوں گا جہاں پر

یقیں کانپ جائے گا میرے گماں پر

یہ ذرّے جو صدیوں سے روندے گئے ہیں

حقارت کی نظروں سے دیکھے گئے ہیں

نئے آفتابوں کو پھر جنم دیں گے

لُٹیروں سے پھر اپنا حق چھین لیں گے

یہ ظُلمت کی ہیبت دِلوں سے مِٹے گی

زمانے کو کروٹ بدلنی پڑے گی

نہیں دوُر اب تو نظر آ رہی ہے

اُٹھو دوستو، وہ سحر آ رہی ہے

دعا

بھیگی ہوئی فضاؤں کا دامن نچوڑ دوں

چھینٹوں سے گلستاں کو جگاؤں جھنجھوڑ دوں

آزاد ہیں ابھی مری فطرت کی وحشتیں

مجبوریوں کی آہنی کڑیوں کو توڑ دوں

بیدار میری سوئی ہوئی قوّتیں ہیں آج

رخ سیلِ حادشاتِ زمانہ کا موڑ دوں

ہوں تنگدستیوں میں بھی وہ دل کی وُسعتیں

مانگے کوئی ہزار تو اس کو کروڑ دوں

نغموں کی روشنی سے جہاں جگمگا اُٹھے

سازِ جنوں کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑ دوں

گمراہیوں میں ہے مری آزادیوں کا رقص

میں جستجوئے منزلِ مقصود چھوڑ دوں

جو آستانِ ناز پہ گر کر نہ اُٹھ سکے

میں اس سرِ نیاز کو پتھّر سے پھوڑ دوں

صدیوں سے آدمی کا گلا گھُونٹتے رہے

عفریتِ صبر و ضبط کے پنجے مروڑ دوں

سعی و عمل پہ رکھوں بِنائے حیاتِ نَو

عشرت کا رازدار بنوں، غم کو چھوڑدوں

طوفاں کو اپنے عزم کے ہاتھوں سے دوں شکست

چھوڑا ہے نا خدا کو، خدا کو بھی چھوڑ دوں

فسانہ

حسن دمسازِ غمِ عشق اگر ہو نہ سکا

میں غمِ عشق کو سینے میں دبا ہی لوں گا

اپنی نا کام خرامی کا کروں گا نہ گلہ

کھوکے خود منزلِ مقسود کو پا ہی لوں گا

حُسن آوازِ غمِ عشق اگر سُن نہ سکا

توڑ ہی دوں گا میں ہر تارِ ربابِ ہستی

اہلِ عالم کی نگاہوں سے اُتر جائے گا

گلِ مژمردہ کے مانند شبابِ ہستی

اور میں یہ بھی اگر کر نہ سکا دُنیا میں

تو مری موت پہ آنسو نہ بہانا ہمدم

یہ سمجھ لینا کہ آیا ہی نہ تھا دُنیا میں

یہ سمجھ لینا کہ تھا میں بھی فسانہ ہمدم

جاگ اے انسان

رات ختم ہو گئی   روشنی میں کھو گئی

ساحلِ نشاط تک   زندگی کی رَو گئی

کائنات جاگ اُٹھی

کلُ حیات جاگ اُٹھی

مٹ گئی تکان جاگ   جاگ اے انسان جاگ

نظم و رنگ و بُو بدل   بادہ و سبُو بدل

وقت کی پکار سُن   بے درنگ تُو بدل

آفتاب آ گیا

انقلاب آ گیا

اب ہے امتحان جاگ جاگ اے انسان جاگ

ہر دعا ہے بار یاب   ہر اُمنگ کامیاب

تازہ گیت چھیڑ دے چِھڑ گیا نیا رباب

جورِ آسماں نہیں

یاس کا نشاں نہیں

تُو تو ہے مہان جاگ جاگ اے انسان جاگ

انکسار بھی غلط اضطراب بھی غلط

شام اور صبح کا انتظار بھی غلط

ہمّت اور عزم پر

کارگاہ کی نظر

قدرِ زیست جان جاگ جاگ اے انسان جاگ

ذرّہ آفتاب ہے قطرہ موجِ آب ہے

راج ہے بہار کا   خار بھی گلاب ہے

یہ ہنسی، یہ دلکشی

دین تیرے ہوش کی

تو بنامِ نان جاگ   جاگ اے انسان جاگ

مستقبل کی طرف

تدبیر کے ہاتھوں انساں کی تقدیر بدلنے والی ہے

فنکار بدلنے والا ہے، تصویر بدلنے والی ہے

ظلمت پر لرزہ طاری ہے، وہ نُور گرجتا آتا ہے

بدلے ہوئے خوابِ ہستی کی تعبیر بدلنے والی ہے

معمار اُٹھے دل میں لیکر تخریب کا عزمِ مستقبل

کچے اونچے ایوانوں کی تعمیر بدلنے والی ہے

ذہنوں نے نئی انگڑائی لی، زنجیرِ جہالت ٹوُٹ گئی

لکھنے پڑھنے والوں کی قسم، تحریر بدلنے والی ہے

صدیوں سے پڑے جو سوتے تھے، کروٹ لیکر بیدار ہوئے

قانون ذرا ہُشیار رہے تقصیر بدلنے والی ہے

ہمّت ہر دل میں جاگ اُٹھی، کمزور بھی اب کمزور نہیں

فریاد و فُغاں و نالہ کی تاشیر بدلنے والی ہے

انساں انساں میں فرق نہیں، کب تک حق بات چُھپی رہتی

تقدیر بدلنے والوں کی تقدیر بدلنے والی ہے

حالات کے ساتھ بدلنا ہے

امیدوں کو ارمانوں کوحالات کے ساتھ بدلنا ہے

اس دھرتی کے دیوانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

ساقی کو بادہ خانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

رِندوں کو اور پیمانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

گلزار کبھی ویران ہوئے، ویرانے اب گلشن ہونگے

گلزاروں کو ویرانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

شب اپنی حد پر آ پہنچی، دِن کے آثار ہوئے پیدا

اِن شعموں کو پروانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

بدلا ہوا رنگِ ہستی ہے، وہ چاند نہیں خورشید نہیں

ماضی کے حسیں افسانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

منزل نہ رہی،رہبر نہ رہے، رہرو خود کو پہچان گئے

اِن دھرموں کو ایمانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

دُنیا نے نئی کروٹ بدلی، انسانیت پھر جاگ اٹھی

انسان نُما حیوانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

ساحل کا نشاں معلوم نہیں، کشتی منجدہار میں آ پہنچی

دل میں اُمڈے طوفانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

صدیوں کی خموشی ٹوُٹ گئی اب شورِ قیامت بر پا ہے

ننگے بھوکے انسانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

لیلیٰ کا فسانہ ختم ہوا، مجنوں کا زمانہ بیت گیا

دل بہلاتے رومانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

یہ کشمکشِ ہستی توبہ، وحشت کا تصّور بھی تو نہیں

جیبوں کو اور دامانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

نیچے روتے غمخانوں میں رَو دوڑ گئی تبدیلی کی

اونچے ہنستے ایوانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

وہ شام نہیں، وہ صبح نہیں وہ سیّد نہیں، صیّاد نہیں

اب داموں کو اور دانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

بدلی ہوئی اس دُنیا میں ضیا ہر چیز بدلنے والی ہے

اپنوں کو اور بیگانوں کو حالت کے ساتھ بدلنا ہے

فردا کے سُپنے

چلے جاؤ فردا کے رنگین سپنو   ابھی حال کی فکر میں مبتلا ہوں

ابھی دامنِ دوش چھُوٹا نہیں ہے ابھی خود کو مجبور میں دیکھتا ہوں

چلے جاؤ فردا کے رنگین سپنو تمہارا سہارا بھی میں ڈھُونڈ لوں گا

ذرا وقت کروٹ بدل لے تو پھرمیں تمہارے ہی رستے پہ گاتا چلوں گا

چلے جاؤ فردا کے رنگین سپنو تمھارے لئے راہ ہموار کر لوں

مٹا کر یہ صدیوں کی پُرہول ظلمت نکھرتے ہوئے نُور میں بن سنور لوں

چلے جاؤ فردا کے رنگین سپنو حقایق سے دو چار ہونا ہے مجھ کو

تمہارے لئے ڈُوُب کر زندگی میں غلط رفعتوں کو ڈبونا ہے مجھ کو

چلے جاؤ فردا کے رنگین سپنو کہ میں عزم پر آنچ آنے نہ دوں گا

تمہارے سنہری تصّور میں کھو کر تمنّاؤں کو گنگنانے نہ دوں گا

چلے جاؤ گے تم تو بھڑکینگے شعلے نئی قوّتوں کے سہارے اُٹھوں گا

تمہاری قسم ہے تمہارے لئے میں زمانے کے دھارے کا رخ موڑ دوں گا

بچھے ہیں مری راہ میں خار لیکن میں کانٹوں سے تعمیرِ گلشن کروں گا

فضاؤں میں جو زہر حل ہو چکا ہے   اسی زہر کے خود بھی قابل بنوں گا

چلے جاؤ فردا کے رنگین سپنو

مرے حال پر چھوڑ دو آج مجھ کو

برسات

اُڑتے ہوئے میخانے بڑھ کر رِندوں کی تمنّاؤں سے ملے

دوشیزۂ فطرت جاگ اُٹھی، سازِ عشرت کے تار ہلے

کلیاں مسکائیں پھُول کِھلے نغمے نے لی پھرانگڑائی برسات آئی

گاتی لہراتی اِٹھلاتی جنّت سے ہوائیں آنے لگیں

دل کی آغوش میں خوابیدہ فتنوں کی نیند اُڑانے لگیں

خونِ تازہ دوڑانے لگیں جذبوں کو ملی پھر برنائی برسات آئی

موجیں بپھرئں، دریا اُمڈے، سبزہ لہکا، گلشن مہکا

دُنیا نے نئی کروٹ بدلی سینہ دھڑکا چہرہ دہکا

چلتے چلتے راہی بہکا شبنم پتّوں پر لہرائی برسات آئی

مخمور فضا مدہوش ہوا، پُر کیف گھٹاؤں کے سائے

وہ رقص عروسِ مستی کا، ہر چشمِ تماشا للچائے

ایماں بھی ٹھوکر کھا جائے   عالم وحشی و سودائی برسات آئی

جگنونے شمعئں روشن کیں، روماں پرور منظر چمکے

ملہار کی روشن تانوں سے چمکیں دیواریں در چمکے

گھروالے ہنسے اور گھر چمکے   ہستی جھُومی اور لہرائی برسات آئی

ساجن پردیس سے لوٹ آیا سجنی کی اُمیدیں بر آئیں

بھُولی ہوئی یادیں بوندوں کے گیتوں میں آپ اُبھر آئیں

آشایئں اُمنگوں پر آئیں پیغام مسّرت کا لائی برسات آئی

جھُولوں پہ جواں مُسکان لئے، البیلا حُسن ہوا رقصاں

رقصاں اپنی دُنیا میں بشر، اپنی جنّت میں خدا رقصاں

اپنے شعروں میں ضیا رقصاں با صد کیف و صد رعنائی برسات آئی

سلام

تیرے صبح و شام ہیں، اے شبابِ انقلاب
ہم ترے غلام ہیں اے شبابِ انقلاب

یہ زمیں کی جنبشیں وہ فلک کی گردشیں
تیرے زیرِ دام ہیں اے شبابِ انقلاب

تیری بزمِ ناز میں، تیری جلوہ گاہ میں
عشرتیں دوام ہیں اے شبابِ انقلاب

تیری مستیوں سے ہیں ذہن و فکرہوشمند
بے نیازِ جام ہیں اے شبابِ انقلاب

یہ فضا کی ظلمتیں تیرے رنگ و نُور کی
منتظر مُدام ہیں اے شبابِ اقلاب

تیرے در پہ جھُک گئے، امتیاز مٹ گیا
ایک خاص و عام ہیں اے شبابِ انقلاب

تُو نے کائنات میں روحِ زیست پھُونک دی
تیرے کام، کام ہیں اے شبابِ انقلاب

تُونے ہم پہ کھول دی زندگی کی راہ نَو!

تجھ پہ سو سلام ہیں اے شبابِ انقلاب

ہندوستان آزاد ہوا

روشن فضاؤں کی قسم   رقصاں ہواؤں کی قسم

دلکش نواؤں کی قسم   رنگیں اداؤں کی قسم

گلزار ہے مہکا ہوا   رخسار ہے دہکا ہوا

مستی ہے آنکھوں سے عیاں   پی کر شرابِ ارغواں

مسرور ہے سارا جہاں

میرا وطن آزاد ہے، میرا وطن آباد ہے آباد ہے ہندوستاں آزاد ہے ہندوستاں

آئی سحر گاتی ہوئی   انوار برساتی ہوئی

رُوحوں کو بر ماتی ہوئی   ہستی کو مہکاتی ہوئی

سازِ طرب سے راگ اُٹھا   مدّت کا سویا جاگ اُٹھا

انگڑائی میخانے نے لی   ساقی نے پیمانے نے لی

مستی کے دیوانے نے لی

میرا وطن آزاد ہے، میرا وطن آباد ہے آباد ہے ہندوستاں آزاد ہے ہندوستاں

مُطرب نیا، نغمے نئے   ہیں ولولے دل کے نئے

قدریں نئی وعدے نئے   کانٹے نئے، غنچے نئے

ہے زیست کا چولا نیا   ہر رنگ محفل کا نیا

شاخوں کو ہِلنا آگیا   کلیوں کو کِھلنا آگیا

بلبل کو ملنا آ گیا

میرا وطن آزاد ہے، میرا وطن آباد ہے آباد ہے ہندوستاں آزاد ہے ہندوستاں

میں آج سے آزاد ہوں   محوِ طرب ہوں شاد ہوں

بیگانۂ فریاد ہوں   وقفِ مبارکباد ہوں

اونچے میناروں پر مرا   جھنڈا ہے لہرایا ہوا

بنکر نشاطِ موجِ ئے   اُٹھتی ہے دل سے ایک لَے

منزل مرے قدموں میں ہے

میرا وطن آزاد ہے، میرا وطن آباد ہے آباد ہے ہندوستاں آزاد ہے ہندوستاں

لیکن ٹھہر اے مُطربا   نغمہ ادھُورا ہے ترا

یہ جشنِ آزادی ہے کیا   کچھ پا لیا کچھ کھو دیا

ٹکڑےوطن کے ہو گئے   اپنے پرائے ہو گئے

دل درد سے معمور ہے   انساں بہت مجبور ہے

پھر بھی یہی مزکور ہے

میرا وطن آزاد ہے، میرا وطن آباد ہے آباد ہے ہندوستاں آزاد ہے ہندوستاں

مجھ پر ہے دُنیا کی نظر   میری دعایں با اثر

ہوں لاکھ راہیں پُر خطر   مجھ کو نہیں اب کوئی ڈر

اے دیوتاؤں کی زمیں   میں جنگ کا حامی نہیں

میں امنِ عالم کے لئے   اُٹھا ہوں لے کر حوصلے

مالک مُجھے توفیق دے

میرا وطن آزاد ہے، میرا وطن آباد ہے

آباد ہے ہندوستاں آزاد ہے ہندوستاں

ابدی سفر

ہردم اور پیہم چلتا جا

راہی تُو ہردم چلتا جا

چلتے رہنا کام ہے تیرا   بے منزل انجام ہے تیرا

تیری ہستی، تیرا عالم چلتا جا تُو راہی ہر دم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

چلتا جا تُو سانجھ سویرے پاؤں نہ ٹھوکر کھائیں تیرے

پھیلا تا لہراتا پر چم   چلتا جا تُو راہی ہردم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

راہ تری دشوار تو ہوگی پُر پیچ و پُر خار تو ہوگی

لیکن تجھ کو اس کا کیا غم چلتا جا تُو راہی ہردم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

سندر شامیں صبحیں روشن پھیلا ہوا دھرتی کا دامن

دل میں لئے اک شوقِ پیہم   چلتا جا تُو راہی ہردم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

مزدوُری، سرمایہ داری   عیش و عشرت، آہ و زاری

شعلوں میں پلتی ہے شبنم   چلتا جا تُو راہی ہردم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

بھُوک پیاس کے قصّے سُنتا   مستقبل کے سائے بُنتا

ماضی کا غم دل میں کر کم چلتا جا تُو راہی ہردم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

دل کے پھیلا دے اُجیالے   آشاؤں کی جوت جگا لے

جوت نہ ہونے پائے مدھم چلتا جا تُو راہی ہردم

راہی تُو ہردم چلتا جا، ہردم اور پیہم چلتا جا

تین دَور

پہلا

میں عمرِ رفتہ کو اپنی پُکار سکتا ہوں
میں عمرِ رفتہ کو اپنی پُکار لوں ہمدم
میں اپنی زیست کے گیسو سنوار سکتا ہوں
میں اپنی زیست کے گیسو سنوار لوں ہمدم

دوسرا

مگر یہ حال مرے ذہن پر سوار ہے کیوں
یہ میری منزلِ مقصود کا نشاں تو نہیں
قرار ہے مرے دل کو نہ روح کو ہے سکوں
زمیں جسے میں سمجھتا ہوں، آسماں تو نہیں

تیسرا

وہ دُور سائے اُفق پر اُبھرتے آتے ہیں
کوئی حسینۂ کمسن ہے منہ چھُپائے ہوئے
مہین ریشمی آنچل میں سرسراتے ہیں
نقوش چہرۂ فردا کے تمتمائے ہوئے

گاندھی

آشتی و صُلح کا لے کر پیام آیا تھا تُو
راستی و حق شناسایئ کا سرمایہ تھا تُو
ابرِ گوہربار بن کر دہر پر چھایا تھا تُو
بہرِ انساں دولتِ امن و سکوں لایا تھا تُو
تیرے دل میں تھا فقط سوزِ غمِ انسانیت
تُونے اے گاندھی اُٹھایا پرچمِ انسانیت

تیرگی کے سائے ہر جانب پریشاں ہو گئے
پھر طلوعِ صبح بیداری کے ساماں ہو گئے
راز فطرت کے جو پوشیدہ تھے عُریاں ہو گئے
کرشن و گوتم تیرے پیکر سے نُمایاں ہو گئے
موت کو بھی تُونے دیکھا زندگی کے رُوپ میں
واقعی تُو دیوتا تھا آدمی کے رُوپ میں

کیا ہریجن، کیا برہمن اور کیسی جات پات
ایک ہی منزل کی جانب ہیں رواں گنگ و فرات
تونے کھادی اور چرخے سے لیا درسِ حیات
یہ وہی محور ہے جس پر گھُومتی ہے کائنات
تُونے ثابت کر دیا تدبیر سے تحقیق سے
پھُولتا پھلتا نہیں انساں کبھی تفریق سے

کر دئے ہموار تونے کیا نشیب اور کیا فراز

اور مٹایا ہندو و مسلم میں جھُوٹا امتیاز

رام دھُن کی بانسری میں بھر دیا سوز و گداز

تُو ہی تھا دَورِ جہالت میں فقط دانائے راز

تیری امیدیں تھیں وابستہ نئے انسان سے

پریم گیتا سے تو تجھ کو عشق تھا قرآن سے

تُونے آزادی کی دیوی کو بلند آواز دی

طائرِ پربستہ کو تہنیتِ پرواز دی

اک نئے دَورِ جنوں کو دعوتِ آغاز دی

قلبِ گیتی کو متاعِ درد بے انداز دی

ہر لبِ تشنہ تک آئی گردشِ جامِ فلک

خاک کے ذرّوں نے بڑھ کر چُھو لیا بامِ فلک

سرد ظلم و زور کا بازار آخر ہو گیا

حربۂ جنگ و جدل بیکار آخر ہو گیا

تیر اُلفت کا دلوں کے پار آخر ہو گیا

ہند جاگا ایشیا بیدار آخر ہو گیا

اور عمرِ نا مرادی، نا تمامی کٹ گئی

پاؤں میں جو تھی وہ زنجیرِ غلامی کٹ گئی

اب بھی تیرے نام پر آگے بڑھے جاتے ہیں ہم

اب بھی تیرے حوصلوں سے زندگی پاتے ہیں ہم

ہم نے دیکھا ہے تجھے قسمت پہ اِتراتے ہیں ہم

آج پھر ایمان تیری ذات پر لاتے ہیں ہم

جینتی تیری ہے اک تمہید پیمانِ وفا

آج پھر کرتے ہیں ہم تجدید پیمانِ وفا

تُونے جو ہم کو دکھایا راستی کا راستہ

عہد کرتے ہیں چلینگے اس پہ ہم صبح و مسا

سر جھکادیں گے ادب سے نام جب لیں گے ترا

آج تیرا جسمِ خاکی گو نہیں ہم میں رہا

آتما تیری ہمارے درمیاں موجود ہے

مشعلِ راہِ ہدایت ہے یہی مقصود ہے

قوسِ قزح

مہرِ روشن کی آخری کرنیں   رقص کرتی ہیں کالے بادل میں

اِن شعاؤں سے رنگ گرتے ہیں   اور دوشِ ہوا پہ پھرتے ہیں

اور بناتے ہیں آسماں پہ کماں   رنگ زا، رنگ بار، و رنگ افشاں

اِس کماں سے وہ تیر آتے ہیں   جو نظر کی خلش مٹاتے ہیں

سویرا

مجھے لینی ہے طوفانوں سے ٹکر اے دلِ وحشی

کہ اب آسودگی ساحل کی وجہِ سر گرانی ہے

کہ میں نے اب جنونِ کشمکش کی قدر جانی ہے

بہت چلتا رہا دامن بچا کر اے دلِ وحشی

مئے و مینا و ساقی کا خیالِ جانفزا کب تک

نہ لے گا تُو سہارا پرتَوِ شمشیر کا کب تک

نہ تُو آئے گا کب تک راستے پر اے دلِ وحشی

کسی کی ریشمی آنچل میں کب تک مُسکرائے گا

جوانی کی حسیں آغوش میں تسکین پائے گا

مِٹا جاتا ہے جھُوٹی راحتوں پر اے دلِ وحشی

وہ مزہب آدمی کو آدمی سے جو لڑاتا ہے

خدا کے نام پر جو شیطنت کوخود جگاتا ہے

وہ مزہب ابنِ آدم کا ہے رہبر اے دلِ وحشی

مجھے انسانیت کی موت پر آنسو بہانے ہیں

یتیموں اور بیواؤں کے افسانے سُنانے ہیں

جو گھر والے کبھی تھے اب ہیں بے گھر اے دلِ وحشی

قنوطیت تری روحانیت کا نقصِ پستی ہے

الہیٰ کس قدر تخریب پرور تیری بستی ہے

جو اب تک بند تھے وہ کھول دے در اے دلِ وحشی

زمانہ تجھ سے آگے اور آگے بڑھ ٹا جاتا ہے

تری خوش فہمیوں پر عزم تیرا مُسکراتا ہے

کہ پانی آگیا ہے سر کے اُوپر اے دلِ وحشی

لُنڈھا دے خم، پیالے توڑ دے، ساقی کو رخصت کر

شروعِ دورِ نَو ہے، تیغ اُٹھا، پرچم سے اُلفت کر

نہ اپنے ماضیِ مظلوم سے ڈر اے دلِ وحشی

گئی شب اور ہنگامِ طلوعِ صبح آ پہنچا

سفینہ زیست کا منجدھار میں اے نا خدا پہنچا

بدلنا ہے مجھے تیرا مقدّر اے دلِ وحشی

بغاوت

میں تجھے آج بھُلا ہی دونگا

نام تیرا سحر و شام لیا ہے میں نے   میں نے پوُجے ہیں بنا کر ترے بُتہائے حسیں

تیری ہیبت سے مری روح لرز جاتی تھی

زندگی یاد کے سائے سے بھی تھرّاتی تھی

ایک لمحے کیلئے بھی نہیں اُٹھتی تھی جبیں تجھ کو نذرانۂ صد ہوش دیا ہے میں نے

میں تجھے آج بھُلا ہی دونگا

توڑ دونگا یہ تصّور کا طلسمِ رنگیں   جس نے صدیوں کو رکھا اپنا گرفتارِ فریب

جس نے پروان نہ چڑھنے دیا انساں کا شعور

جس کی تعمیر میں شامل ہے فقط میرا قصور

میں مٹادونگا مگر اب وہی آشارِ فریب   آشنا میرے ارادوں سے ہیں ذرّاتِ زمیں

میں تجھے آج بھُلا ہی دونگا

کھول دونگا میں ترقی کی ہزاروں راہیں   اور آزاد فضاؤں میں کرونگا پرواز

نام پر تیرے، مرا خون بہے گا نہ کبھی

میرا دل تیری جفاؤں کو سہے گا نہ کبھی

اہلِ دُنیا پہ عیاں کر کے رہونگا ہر راز دیکھ سکتے ہیں جو تجھ کو وہی تجھ کو چاہیں

میں تجھے آج بھُلا ہی دونگ

پی کر آیا ہوں شرابِ غمِ فردائے حیات دفن ماضی کے دھند لکوں کو بھی کر آیا ہوں

تجھ کو کھو کر ہی ملے گی مجھے منزل میری

حل اگر ہوگی تو ہوگی یونہی مشکل میری

آج میں تجھ سے بغا وت پہ اُتر آیا ہوں   میرا معبود کوئی ہے تو ہے لیلائے حیات

داتا

داتا ہم کیا تجھ سے مانگیں

داتا تُو کیا ہم کو دیگا

نا زاں عظمت پر اپنی ہیں   نا لاں رحمت سے تیری ہیں

ہم مسرورِ آزادی ہیں   ہم سرکش ہیں، ہم باغی ہیں

داتا ہم کیا تجھ سے مانگیں

داتا تُو کیا ہم کو دیگا

ہم نے ہی تجھ کو شہرت دی   ہم نے انساں کو غیرت دی

ہم نے خوابوں کو صورت دی   ہم نے ذرّوں کو قوّت دی

داتا ہم کیا تجھ سے مانگیں

داتا تُو کیا ہم کو دیگا

سوئے تھے جو طوفاں جاگے   گلشن اور بیاباں جاگے

مستقبل کے ارماں جاگے   ننگے بھُوکے انساں جاگے

داتا ہم کیا تجھ سے مانگیں

داتا تُو کیا ہم کو دیگا

دن بھر کی محنت سہتے ہیں   راتوں کو بے کل رہتے ہیں

آنکھ سے کب آنسو بہتے ہیں   سچّی بات جو ہے کہتے ہیں

داتا ہم کیا تجھ سے مانگیں

داتا تُو کیا ہم کو دیگا

داتا تجھ کو دیکھ چُکے ہم   بیش اُمیدیں اور حاصل کم

پھُولوں پر رقصاں ہے شبنم   ہم لہرایں اپنا پرچم

داتا ہم کیا تجھ سے مانگیں

داتا تُو کیا ہم کو دیگا

آزاد زندگی ہے

ظلمت کدے میں غم کے عشرت کی روشنی ہے — اُمید گا رہی ہے

تعمیرِعالمِ نَو تجویز ہو چکی ہے — آزاد زندگی ہے

سوئی ہوئی اُمنگیں دل میں مچل رہی ہیں — کروٹ بدل رہی ہیں

محفل میں ایک رنگیں ہلچل مچی ہوئی ہے — آزاد زندگی ہے

رقصاں ہیں نِکہتوں کی پریاں حسیں فضا میں — تدبیرِ ارتقا میں

پھُولوں کی پنکھڑیوں پر شبنم کی آرسی ہے — آزاد زندگی ہے

کیا رنج اس سمے کا جو ختم ہو چکا ہے — فردا کی فکر کیا ہے

اب حال ہی ہے سب کچھ، اب قدر حال کی ہے — آزاد زندگی ہے

تاروں سے گفتگو ہے پھولوں سے ہم سخن ہے — اور شمع انجمن ہے

تیرا ضیا انوکھا اندازِ شاعری ہے — آزاد زندگی ہے

شام سے صبح تک

پھر تیرے در پہ جبیں سائی کو لوٹ آیا ہوں
تُونے ٹھکرا بھی دیا مجھ کو تو جاؤنگا نہ میں
اک نیا گیت، نیا سوزِ جنوں لایا ہوں
تابہ کے منزلِ مقصود کو پاؤنگا نہ میں

لاش پر ماضیِ نا کام کی رویا ہوں بہت
دل کو داغوں سے سجایا ہے ابھی تک میں نے
صبر اور ضبط کے صحراؤں میں کھویا ہوں بہت
غم کو تسکین بنایا ہے ابھی تک میں نے

شبِ تاریک میں خاموش اُداس آہوں نے
بارہا خواب دکھائے ہیں اُجالوں کے مجھے
اُنگھتی، ڈُوبتی اور کھوئی ہوئی راہوں نے
دئے مبہم سے جوابات سوالوں کے مجھے

آ گیا ہوں در و دیوار کو ٹھُکراتا ہوا

اب ترا در ہی مری جنّتِ گُمگشتہ ہے

آ گیا ہوں غم و افکار کو ٹھُکراتا ہوا

اب ترا قرب، مجھے حوصلۂ فردا ہے

میں اُبھارونگا ترے نقش، نکھارونگا جمال

قوّتِ فکر پہ کھولونگا نئی راہِ نجات

اپنے نغموں کے اشاروں سے سنوارنگا جمال

کوہ بن جائگا، اس وقت جو ہے کاہِ حیات

ایک طوفاں جو سمیٹے ہوئے سینے میں ہوں میں

موج و ساحل کے تفاوت کو مٹا سکتا ہے

کون کہتا ہے شکستہ سے سفینے میں ہوں میں

کون اب میرے ارادوں کو دبا سکتا ہے

سُرخیاں پھیلتی آتی ہیں اُفق پر پیہم

آنے والی سحرِ نَو کا پیامِ خاموش

ظلمتیں لرزہ براندام و گریزاں ہردم

ڈبڈباتے ہوئے تاروں کا سلامِ خاموش

باتیں

چھوڑو یہ دنیا کی باتیں آؤ پیار کی باتیں کر لیں
خالی ہے مدّت سے جھولی اِس کو آس اُمید سے بھر لیں
آس اُمید نہ ہو تو انساں جیتے جی ہی مر جاتا ہے
ٹکّر کیا طوفاں سے لےگا جو اک موج سے ڈر جاتا ہے
ڈر کر جینا موت سے بدتر چلتی پھرتی زندہ لاشیں
سوئی ہوئی جذبات کی ہلچل کچلے ہوئے ذہنوں کے سکوں میں
ذہن اگر بیدار نہ ہونگے خوف دلوں پر طاری ہوگا
آغاز و انجامِ ہستی مجبوری، لا چاری ہوگا
اِن مجبور فضاؤں میں ہم پریت اور پیار کا رنگ ملا دیں
صحراؤں اور ویرانوں کو سیرابی کا بھید بتادیں
چہروں سے ہو دُور اداسی رگ رگ دوڑے خونِ ہستی
آزادی، آزاد روی ہو عنوانِ مضمونِ ہستی
راہیں نئی کُھلجائیں سب پر کل دنیا کا نقشہ بدلے
ہوش و خرد کے دیوانے بھی قائل ہوں دل کی عظمت کے
مفلس کی نا داری میں بھی اندازِ شاہی پیدا ہو
عشق میں لوچ اتنا آ جائے حُسن کی محبوبی پیدا ہو
ماہِ محبّت کی کرنوں سے روشن اپنی راتیں کرلیں
چھوڑو یہ دنیا کی باتیں آؤ پیار کی باتیں کر لیں

فنکار

گل و لالہ و نسترن بیچتا ہوں میں کانٹوں کی رنگیں چُبھن بیچتا ہوں
زمین و زماں و ضمن بیچتا ہوں میں اپنا ضمیر اور فن بیچتا ہوں
میں اپنی متاعِ سخن بیچتا ہوں
خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں

رواياتِ ماضی حکایاتِ فردا تبسّم، ترنّم، شکایت، مداوا
خموشی، تکلّم، ہنسی، شور، غوغا اُجالا، اندھیرا، جوانی، بڑھا پا
نظامِ حیاتِ کہن بیچتا ہوں
خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں

سحر خیز کلیوں کی عصمت خریدو رگوں میں مچلتی حرارت خریدو
لبوں کی گلابی کی رنگت خریدو لطافت، مسّرت، محبّت خریدو
نزاکت، ادا، با نکپن بیچتا ہوں
خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں

بہاروں کی دلچسپ رعنا ئیاں لو   رَبابِ جنوں کی طرب زائیاں لو

عروسِ تخّیل کی انگڑائیاں لو   لپکتے شراروں کی اوچائیاں لو

میں اپنا خدا، اہرمن بیچتا ہوں

خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں

میں افسانے لکھتا ہوں کہتا ہوں غزلیں   زمانے میں مقبول ہیں میری نظمیں

ادب کو ہیں مجھ سے بہت کچھ اُمیدیں   نہیں پیٹ کی بھوک ہی میرے بس میں

بہ اُمید یک نا ن، فن بیچتا ہوں

خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں

مری آنکھ کی تم نمی کو نہ دیکھو   مرے عالمِ برہمی کو نہ دیکھو

مری زندگی کی کمی کو نہ دیکھو   مرے پیکرِ ماتمی کو نہ دیکھو

میں انسانیت کا کفن بیچتا ہوں

خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں

نا گزیر

بیتی کل پر مُورکھ ناحق انسون نیر بہائے

بیت گئی جو بیت گئی، وہ لوٹ کبھی نہ آئے

آنے والی کل آئے گی، جاگے گا سنسار

آشاؤں کی جوت میں کروٹ بدلے گا سنسار

ہونے والا ہو کے رہے گا، روک سکے گا کون

بڑھتی ہوئی بپھری موجوں کو ٹوک سکے گا کون

کون ہے جو آگے بڑھ کر ماضی کو دے آواز

کون ہے جو پھر چھیڑے دُکھتی رگ کا بھیانک راگ

کوئی نہیں جو کھیل سکے اب انسانوں سے کھیل

کوئی نہیں جو ہونے نہ دے اونچ اورنیچ کا کھیل

کوئی نہیں جو گِرتی دیواروں کو تھامے آج

کوئی نہیں جو تخت پہ بیٹھے سر پر پہنے تاج

ٹوُٹیں گے سب جھُوٹے بندھن ٹوُٹے گی زنجیر

انساں اُٹھ کر آپ سنوارے گا اپنی تقدیر

راہی

دل کی آواز نہ سُن

پیچ در پیچ تیری راہیں ہیں

یہ اُمیدیں ہی تری آہیں ہیں

فکر کے جال نہ بُن

پاؤں آگے ہی بڑھا

ٹھوکروں میں ہیں تری جام و سبُو

مُڑکے پیچھے کی طرف دیکھ نہ تُو

تُو کہاں سے تھا چلا

تیری منزل ہے کہاں

ظلمتیں تیرتی آتی ہیں مدام

اُلجھنیں دھڑکنیں ہیں تیز خرام

کر عزائم کو جواں

یہ نگاہوں میں تری

عکس دھندلا سا نئی دُنیا کا

کوئی مظلوم نہ ظالم ہوگا

ہر طرف ہوگی خوشی

دیکھ سکتا ہے تو دیکھ

پیٹ سمٹے ہوئے آنکھیں بے نور

قوّتیں شدّتِ غم سے مجبور

یہ نہیں بھاگ کے کھیل

تیز کر اپنے قدم

موڑنا ہے رخِ ہستی تجھ کو

کھینچتی رہ گئی پستی تجھ کو

کُھل گیا غم کا بھرم

نغمۂ ساز نہ سُن

چینکھتی رُوحیں اُڑی جاتی ہیں

یہ کبھی چین نہیں پاتی ہیں

دل کی آواز نہ سُن

حوصلے

گھٹا بن کرفزائے گلشنِ امکاں پہ چھاؤں گا

بہاروں کے مچلتے لہلہاتے گیت گاؤں گا

کروں گا فکر کو آزاد ہر قید و نشیمن سے

غلامی اور احساسِ غلامی کو مٹاؤں گا

جہاں یہ خاک اُگلتی ہے غم و اندوہ کا لاوا

وہاں میں ندّیاں عیش و مسّرت کی بہاؤں گا

چلے گی گردشِ افلاک بھی میرے اشارے پر

میں اپنی انگلیوں پر چاند تاروں کو نچاؤں گا

رُبابِ زیست کے تاروں میں اک ہلچل بپا ہوگی

سرُورِ بیخودی میں جب غزل میں گنگناؤں گا

یہ نسل و رنگ کی تمیز ننگِ آدمیت ہے

سبق انسانیت کا ابنِ آدم کو سِکھاؤں گا

نئی راہیں مرا ذوقِ طلب دریافت کر لے گا
نظام کہنہ کی پا بندیوں سے چھُوٹ جاؤں گا
سُلایا ہے جسے غفلت نے صدیوں لوریاں دے کر
اُسی سوزِ یقیں کو قلبِ گیتی میں جگاؤں گا
رخِ تاریخ جدّت آفرینی موڑ ہی دے گی
وہ کاری ضرب میں سر پر قدرت کے لگاؤں گا
ہمالیہ اپنی کوتہ قامتی محسوس کر لے گا
طلسمِ بے ہسی جب توڑ کر میں سر اُٹھاؤں گا
کروں گا جمع اک مرکز پہ ذرّاتِ پریشاں کو
نظامِ دہر کی بگڑی ہوئی قسمت بناؤں گا
اندھیری اور پیچیدہ ہیں راہیں امنِ عالم کی
چراغِ منزلِ مقصود بن کر جھلملاؤں گا
امنگیں کروٹیں لینگی جوانی مُسکرائےگی
میں سینہ چاک کر کے حُسن کی محفل میں آؤں گا

سہارا

میں نے سوچا تھا کہ ہستی کے طرب خانے میں
نام میرا بھی کسی جام پہ لکھا ہوگا
ایک شب ایک ہی شب میں بھی کسی نغمے سے
دل کی تسکین کا سامان کرونگا پیدا

میں نے چاہا تھا کہ خوابوں کی حسیں دُنیا میں
مُسکراہٹ سے ہم آغوش رہوں کچھ نہ کہوں
کھوئے کھوئے سے یہ اندھیرے یہ اُجالے ہر سُو
رقص کرتی کسی دوشیزہ کرن کو چھُو لوں

میرا سوچا، میرا چاہا، نہ ہوا ہو نہ سکا
بزمِ ماتم کو طرب خا نہ سمجھتا تھا میں
سادہ لوہی تھی مری سادہ خیالی کی سزا
شمع کو حاصلِ پروانہ سمجھتا تھا میں

جامِ لبریز بھی تھا، نام بھی تھا اُس پہ مرا
تھا مگر اُس میں بھرا زہر بجائے مئے ناب
ہاتھ بڑھتا تو نہ تھا، ہاتھ بڑھانا ہی پڑا
اور سمجھا کیا اُس کو بھی میں آوازِ شباب

مُسکراہٹ کے پسِ پردہ غمِ دل کی جھلک
اور مُطرب کے فسوں ساز ترانوں میں کراہ
آنکھ ہر نرگسِ حیراں کی بھر سے محروم
ننگ و تخریب کا اک عکسِ رواں عزّت و جاہ

زیست اک آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
اور کچھ تھی بھی تو میں اُس کو سمجھ ہی نہ سکا
دوش فردا کے دوراہے پہ بھٹکتا ہی رہا
دامنِ حال تھا صد چاک اُسے سی نہ سکا

تلخیاں بڑھتی رھییں وقت کی رفتار کے ساتھ
عمر گھٹتی رہی آتے رہے جاتے رہے دن
روح معیادِ اسیری میں سکوں پا نہ سکی
روز اک رات کی تمہید بناتے رہے دن

میں سمجھتا تھا جسے راہِ نجاتِ انساں
وہ نہ اقرار میں تھی اور نہ انکار میں تھی
ما دّیت کی المناک حدوں سے آگے
میری تسکین مرے دامنِ اشعار میں تھی

تیرگیِ نور

چراغ چاند ستاروں کے آج گل کر دو

سیاہ رات میں یہ عکسِ روشنی کیوں ہو

یہ دھڑکنیں بھی دلِ مضطرب کی ختم کرو

سکوت ریز فضاؤں میں برہمی کیوں ہو

رُکی رُکی سی رگوں میں ہے خون کی گردش

جُھکی جھُکی سی نگاہوں میں نا مرادی ہے

اُداس اُداس ہے بزمِ شباب و شعر و رباب

شراب تلخیِ دوراں نے کیا پلا دی ہے

نہ حُسن ہی میں کشش ہے نہ عشق میں ہے تڑپ

گلوں میں نور نہیں، بلبلوں میں سوز نہیں

مری ہوئی سی ہیں روحیں، ہیں جسم پژمردہ

فروغِ ما دیت، زندگی فروز نہیں

اٹا ہے جام کے ٹکڑوں سے فرشِ میخانہ

نہ کوئی ساقیٔ مہوش، نہ رندِ مست کوئی

ہیں تنگ وسعتیں دیر و حرم کی انساں پر

خدا پرست ہے کوئی نہ خود پرست کوئی

نظامِ کہنۂ عالم کو توڑنا ہے تمہیں

مئے اُمید سے پیمانۂ جنوں بھر دو

طلوعِ صبح، پیامِ حیاتِ نو بن جائے

چراغ چاند ستاروں کے آج گل کر دو

آخری بار

تُو پریشان نہ ہو خوف نہ کھا!

میں اشارے پہ تیرے جان بھی دے سکتا ہوں –

یہ بڑا بول نہیں، اِس کو حقیقت ہی سمجھ

قیس و فرہاد کی اُلفت ہی سمجھ

سادہ لوہی پہ نہ جا ----- !

میں کہیں دُور بہت دُور چلا جاؤں گا

لوٹ کر پھر نہ اِدھر آؤنگا –

تُو بھی اس گھر سے چلی جائے گی شہنائی کے نغمے سُنتی

تازہ خوابوں کے حسیں جال سے ہر دم بُنتی

شمع رہ جائے گی اک سر دھُنتی –

تیرے احساس کی گہرائی میں کھو جاؤں گا

اور تاریک اُجالوں میں سکوں پاؤں گا !!

چاند خاموش ہے تاروں کا فسوں ٹوُٹ گیا

بیتی راتوں کی تُجھے یاد دلاؤں گا نہ اب

قول و پیماں کی طرف کوئی اشارا نہ کرونگا ہرگز

وقتِ گزراں تو گزر جاتا ہے -----

خود بخود زخم بھی بھر جاتے ہیں –

تُو کوئی فِکر نہ کر

یہ ملاقاتِ محبّت کا یہ حکمِ آخر

ہمیں تسلیم ہی کرنا ہوگا –

آخری بار ذرا اپنے حسیں ہونٹوں پر

مُسکراہٹ کی شعاعوں کو بکھر جانے دے

میں اندھیروں میں یہی نُور تو لے جاؤں گا

تُو پریشان نہ ہو خوف نہ کھا ---

میں کہیں دُور بہت دُور چلا جاؤں گا

لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤنگا –

شیریں تلخی

اس سے پہلے بھی کہیں میں نے تُجھے دیکھا ہے !

ہے مرے ذہن کے گوشے میں ابھی تک محفوظ

دُھندلا دُھندلا سا تصّور ترے رخساروں کا –

لذّتِ گرمئی آغوشِ جواں سے اب تک

عالمِ رقص میں ہے روح مری،

ہاں، تُجھے میں نے کہیں دیکھا ہے !!

کس لئے میرے شبستاں میں چلی آئی ہے

شبِ تاریک کے سنّاٹے میں؟

کیا ترے دل میں کوئی خوف نہیں؟

دیکھ لے کوئی جو اس وقت یہاں پر تُجھ کو! ؟

میری شہرت، میری عزّت کا نہیں تُجھ کو خیال

تیرے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی یہ چیز ہے کیا؟

----- میں ترے دامِ زر و مال میں آ سکتا نہیں،

چاہِ ذلّت میں ترے ساتھ نہ کوُدوں گا کبھی،

حربۂ اشک بھی بیکار سا ہے!

تیرا اقدام یہ تہذیب و تمدّن کے خلاف

نا موافق بھی ہے، نا قابلِ تسلیم بھی ہے !-

میں گنہگار نہیں – مجھ کو نتائج سے غرض ؟

تُو گنہگار ہے، پھل بھی تُجھے تنہا ہی بُھگتنا ہوگا !

میں نے تُجھ کو کہیں دیکھا ہی نہیں،

کس لئے میرے شبستاں میں چلی آئی ہے ؟

لوٹ جا نیند نہ کر میری اُچاٹ

صبح آفس بھی مجھے جانا ہے-

فرار

جھنجھوڑ کر یہ کس نے خوابِ ناز سے جگا دیا ؟

میں سو رہا تھا گہری نیند بے خبر مآل سے

نہ ابتدا کا عکس تھا خیال کی نگاہ میں ،

میں پی رہا تھا پے بہ پے

اُنڈیل کر شرابِ حال وقت کے پیالے میں

حیاتِ مختصر مرے لئے پیامِ عیش تھی –

شباب و حُسن کی لذیذ چٹکیوں سے گدگدی تھی قلب میں،

سجی سجائی اک عروسِ نَو کی طرح دل نشیں

بہار غنچہ ہائے آرزو کو تھی نکھارتی،

بھنور میں ولولوں کے پھنس گئی تھی کشتئ جنوں !

تہِ زمیں مہیب گڑگڑا تا زلزلہ گیا،

لرز اُٹھی تمام کائنات، آنکھ کھُل گئی

کھُلی جو آنکھ تیرگی ہی تیرگی تھی ہر طرف

شباب و حُسن اور بہار میں سے کوئی بھی نہ تھا

رُباب و چنگ بھی نہ تھے ---

دل و دماغ پر طلسمِ انقلاب چھا گیا-

اُتر گیا خمارِ بادۂ فسونِ انبساط ----

نگاہ رفتہ رفتہ تیرگی سے آشنا ہوئی

نقوش ہلکے ہلکے آ گئےابُھر کے سامنے،

وہ صورتیں جنہیں میں جانتا تھا، جانتا نہ تھا

جو میرے ذہن و فکر کے حدُود سے بھی دوُر تھیں

نقاب اُٹھا کے جلوہ گر تھیں اپنے اصلی رُوپ میں –

نڈھال اور مضمحل –

کہیں رگوں میں خونِ گرم کا نشان تک نہ تھا –

پِچک گئے تھے گال اور لبوں پہ تھیں سیاہیاں

سیاہیوں سے ہمکنار زردیاں تھیں موت کی !

یہ تشنگی، یہ بھوک، جس کی انتہا کوئی نہیں،

یہ جاگتے ہوؤں کے خوفناک لرزہ خیز خواب،

یہ بلبلاتی آرزویں قلب کے مزار پر

سکوں کا خون بیقراریوں کی مانگ کا سہاگ

یہ وحشیانہ کوششیں حصولِ مدعا سے تنگ

فریب و مکر کے بچھے ہوئے ہر ایک سمت جال

یقیں کے پاؤں اور بد گمانیوں کی بیڑیاں،

ازل سے آدمی اسی طرح اسیرِ زیست ہے !!

تمام پردے ایک ایک کر کے خود سرک گئے

حقیقتیں جو روشنی میں آنکھ سے چھپی رہیں-

وہ ظلمتوں کا سینہ چاک کر کے جگمگا اُٹھیں

کھُلا جو رازِ کائنات، دل میں ایک درد اُٹھا

فراز کی تلاش رینگنے لگی دماغ میں

میں سونا چاہتا ہوں پھر -----!

تے کر چکا ہوں منزلیں آغازِ شوق کی

اب انتظار ہے نہ شبِ انتظار ہے

دار و مدارِ زیست اس امید پر ہے اب

ہوگی کبھی تو صبح شبِ انتظار کی

انساں بن کے ہرص کا دامن ہوا دراز

تکلیف دی تجھے کرمِ بے حساب کی

رونا اس بات پر آتا ہے کے سوچا کیا تھا

اور اس بات پہ ہنستا ہوں کہ ہوتا کیا ہے

تارے مری طرح ہیں جگر سوز و دلگداز

تاروں کو مانگتا ہوں شبِ رُو سیاہ سے

اوشا

وہ اوشا کی دیوی آئی کرنوں کا پرچم لہراتی

جیون کی سُندر بگیا میں آشا کی کلیاں مہکاتی

رین اندھیرے بھاگے

سونےوالے جاگے جاگے

اوشا آئی، اوشا آئی

تُو بھی جاگ او نیند کے ماتے جاگ اُجالے کی پُوجا کر

سوئے ہوئے دیووں کو جگا دے گھنٹے اور گھڑیال بجا کر

کھول دئے قدرت نے خزانے

چھیڑ دئے چڑیوں نے ترانے

اوشا آئی، اوشا آئی

کلیاں چٹکیں سبزہ لہکا، گلشن مہکا، جیون دہکا

سپنوں میں گم رہنے والا بھی اس دوراہے پر بہکا

دھرتی نے لی مست انگڑائی

ہلچل اُمیدوں نے مچائی

اوشا آئی، اوشا آئی

جواری

کھیل جواری کھیل جواری

جیت ہے تیرے ساتھ جواری

جیت ہے تیرے ہاتھ جواری

جیت کا تُجھ سے میل جواری

کھیل جواری ---

دِن آتا ہے، دِن جاتا ہے

بہلاتا ہے، بہکاتا ہے

جیسے بڑھتی بیل جواری

کھیل جواری -----

بازی میں تن من کو لگادے

آشا کے جیون کو لگا دے

ہر کٹھنائی جھیل جواری

کھیل جواری ------

ہر بازی میں جیت ہے تیری

کھیل پُرانی ریت ہے تیری

مدیرا خوب انڈ یل جواری

کھیل جواری، کھیل جواری

ہنسی

آج ہنسوں گا

ہنسنے دو میں آج ہنسوں گا

ہنس ہنس کر دُنیا میں جیوں گا

پریم کی مدیرا آج پیوں گا

آج پیوں گا، آج پیوں گا

آج ہنسوں گا

ہنسنے دو میں آج ہنسوں گا

میں کیوں روؤں نیر بہاؤں

آشاؤں میں آگ لگاؤں

رونے کا میں نام نہ لوں گا

آج ہنسوں گا

ہنسنے دو میں آج ہنسوں گا

کلیاں کِھل کر پھُول بنی ہیں

غم کی باتیں بھُول گئی ہیں

میں بھی اپنا دُکھ بھُولوں گا

آج ہنسوں گا

ہنسنے دو میں آج ہنسوں گا

گردِ راہ

ضیا فتح آبادی کے لکھے قطعات، رباعیات، نظمیں غزلیں و گیت

نا شر : مکتبہ شعلہ و شبنم ، دہلی

اشاعتِ اول ۱۹٦۳

خبر بھی ہے تجھے اے کاروانِ تیز قدم

کہ تیری منزلِ مقصود گردِ راہ میں ہے

تعارف

ضیا فتح آبادی اور اُن کا کلام کسی تعریف اور تعارف کے محتاج نہیں- وہ چوتھائی صدی سے دنیائے شعر و ادب کو اپنے بلند افکار سے نوُر و ضیا بخش رہے ہیں- وہ اِس دَور کے عظیم اور آفاقی شاعر حضرت علّامہ سیماب اکبرآبادی کے اُن چند ممتاز اورمایائے ناز تلامزہ میں سے ہیں جنہوں نے موصوف کی شاعری کی صَالح اور انسانیت نواز قدروں کو استوار کیا، آگے بڑھایا اور اُنھیں قبولِ عام و بقائے دوام بخشا –

اُن کے کئی شعری مجمعے زیرِ نظر مجموعۂ کلام سے پہلے اربابِ ذوق و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں- ان میں "طلوع"، "نورِ مشرق" اور "نئی صبح" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں- ان کا زیرِ نظر مجموعۂ کلام "گردِ راہ" بھی شعری ادب میں ایک جمیل اور قابلِ قدر اضافہ ہے- اُن کی شاعری میں یا سیت اور قنوطیت کی کہیں جھلک بھی نہیں ملتی وہ حوصلہ اور اُمید کے نقیب اور پیغامبر ہیں- اُنہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کو تازگی اور طرفگی بخش دی ہے- اُن کی شاعری حیات پرور اور وجد آفریں ہے- اُن کی نظمیں ہوں یا غزلیں، سب میں زندہ رہنے اور زندہ رہنے کے لئے جدّ وجہد کرنے کا پیغام ہے- لیکن یہ پیغام خشک اور خطیبانہ نہیں ہے- ضیا کے دلکش اندازِ بیان نے اِس پیغام کو بے انتہا خاطر فروز اور دلنشیں بنا دیا ہے- اُن کے کلام میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ دلکشی و رعنائی بھی ہے- جو اُن کی حُسن پرست طبعیت کی دین ہے- ممکن ہے محبّت اُن کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ نہ ہوا ہو- لیکن اُن کا کلام پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبّت اُن کی زندگی کا ایک نا

قا بلِ فراموش سانحہ ضرور ہے اور وہ کبھی حریفِ قیس و فرہاد رہے ہیں- اس حقیقت کی جھلکیاں اُن کے کلام میں جابجا نمایاں ہیں-

...وہ غزل اور نظم کے علاوہ قطعے اور رباعیاں بھی کہتے ہیں- اور اتنا برجستہ اور حسین اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ دل اور نظر کا دامن تھام لیتے ہیں – اور داد دیتے ہی بنتی ہے- ضیا کے اسلوب اور طرزِ بیان میں لوچ اور حلاوت اور کلام میں قادرالکلامی فنّی پختگی اور اندازِ بیان کی دلآویزی نمایاں ہے- ان کا فکر و فن غمِ جاناں ہی کے محور کے گرد نہیں گھومتا- ان کے کلام میں ماحول سے اثر پزیری بھی اپنی جھلک دِکھا ہی جاتی ہے ضیا ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں- ان کے اندازِ بیان اور لب و لہجہ میں انفرادیت و نُدرت ہے- اور یہ خصوصیت و انفرادیت اُن کو اپنے اکثر ہمعصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے- اپنے اس دعوے کی مثال کے طور پر میں ضیا کے کچھ اشعار بخوف طوالت بغیر تبصرہ پیش کر رہا ہوں ....ایسے ہی رخشندہ تابندہ گہر پارے ضیا کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں ضوپا ش و ضیا بار ہیں-

خوشتر گرامی

دلّی یکم جون ۱۹۶۳

نظم کی تمکنت، غزل کا مزاج

واہ کیا بات ہے رباعی کی

--

سورج کی کرن سے بزمِ امکاں روشن

پَرتَو سے بہار کے گلستاں روشن

بالکل ایسے ہی اے اسیرِ دانش

ہے شمعِ جنوں سے عقلِ انساں روشن

نا محرمِ حرماں رہیں توبہ توبہ

آنکھوں سے نہ آنسو بہیں توبہ توبہ

دم روزِ ازل سے دل کا بھرنے والے

اُلفت کو حماقت کہیں توبہ توبہ

منہ اشکوں سے دھونا بھی نہ آیا مجھ کو

دامن کو بھگونا بھی نہ آیا مجھ کو

بیدادِ جہاں سہہ گیا ہنستے ہنستے

روتا ہوں کہ رونا بھی نہ آیا مجھ کو

تمہید ہی انتہا فسانے کی ہے

یہ رسمِ قدیم کھونے پانے کی ہے

ہستی ہے نیستی، عدم میرا وجود

آنا میرا دلیل جانے کی ہے

آوازِ جنوں فتنۂ فریاد سہی

اخلاص و وفا کی داد، بیداد سہی

رکھتا ہوں نگاہ اپنے مسقبل پر

ماضی تیرے امروز کی بنیاد سہی

تدبیر کا ہر رنگ نکھارا میں نے

تقدیر کی زلفوں کو سنوارا میں نے

دیر اور حرم سے بچ کے اے معبدِ حُسن

خوش ہوں کہ لیا تیرا سہارا میں نے

تقدیر سے تدبیر کا سودا کر لوں

انسان کی قوّتوں کو یک جا کر لوں

ا ے نُورِ سحر، بڑھتے ہوئے سیلِ حیات

چُھپتے ہوئے تاروں کا تماشا کر لوں

چلتا ہے تو آندھیوں پہ بن آتی ہے

رُکتا ہے تو کائنات تھم جاتی ہے

یہ تیرا جذبۂ عمل ہے اے دل

تدبیر جو تقدیر سے ٹکراتی ہے

ہنگامِ سحر رات کے سائے سمٹے
نور اور ضیا کے چشمے پھُوٹے، پھیلے
رقاصۂ زیست لے کر انگڑائی اُٹھی
نغموں نے مچائی دُھوم، غنچے چٹکے

یُوں عقدے حیات کے کہیں کھُلتے ہیں ؟
بے سعی و عمل نہیں کھُلتے ہیں
اُٹھتی ہے جہاں حُسن کے چہرے سے نقاب
اسرار شباب کے وہیں کھُلتے ہیں

بادہ میں متاعِ ہوش گھولی ہے کبھی
اشکوں سے جبینِ شوق دھولی ہے کبھی
ہر ذرّے میں صد ہزار سورج روشن
اے طالبِ دید آنکھ کھولی ہے کبھی

ہر روز نیا گناہ کرتا ہوں میں
ہر جادۂ عصیاں سے گزرتا ہوں میں
مرنے کا مجھے خوف نہیں ہے لیکن
اعمال کے انجام سے ڈرتا ہوں میں

اے دوست، بتائیں کیا، کہاں ہم پہنچے

پہنچا نہ کوئی وہاں، جہاں ہم پہنچے

سوتے میں کبھی جہاں پہنچتا تھا خیال

بیدار ہوئے جب تو وہاں ہم پہنچے

ہے صبح، نہیں رات ذرا آنکھ اُٹھا

اُٹھتے ہیں حجابات، ذرا آنکھ اُٹھا

انساں کی خدائی کا زمانہ آیا

کیا بات ہے کیا بات، ذرا آنکھ اُٹھا

پستی کو بلندی س ملایا ہم نے

ذرّوں کو جہاں تاب بنایا ہم نے

اک جرعۂ صہبائے بغاوت کی قسم

تاروں سے حجاب نُور اُٹھایا ہم نے

سانچے میں خلا کے ہم نے گیندیں ڈھالی

مہر و مہ و انجم پہ کمندیں ڈالیں

دھرتی نے، فلک نے، نُور نے، ظلمت نے

انسان کے ارتقا کی قسمیں کھالیں

تدبیر سے تقدیر بنانے والے

انساں کو نئے موڑ پہ لانے والے

روندے ہوئے ذرّوں پہ چھیچھلتی سی نظر

تاروں کی طرف پاؤں بڑھانے والے

ظلمت کے بغیر نُور پائے گا کہاں

خوابوں کے حسیں قلعے بنائے گا کہاں

دھرتی کی کشِش سے بچ نکلنے والے

جذبِ اُلفت سے بچ کے جائے گا کہاں

مُطرب تُو اُٹھا ساز کہ دیوالی ہے

کر گیت کا آغاز کہ دیوالی ہے

ہیں شمع بھی، پروانہ بھی محفل میں بہم

اب تُو بھی نہ کر ناز کہ دیوالی ہے

ہر سمت ہے اک شور کہ دیوالی ہے

ساقی مجھے مے اور کہ دیوالی ہے

کیا اِس سے غرض کہ کون ہارا، جیتا

ہاں دَور چلے دَور کہ دیوالی ہے

تازہ ہوئی پھر آس کہ دیوالی ہے

پھڑکی رگِ احساس کہ دیوالی ہے

دیوالی کی آمد کا ملا مجھ کو شبوت

آئے وہ مرے پاس کہ دیوالی ہے

ہے فرش سے تابہ چرخ دیپوں کی قطار

نکھرا ہوا رنگِ گُل ہے، رقصاں ہے بہار

ظلمتکدۂ دل مرا روشن ہو جائے

آ جاؤ جو دیوالی کا تُم بن کے سنگھار

تاروں کے چمکنے کی دلیل آزادی

غنچوں کے چٹکنے کی دلیل آزادی

جو عشق کے دیوانے ہیں اُن سے پوچھو

ہے کتنی حسیں، کتنی جمیل آزادی

میخانۂ ہستی کا سرُور آزادی

انسان کی عظمت کا شعور آزادی

معلوم ہوا ضیا یہ ہو کر آزاد

ہے خُوئے غلامی کا غرور آزادی

صحنِ چمنستاں کی بہار آزادی

گلہائے شگفتہ کا نکھار آزادی

زنداں کے کھُلے ہوئے کِواڑوں کی قسم

محبُوس دلوں کا ہے قرار آزادی

خورشید کی کرنوں کا رباب آزادی

نغمات کی کلیوں کا شباب آزادی

صد رنگ سی شاعر کے تخیّل کی دھنک

کھوئی ہوئی جنّت کا ہے خواب آزادی

بڑھ کر مہ و انجم سے ضیائے اُردو

رنگینی و دلکشی بَرائے اُردو

اپنی جسے کہہ سکتے ہوں سب مِل جُل کر

ہے کوئی زباں اور سوائے اُردو؟

اللہ رے، یہ شوکت و شانِ اُردو

ہندی پہ بھی ہے مجھ کو گمُانِ اُردو

بیگانہ اِسے لاکھ کہیں اہلِ وطن

ہاں اپنی ہے اپنی ہے زبانِ اُردو

ہاں آج بھی سر میں ہے غرورِ اُردو

ہاں آج بھی دل میں ہے سرورِ اُردو

اس خاک کو اردو سے عداوت افسوس

یہ خاک تو ہے خاکِ ظہورِ اُردو

تا بندہ و روشن ہے جبینِ اُردو

خورشیدِ ادب، ماہِ مبینِ اُردو

گہوارۂ ارتقائے تہذیب و ادب

انداز و ادائے دل نشینِ اُردو

پردہ رخِ گیتی سے اُلٹنا ہے مجھے

ہر نُور سے، ظلمت سے نمٹنا ہے مجھے

اے پیرِ مغاں، بادۂ رنگیں کی قسم

آخر تری جانب ہی پلٹنا ہے مجھے

اُٹھ ساقی میخانہ، مجھے جام پلا

دیوانہ ہوں دیوانہ، مجھے جام پلا

میں زہد و عبادت کی حدیں توڑ چُکا

کعبہ ہے نہ بُت خانہ، مجھے جام پلا

ماضی پہ نہ کر غور، مجھے جام پلا
آیا ہے نیا دَور، مجھے جام پلا
اے ساقیِ وقت، آج دریا بن جا
ہاں اور ذرا اور، مجھے جام پلا

ہے سایۂ خورشید ، مجھے جام پلا
ظلمت کی ہے تردید، مجھے جام پلا
ہوتا ہے شروع دَورِ نَو اے ساقی
جینے کی ہے امید، مجھے جام پلا

ساقی ترے قربان، مجھے جام پلا
مجھ پر ترا احسان، مجھے جام پلا
انساں کی ترقّی میں رہیں کیوں حائل
یہ کُفر، یہ ایمان، مجھے جام پلا

ساقی، وہ بہار آئی، مجھے جام پلا
پیغامِ جنوں لائی، مجھے جام پلا
ہنگامۂ شادی میں غمِ دہر غلط
بجنے لگی شہنائی، مجھے جام پلا

دے مے کہ ہے دو روز بہارِ ہستی

دے مے کہ ہے دُنیا میں بلندی، پستی

دے مے کہ ہر اک ذرّہ ہو خورشید جمال

دے مے کہ دوام ہو مزاقِ مستی

اُلفت کی حقیقت سے فسانہ بہتر

یہ ہوش ہے تو ہوش گنوانا بہتر

جس سے نہ شگفتہ ہو مرے دل کی کلی

اُس ہنسنے سے تو اشک بہانا بہتر

تہذیبِ قدیم کے علَم بردارو

سوتے رہے، اب خوابِ گراں سے جاگو

ہو جاؤ مسلّح کہ قوی ہے دشمن

پیغامِ شبات امنِ عالم کو دو

مانا کہ ہے چالاک لٹیرا دشمن

مانا کہ ہے بے باک لٹیرا دشمن

کم ہم بھی نہیں ہیں، جب اُٹھائینگے قدم

ہو جائے گا خا شاک لٹیرا دشمن

اے میرے وطن کی پاک دھرتی سُن لے

تُجھ سے ہے مجھے لگاؤ تُجھ کو مجھ سے

کردوں گا نثار دل و جاں لیکن

بڑھنے ہی نہیں دوں گا قدم دشمن کے

ہمسایہ جسے اپنا سمجھتے تھے ہم

ملتے تھے شب و روز محبّت سے ہم

دشمن ہے وہی آج ہمارا تو بھی

قائل نہیں جذباتِ عداوت کے ہم

"نیفا" میں ارادوں کو سنوارا کس نے

"لداخ" میں ہمّت کو اُبھارا کس نے

اے حُبّ وطن کے جذبۂ جاں پرور

چوٹی سے ہمالہ کی پُکارا کس نے

میں حال کی زلفوں کے فسانے بُن لوں

فردا کی ہواؤں کے ترانے سُن لوں

اے وقت ذرا تھم کہ کنار دل سے

بُھلے ہوئے رنگین زمانے چُن لوں

میری نظمیں، میرے گیت

تیرا دامن، تیری پریت

--

حُسن

فضائے گلشنِ ہستی پہ چھا رہا ہے حُسن

نویدِ عشرتِ جاوید لا رہا ہے حُسن

فُغاں و نالۂ بلبل کا بن کے سوز و گداز

گلوں کو طرزِ تبسّم سِکھا رہا ہے حُسن

ڈبو کے نُور میں کِرنوں کو مہرِ تاباں کی

شفق کے ساز پہ نغمے سُنا رہا ہے حُسن

شباب بن کے رگ و پے میں جاری و ساری

شراب بن کے پیالوں میں آ رہا ہے حُسن

تجلّیات کا مصدر، ضیاؤں کا مخزن

جہانِ تیرہ میں شمعیں جلا رہا ہے حُسن

نہ عہدِ رفتہ کا غم ہے نہ فکرِ مستقبل

شعورِ حال کا جادو جگا رہا ہے حُسن

چمن میں بخش کے پُھولوں کو رنگ و بو کا لباس

مسرّتوں کے خزانے لُٹا رہا ہے حُسن

جنوں و شوق کی تعلیم دے کے انساں کو

بقیدِ آب و گلِ انساں بنا رہا ہے حُسن

کرشمہ سازیِ نیرنگِ حُسن کیا کہیئے

جو لاعلاج ہے اُس درد کی دوا کہیئے

دلّی ۱۹۳۸

صبح کا تارا

پشتِ عفریتِ شب پر میں کوڑے برسانے آیا ہوں

نُو رانی صبح کے جلووں کا پیغام سُنانے آیا ہوں

سُورج کی کرنیں پھیلیں گی دُنیا کے کونے کونے میں

صدیوں سے جو سوتے ہیں اُن کی نیندیں میں اُڑانے آیا ہوں

میں موت سے پنجہ لیتا ہوں میں ظلم سے ٹکرا جاتا ہوں

مُردوں کو جِلانے آیا ہوں گِرتوں کو اُٹھانے آیا ہوں

جن سے انساں خطرے میں ہے، سہمی سہمی انسانیت

اُن محلوں، اُن ایوانوں کو میں آج گرانے آیا ہوں

خضر اور سکندر ایک ہی ہیں، رہبر رہرو میں فرق نہیں

روندے ہوئے ہر ذرّے کو میں خورشید بنانے آیا ہوں

انساں، انساں کا دشمن ہے، انسانیت سے بے بہرہ

انساں کو انسانیت کا میں بھید بتانے آیا ہوں

لڑتے بِھڑتے مدّت گزری، اب امن و سکوں کا دَور آیا

انسانوں کو میں جینے کا انداز سِکھانے آیا ہوں

جنگ اور جدل کا حاصل ہے تخریب، تباہی، ناکامی

یہ راز بتا کر دُنیا کی میں لاج بچانے آیا ہوں

ناکام آنکھوں میں اشکوں کی شبنم سے کام نہیں بنتا

جو آگ کہ عینِ ہستی ہے وہ آگ لگانے آیا ہوں

رہبر کی شکایت بے موقع، منزل کا نشاں معلوم نہیں

جو خار و گلُ راہوں میں ہیں اُن کو چمکانے آیا ہوں

جو رات کہ ننگِ عالم تھی اُس رات کا اب انجام آیا

سونے والو ، جاگو سنبھلو، بیداری کا ہنگام آیا

دلّی ١٩٥٤

مطالبہ

ترانے مسرّت کے گاؤ تو جانیں   جوانی کی شمعیں جلاؤ تو جانیں
حسیں زندگی کو بناؤ تو جانیں   محبّت کا پرچم اُٹھاؤ تو جانیں

مصا ئب کی روداد کہتے رہے ہو   تھپیڑے حوادش کے سہتے رہے ہو
شب و روز طوفاں میں بہتے رہے ہو   بھنور کو بھی ساحل بناؤ تو جانیں

یہ چُھپ چُھپ کے آنسو بہانا غلط ہے   خموشی سے ہر غم اُٹھانا غلط ہے
کمر توڑ کر بیٹھ جانا غلط ہے   عمل کا کوئی گیت گاؤ تو جانیں

بہت دُور منزل، کٹِھن رہگزر ہو   نہ رہبر، نہ رہبر کی کوئی خبر ہو
نظر مضمحل، حوصلہ پست تر ہو   قدم پھر بھی آگے بڑھاؤ تو جانیں

شبِ تار میں چاند تاروں سے کھیلو   اگر گل نہیں ہیں تو خاروں سے کھیلو
تلاشِ سکوں میں شراروں سے کھیلو   مُصیبت میں بھی مُسکراؤ تو جانیں

دلّی ۱۹۴۱

عَزائم

نہیں ہے میرے لئے کوئی کام نا ممکن

فلک سے چاند ستاروں کو توڑ لاؤں گا

نویدِ نغمہ زنی دوں گا عندلیبوں کو

کلی کلی کو چمن زار میں ہنساؤں گا

کروں گا رسمِ محبّت کو عام دُنیا میں

ہر ایک خار کو طرزِ وفا سِکھاؤں گا

زمیں پہ ہوگی نمودار صبح روزِ اُمید

حیاتِ تازہ کے پُر کیف گیت گاؤں گا

انسانِ بیدار

جا رہی ہے تیرگی چھا گئی ہے روشنی

مُسکرا تی ہے کلی ہے فضا نِکھری ہوئی

طائرانِ خوش نوا

نغمہ ہائے دل ربا

مستیوں کا سلسلا

گُنگناتی ہے حیات رقص میں ہے کائنات

با خبر، ہُشیار ہے آدمی بیدار ہے

رشکِ گروں ہے زمیں ہے یہ دَورِ بہتریں

غم کِسی دل میں نہیں ہمّت و عزم و یقیں

رہنُما و راہبر

ٹھوکروں میں رہگزر

ختم ہوتا ہے سفر

ظلم و استبداد کا اب زمانہ لد گیا

باخبر، ہُشیار ہے آدمی بیدار ہے

ہے بلندی زیرِ پا پستیوں کا ذکر کیا

کام کیا ہے یاس کا دل ہے ہمّت آشنا

بے نیازی مِل گئی

چارہ سازی مِل گئی

سر فرازی مِل گئی

فکرِ ناؤ نوش ہے یعنی اپنا ہوش ہے

باخبر، ہُشیار ہے آدمی بیدار ہے

خار و گلُ کا پاسباں ارتقا کا رازداں

شور و شر کا نوحہ خواں حامیِ امن و اماں

آشنائے رنگ و بوُ

واقفِ جام و سبوُ

صلح خواہ و صلح جوُ

قائلِ تدبیر بھی مائلِ تقدیر بھی

باخبر، ہُشیار ہے آدمی بیدار ہے

صبحِ نَو آ ہی گئی نُور پھیلا ہی گئی

باغ پر چھا ہی گئی کیف برسا ہی گئی

پتّی پتّی اک گلاب

قطرہ قطرہ موجِ آب

ذرّا ذرّا آفتاب

راز افشا ہو گیا خواب سچّا ہو گیا

باخبر، ہُشیار ہے آدمی بیدار ہے

مدراس ۱۹۵۷

صَدائے جرس

اندھیروں کی دُنیا پہ چھاتا چلا جا   اُمیدوں کی شمعیں جلاتا چلا جا
ترانے محبّت کے گاتا چلا جا   قدم سوئے منزل بڑھاتا چلا جا

تری رہ گزر میں جو ہو کوئی پتّھر   اُسے ٹھوکروں سے ہٹاتا چلا جا
اگر کوئی زور آزما ہو تو بڑھ کر   اُسے زورِ بازو دِکھاتا چلا جا

پہاڑوں سے، دریاؤں سے بے خطر ہو   مصائب سے آنکھیں لڑاتا چلا جا
وہ کیسی ہی تیری کٹِھن رہ گزرہو   قدم تُو ہمیشہ بڑھاتا چلا جا

نہ ڈر خار زار و بیاباں سے ہرگز   بزعمِ جنوں خاک اُڑاتا چلا جا
وفاؤں کا دُنیا میں کر بول بالا   عمارت جفاؤں کی ڈھاتا چلا جا

رواياتِ ماضی فراموش کر دے   حکایاتِ فردا سناتا چلا جا
یہ شیون کی آواز خاموش کر دے   ترنّم کے دریا بہاتا چلا جا

سلامت یہ جوشِ طلب ہے مسافر
مسافت تری جاں بلب ہے مسافر
دلّی ۱۹٤۱

وقت کی پُکار

دو دھرم کو آواز نہ ایماں کو پُکارو انساں کی ضرورت ہے اب انساں کو پُکارو

غنچوں کی ہنسی چھائی ہے گلشن کی فضا پر چھیڑو بھی کوئی ساز غزلخواں کو پُکارو

تقدیر تو کچھ بھی نہیں تدبیر ہے سب کچھ آرام سے بھاگو، غمِ دوراں کو پُکارو

آثار سحر کے ہیں نمودار اُفق پر چڑھتے ہوئے خورشیدِ درخشاں کو پُکارو

میخانہ و ساقی سے کرو ترکِ تعلق لہراتے ہوئے ابرِ بہاراں کو پُکارو

ہے اوج بھی پستی بھی گزرگاہِ جنوں میں صحرا کو بُلاؤ، چمنستاں کو پُکارو

ٹوٹی ہوئی کشتی کو جو ساحل پہ ڈبو دے

اس موجۂ پروردۂ طوفاں کو پُکارو

مدراس ۱۹۵۳

سینہ زوری

نا سازگار گردشِ ایّام ہے ہنوز   پیرِفلک سے چاند ستاروں کو چھین لوں

مدّت سے صحنِ باغ خزاؤں کا ہے شکار   میں کیوں نہ بڑھ کے تازہ بہاروں کو چھین لوں

پی کر بھی ہوش ہے جنھیں آدابِ بزم کا   ساقی سے ایسے بادہ گساروں کو چھین لوں

جن کے سبب دلوں میں ہے ہلچل مچی ہوئی   اُن مست انکھڑیوں کے اشاروں کو چھین لوں

جن کے لئے ہے چشمِ تماشا پُر اضطراب   اُن جنّتِ نگاہِ نظاروں کو چھین لوں

ٹوٹے ہوئے سفینے کو کردوں سپردِ موج   طوفاں میں ڈوب جاؤں، کناروں کو چھین لوں

اُمید کے سہارے گزاری تمام عمر   اے عزم، کیوں نہ تیرے سہاروں کو چھین لوں

حائل ہر ایک گام پہ ہے پا شکستگی   منزل سے اپنی راہگزاروں کو چھین لیں

ظلمت کی برف یوں تو پگھلتی نہیں کبھی

سُورج سے میں دہکتے شراروں کو چھین لوں

مدراس ١٩٥٤

چاندنی رات

میرے محبُوب، تجھے حُسن و جوانی کی قسم میری پاکیزہ محبّت کو نہ رسوا کرنا
پرورش پائی اندھیروں ہی میں اب تک میں نے چاندنی رات کی مجھ سے نہ تمنّا کرنا

میں ابھی رسم و روایات کا پابند تو ہوں ننگ و نا موس کی فکروں سے نہیں ہوں آزاد
درد و آلام کے سہنے کی مجھےعادت ہے لب پر آتی ہی نہیں جور و جفا کی فریاد

شب کے پُرہول اندھیروں کی ملاقاتوں پر میں نے تعمیر کیا ہے جو محبّت کا محل
روشنی کی کوئی اس پر نہ کرن پڑ جائے سرد پڑجائیں نہ دہکے ہوئےجذبوں کے کنول

میرے محبوب، محبّت کا تقاضا ہے یہی دل کے جلتے ہوئے داغوں سے اُجالا کرنا
چاندنی رات میں ملنے کی تمنّا ہے غلط چاندنی رات کی ہرگز نہ تمنّا کرنا

مدراس ۱۹۵۳

روضۂ تاج

جلوہ گاہِ عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں

تیری تابانی سے روشن سینۂ ہندوستاں

تیرے سنگِ آستاں پر خم جبینِ آفتاب

چاند نے جس کو سنوارا تُو وہ نقشِ کامیاب

موجۂ رودِ جمن میں عکس ہے لرزاں ترا

تُو مجسّم نغمۂ دل، حُسن بے پا یاں ترا

نَو عروسِ ماہ کا آئینہ بن جاتا ہے تُو

حُسن سے ہر منظرِ دلکش کو چمکاتا ہے تُو

چاندنی سر گوشیاں کرتی ہے تیری خاک سے

رفعتیں پاتا ہے گردوں تیری ارضِ پاک سے

گردشِ دوراں کا تجھ پر کچھ اثر ہوتا نہیں

دردِ اُلفت سے ترا دل بے خبر ہوتا نہیں

تھیں فناسامانیاں جب آدمیّت کا وقار

تُو اُسی دَورِ محبّت کی ہے زندہ یادگار

پتّھروں میں تیرے حُسن و عشق کی رنگیں جھلک

تیری میناروں کی رفعت تا بہ دامانِ فلک

تُو کہ ہے "ممتاز"کی آرام گاہِ آخری

سینۂ "شاہِ جہاں" کا دوُدِ آہِ آخری

صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ دوامِ عشق ہے

حُسن در آغوش تُو ماہِ تمامِ عشق ہے

تیرا اربابِ نظر پر جاودانی راج ہے

"تاج" تُو ہندوستاں کے سر کا زرّیں تاج ہے

مزدوُر کی محبّت

کانٹوں میں رہنےوالوں کو پُھولوں کی مے سے کیا مطلب
جانی چیزوں کے طالب کو انجانی شے سے کیا مطلب

جب پیٹ کی بُھوک ستاتی ہے، دل اُلفت کو تج دیتا ہے
جس شخص کا خون پسینہ ہو وہ راحت کو تج دیتا ہے

یہ شام و سحر کی گردش کیا بیتابی پیدا کرتی ہے
مایوس دلوں میں احساسِ نایابی پیدا کرتی ہے

میں تجھ سے پیار کروں کیونکر، مجبور بھی ہوں، ناچار بھی ہوں
یہ میری اپنی قسمت ہے، مزدور بھی ہوں، نا دار بھی ہوں

میرے بازو کی قوّت سے اوروں کو دولت ملتی ہے
میں بھی تو آخر انساں ہوں، میری چھاتی بھی ہلتی ہے

اے کاش مجھے بھی دُنیا میں رہنے کا سلیقہ آ جاتا
اپنے، بیگانے کو دھوکا دینے کا طریقہ آ جاتا

میری جیبوں میں بھی سکّے آپس میں سرگوشی کرتے
میری کمزوری چُھپ جاتی، میری ہیبت سے سب ڈرتے

گاڑھے کی جگہ اک اطلس کا ملبوس مرے تن پر ہوتا
دُنیا کو جُھکا کر قدموں پر نازاں میں بھی دھن پر ہوتا

عشق اور جوانی کے قصّے سُنتا بھی اور سُناتا بھی
جاگی ہوئی دل کی دُنیا کو مستی کا بھید بتاتا بھی

لیکن اب یہ کیفیت ہے، جینا ہے وبالِ دوش مجھے
لینے کو آگے بڑھتا ہے غم کھولے ہوئے آغوش مجھے

فکروں میں عمر گزرتی ہے پل بھر بھی چین نہیں ملتا
جو طوفاں کو ساحل کر دے وہ نصف العین نہیں ملتا

میں پیار کی باتیں کیا جانوں، میں پیار کی گھاتیں کیا سمجھوں
بے کیف ہمیشہ رہتی ہیں کیوں میری راتیں، کیا سمجھوں

دلّی ١٩٤٦

مراجعت

حال و فردا کے کارخانے میں زندگی کی مشین چلتی ہے
دل میں جذبات کا گزر ہی نہیں بس عمل کا یقین باقی ہے

اے غمِ زیست تجھ کو دیکھ لیا کشمکش کے سوا نہیں کچھ بھی
دل میں دردِ بُتاں نہ ہو تو پھر ولولہ، حوصلہ، نہیں کچھ بھی

سوچتا ہوں کہ کیا یہی تخریب حاصلِ ارتقائے انساں ہے
آگیا ہوں عجیب دوراہے پر یہ گلستاں ہے، وہ بیاباں ہے

روشنی کی اُمید میں کب تک دل مرا رات سے نباہ کرے
دامن اپنا بچا کے کانٹوں سے یہ کسی لالہ رخ کی چاہ کرے

چاہتا ہوں کسی بہانے سے میں ترے آستاں پہ آ جاؤں
پھر ترے پنکھڑی سے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کی چاندنی پاؤں

مدراس ۱۹۵۶

ناقابلِ فراموش

دل کو، دیوانہ بنانا یاد ہے

مستیاں ہر سُو لُٹانا یاد ہے

صحنِ گلشن میں بصد حسن و جمال

روز تازہ گلُ کِھلانا یاد ہے

مُسکرا کر دیکھنا میری طرف

دیکھ کر پھر مُسکرانا یاد ہے

لے کے انگڑائی غرورِ حُسن سے

بجلیاں دل پر گرانا یاد ہے

مجھ سے رفتہ رفتہ وہ کُھلنا ترا

نیچی نظروں کو اُٹھانا یاد ہے

کر گئے ہیں دل میں گھر کچھ اس طرح

میں وہ بیتے دِن بھُلادوں کس طرح

دلی ۱۹۳۸

ہجر

تھم ذرا اے آسماں وقتِ وداعِ یار ہے

سانس لینا بھی فضائے یاس میں دشوار ہے

خوف تھا جس کا وہ ہنگامِ جُدائی آ گیا

خیر ہو یا رب کہ پیغامِ جُدائی آ گیا

آ گیا وہ موڑ، ہوتی ہیں جہاں راہیں الگ

دل سے دل، نظروں سے نظریں دُور اور چاہیں الگ

وہ اُٹھی کالی گھٹائیں، ہجر کا آغاز ہے

ہول طاری روح پر، خاموش دل کا ساز ہے

اک اداسی، ایک بکیفی سی ہے چھائی ہوئی

ہر کلی صحنِ گلستاں میں ہے مرجھائی ہوئی

گردشِ شام و سحر میں کوئی دلچسپی نہیں

میکدے میں ساغر و مینا تو ہیں، مستی نہیں

کیا غضب ہے، جانِ محفل اُٹھ کے محفل سے چلا

قافلہ صبر و سکوں کا دل کی منزل سے چلا

ہجر تکمیلِ محبّت، ہجر تزئینِ جمال

ہجر پر ہے منحصر رنگینئ حُسنِ خیال

ہجر، رنگ و نکہت و گل، ہجر بلبل کی نوا

ہجر، اک شانِ تغافل، ہجر سامانِ وفا

ہجر، شب کی تیرگی، نورِ سحر، رازِ حیات
ہجر کے ہاتھوں میں دامانِ نگارِ کائنات
ہجر سے دھڑکن دلوں کی ہے خیالوں کی اُڑان
ہجر ہے اندھوں کی آنکھیں، ہجر گونگوں کی زبان
ہجر، اُمّیدوں کا مسکن، آرزوؤں کا محل
ہجر طوفاں خیز موجوں میں تبسّم زا کنول
ہجر، زد میں آندھیوں کی جگمگاتا سا چراغ
ہجر ہی تو ہے قمر کے سینۂ روشن کا داغ
نشۂ جام و شرابِ نو جوانی ہجر ہے
وصل فانی ہے، یقیناً جاودانی عشق ہے

اے دلِ بیتاب، یہ شور و فغاں کس واسطے
آنسوؤں کا سیل آنکھوں سے رواں کس واسطے
صبر عنوانِ تمّنا ہے فسانے کے لئے
ہجر ہے بس ضبط تیرا آزمانے کے لئے
بڑھتا دریا کوئی ہرگز روک سکتا ہی نہیں
مڑکے پیچھے کی طرف طوفان تکتا ہی نہیں

سامنے وہ روشنی سی آ رہی ہے جو نظر
ہے مدارِ عالمِ فردا اُسی پر، بے خبر!
دوُر جاکر دوُر جا سکتا نہیں جو دل میں ہے
اک تڑپ موجوں کے پہلو میں تو اک ساحل میں ہے

وقتِ رُخصت، مطربہ، اک گیت ایسا چھیڈ دے

جس کا زیر و بم شکستہ ساز دل کا چھیڑ دے

پھر لبوں تک آئے واپس وہ ہنسی رُوٹھی ہوئی

خود بخود من جائے اپنی زندگی رُوٹھی ہوئی

مدراس

۱۹۵۹

یادِ سیماب

اُفقِ فکر پہ منڈلاتی ہے سیماب کی یاد

دل کو بے ساختہ تڑپاتی ہے سیماب کی یاد

بن کر اک آہ چلی آتی ہے سیماب کی یاد

ذہن جب منزلِ اصلی کا پتہ پاتا ہے

لب پہ جب "شعرِ مہزّب" کوئی آ جاتا ہے

خود بخود دل میں اُبھر آتی ہے سیماب کی یاد

میر و غالب کے وطن سے وہ بصد شان اُٹھا

اور استادِ جہاں داغ کے حلقے میں رہا

یادِ اقبال سے ٹکراتی ہے سیماب کی یاد

دُھوم اُردو کی ہر اک سمت مچی ہے اب تک

آگ جو اُس نے لگائی تھی لگی ہے اب تک

محفلِ شعر کو گرماتی ہے سیماب کی یاد

"تاج" کو اُس نے دیئے حُسن کے انداز بہت

"اکبرآباد" پہ سیماب کو تھا ناز بہت

"اکبرآباد" کو مہکاتی ہے سیماب کی یاد

خدمتِ شعر میں مصروف رہا نصف صدی

بات جو اُس نے کہی اور کسی نے نہ کہی

اب اُسی بات کو دہراتی ہے سیماب کی یاد

مدراس ١٩٥٦

سَجدۂ ارتقَا

ملا جب حکمِ رخصت حضرتِ آدم کو جنّت سے
تو جتنی نازشیں تھیں دل میں وہ بدلیں ندامت سے
اُتر کر ارضِ خاکی پر زمیں دیکھی، فلک دیکھا
بڑی حیرت سے ہر منظر کو دیکھا، دیر تک دیکھا
کہیں دیکھا اُٹھائے سر فلک سا کوہساروں کو
کہیں دیکھا حسیں نغمات برلب آبشاروں کو
کبھی تاروں کو دیکھا جگمگاتے، نُور پھیلاتے
کبھی پھُولوں کو دیکھا مُسکراتے، رنگ برساتے
خلاؤں میں پرندے مائلِ پرواز بھی دیکھے
لرزتے پردہ ہائے سازِ بے آواز بھی دیکھے
کیا نظّارہ دُنیا کی بلندی اور پستی کا
ہر اک منظر نظرکش تھا فضائے بزمِ ہستی کا
ہوئے گُم اِس قدر اِن منظروں میں حضرتِ آدم
کہ جنّت سے نکلنے کا رہا دل میں نہ کوئی غم
کھُلیں ظاہر کی آنکھیں، رنگ و بُو میں رہ گئیں کھوکر
یہی ہوتا ہے عالم حق سے بندے کا جُدا ہو کر

خراماں مدّتوں آدم رہے تاریک راہوں پر

کدُورت دِل پہ چھائی زندگی کی کشمکش بن کر

زمانہ کروٹیں لیتا رہا، لیتا رہا پیہم

اندھیرا چھا گیا ہر سُو، اُجالا ہو گیا مدھم

یہ ہیبت ناک ظلمت دیکھ کر دل اور گھبرایا

مسرّت ہو گئی رخصت، غم و اندوہ در آیا

ڈرے، سہمے، رُکے، دَوڑے، کسی پہلو نہ چین آیا

اُٹھا اک دردِ نا معلوم سا، دل کو تپاں پایا

اچانک اک شعاعِ نُور آدم کو نظر آئی

جہانِ بے حقیقت میں حقیقت کی خبر آئی

کسی نے کان میں آ کر کہا- معلوم ہے تجھکو؟

تری تخلیق کا مقصد ہے کیا، معلوم ہے تجھکو؟

کہاں سے آ رہا ہے تُو؟ تری منزل بھی ہے کوئی؟

تری اِس ہستئ محدود کا حاصل بھی ہے کوئی؟

کبھی پھُولوں کو مُرجھاتے ہوئے بھی تُونے دیکھا ہے؟

کبھی تاروں کو ٹکراتے ہوئے بھی تُونے دیکھا ہے؟

نقابِ رُخ کبھی اُلٹی ہے تُونے خودپرستی کی؟

کبھی سمجھی ہے تُونے بات اپنی زیردستی کی؟

کبھی تُونے کیا ہے غور "کیا" "کس واسطے" "کیوں" پر

نظر تیری کبھی پہنچی ہے گردوں سے بھی بالاتر؟

یہ سُنتے ہی ہوا احساس محرومی کا آدم کو

زیادہ ہو گیا غم اپنی محکوُمی کا آدم کو

اثر جذبے کا تھا اتنا دلِ غمگیں و مضطر پر

کہ جُھکنے پر ہوا مجبور آخر خود سَرِ خود سر

حقیقت کُھل گئی رعنائیِ گلزارِ عالم کی

دعا ہو ہی گئی مقبول آخر کار آدم کی

دماغ و روح نے اپنا سکوں کھویا ہوا پایا

خدا کے سامنے سجدے میں رازِ ارتقا پایا

دلّی ۱۹٤۰

فِکریں

سوچ رہا ہوں ----- کیا یہ ننگا، بھُوکا انساں، یوں ننگا، بُھوکا ہی رہے گا

صدیوں سے غم کھانے والا کب تک ظلم و جور سہے گا

سوچ رہا ہوں ----- قسمت کو کب تک کوسے گا، کب تک پھر بیدار نہ ہوگا

مذہب کے دیوانہ پن سے مانگے گا نفرت کی جوالا

سوچ رہا ہوں ----- آپس میں لڑنے بھِڑنے سے مستقبل تعمیر بھی ہوگا

آغازِ تدبیر کے ہاتھوں انجامِ تقدیر بھی ہوگا

سوچ رہا ہوں ----- دُور نہ ہوگی منزل سے یہ راہوں کی دُشواری کب تک

مسجد، مندر،کے ناتوں میں آئے گی ہمواری کب تک

سوچ رہا ہوں ----- خون سے جن بچّوں، بُوڑھوں کے یہ دھرتی شاداب ہوئی ہے

کیا اُن کی بھٹکی روحوں کو جنّت میں تسکین مِلی ہے

دہلی ــ ۱۹۳۸

مقامِ شاعر

گھٹا کا وسعتوں پر چرخ کی چھانا، برس جانا

چٹکنا غنچۂ نورس کا، بن کر پھُول مرجھانا

ازل سے فطرتِ دریا ہے روز و شب رواں رہنا

شعارِ موجۂ گرداب سر گرمِ فغاں رہنا

خزاں کی گود میں پلنا بہاروں کا مقدّر ہے

بلندی سے اُترنا آبشاروں کا مقدّر ہے

ملی ہے بلبلوں کو شاخِ گل پر نغمہ آرائی

فلک کے آشیاں پر کوہساروں کو جبیں سائی

جلانا خرمنِ دہقاں کو شیوہ بجلیوں کا ہے

منّور زندگی کی بزم کو خورشید کرتا ہے

ہواؤں کے مقدّر میں ہے مصروفِ سفر رہنا

بگولوں کی ہے قسمت رقص میں شام و سحر رہنا

چمکنا رات بھر حصّے میں آیا ہے ستاروں کے

سُلگتی ہے ہمیشہ آگ سی دل میں شراروں کے

مگر جو کام شاعر کا ہے وہ ہے کام شاعر کا

درخشندہ ہے لوحِ زندگی پر نام شاعر کا

گھٹا بن کر برستا ہے سمن زارِ تخیّل پر

تبسّم ریز ہوتا ہے کلی کی تازگی لے کر

طبیعت کی روانی اِس کی شرماتی ہے دریا کو

فغاں گرداب کی تو ہے اِسی کی آہ کا پَرتَو

خزائیں بھی بہاریں بھی ہیں گلزارِ تخیّل میں

بلندی بھی ہے، پستی بھی ہے کُوہسارِ تخیّل میں

ہر اک گُل گوش بر آواز اِس کی نے نوازی پر

خمیدہ سر ہمالہ کا ہے اِس کی سرفرازی پر

کبھی یہ بن کے بجلی، آگ سینوں میں لگاتا ہے

کبھی یہ آفتابِ نُور بن کر جگمگاتا ہے

مسافر ہے، سفر اِس کے لئے سامانِ راحت ہے

خودی میں جھُوم جانا اِس کا رقصِ اہلِ جنّت ہے

ستاروں کی طرح ہر شعر اِس کا نُور پرورده

شراروں کی طرح رازِ بقا کا ہے یہ آئینہ

یہ وہ تخلیقِ فطرت ہے کہ فطرت اِس پہ نا زاں ہے

مگر یہ راز اب تک دیدۂ انساں سے پنہاں ہے

دلّی ۱۹۳٦

نئی لوری

چمکے گگن پر چاند ستارے رات نے اپنے پیر پسارے

نیند کی دیوی کے ہیں اشارے آ جا، آ جا میرے پیارے

سو جا، سو جا غم کے مارے

غم کے مارے سوجا، سوجا

ہستی تو تقصیر ہے تیری نا کامی تعزیر ہے تیری

اُلٹی ہر تدبیر ہے تیری سونا ہی تقدیر ہے تیری

سو جا، سو جا غم کے مارے

غم کے مارے سوجا، سوجا

بیداری شعلوں کی زباں ہے بیداری تو آفتِ جاں ہے

بیداری میں چین کہاں ہے بیداری میں تیرا زیاں ہے

سو جا، سو جا غم کے مارے

غم کے مارے سوجا، سوجا

مشرق سے سورج اُبھرے گا نُور جہاں میں پھیلائے گا

عالم پھر انگڑائی لے گا نیند سے تُو پھر جاگ اٹھے گا

سو جا، سو جا غم کے مارے

غم کے مارے سوجا، سوجا

پُوری آشا تیری ہوگی موجِ صہبا تیری ہوگی

عشرتِ فردا تیری ہوگی ساری دُنیا تیری ہوگی

سو جا، سو جا غم کے مارے

غم کے مارے سوجا، سوجا

مدراس ۱۹۵۸

میں اور چاند

میں:-

سالہا سال سے میں دیکھتا آیا ہوں جسے

اب اُسی خواب کی تعبیر نظر آتی ہے

حدِ افلاک سے آگے نکل آیا ہوں بہت

پرِ پرواز کی تفسیر نظر آتی ہے

تیری کرنوں سے مری راتوں میں تھا نُور کا رقص

میرے جذبوں کے سمندر میں اُٹھے تھے طوفاں

خلوتِ یاس میں تھا تُو مِرا ہمدم، ہمراز

میرے داغوں نے تِرے داغوں میں پائی تھی اماں

مبتلا کشمکشِ زیست میں تھا شام وسحر

اہتمامِ غمِ پستی کے سوا کچھ بھی نہ تھا

میرا گھر، میری گلی، میرا وطن، میری زمیں

اک فریبِ دلِ مفتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

درِ زندانِ کشش ہو گئےوا آخرِ کار

توڑ ہی ڈالا ہے میں نے یہ زمیں کا افسوں

دل میں اک عزمِ جواں بھیشم و ارجن کا لئے

چیر کر سینہ خلا کا میں چلا آیا ہوں

چاند! یہ تیرا ضیا بار مقدّس چہرہ

کھینچ کر غمکدۂ خاک سے لے آیا ہے

بخت کو ناز نہ ہو کیوں مِری خوش بخشی پر

تیری محفل میں سکوں میں نے بہت پایا ہے

چاند:-

ہاں، مِری خاک تیری خاک میں شامل ہے مگر

کچھ مسرّت تِری آمد پہ نہیں ہے مجھ کو

تیری صورت سے ٹپکتی ہے جو اک ویرانی

چھین لے گی وہ سکوں میرا یقیں ہے مجھ کو

تُو ہے آمادہ بہ شر، نام بشر ہے تیرا

تیری ہر چال کا انداز سمجھتا ہوں میں

اجنبی میرے لئے تُو ہے نہ میں تیرے لئے

تیری پرواز کا سب راز سمجھتا ہوں میں

میری نظروں میں تِرا اوج، تِری پستی ہے

تیری تاریخ کے ابواب مجھے اَزبر ہیں

مادیّت کے پرستار تجھے کیا معلوم

منحصر روح کے عرفان پہ بال و پر ہیں

تُو کہ پروردۂ ظلمت کدۂ ہستی ہے

تیری فطرت میں وہی کبر و ریا ہے کہ جو تھا

باغی و سرکش و مغرور و منافق، گمُراہ

خود نگر، خود سر و بدخوُ بخدا ہے کہ جو تھا

اپنی دھرتی پہ قدم تیرے نہ آنے دوں گا

اپنی پستی میں پلٹ جا کہ وہ گھر تیرا ہے

تیری طاقت سے بڑی اور بھی ہے اک طاقت

جس نے برہمانڈ رچا، تُو نے کبھی سوچا ہے؟

مدراس ۱۹۵۹

چور بازار

ہر اُجالے کے پسِ پردہ اندھیرا ہے یہاں   شام جیسے ہو، سیہ پوش سویرا ہے یہاں

ہر خطرناک درندے کا بسیرا ہے یہاں   ہر دکاں دار حقیقت میں لٹیرا ہے یہاں

آگ دوزخ کی دہکتی ہے، بھڑکتی ہے مدام

روح انساں کی رذالت سے پھڑکتی ہے مدام

کوئی پُرساں نظر آتا نہیں نا داروں کا   چارہ گر کون بجز مرگ ہے بیماروں کا

ہر دکاں پر ہے اک انبوہ خریداروں کا   یہاں دیوالہ نکلتا ہے طلب گاروں کا

مُنہ ندامت ہی سے جیبوں کے اُتر جاتے ہیں

ولولے گھُٹ کے دلِ زار میں مر جاتے ہیں

کہیئے ، کیا چاہیئے، ہر چیز یہاں ہے موجود   ہو اگر دولتِ قاروں کی کھنکتی سی نمُود

جائیے، دام گھٹا نے کی ہے کوشش بے سود   چوکنا نفع کمائے نہ جو ہے وہ مردُود

اک دکاں دار خریدار کو سمجھاتا ہے

چور بازار میں آتا ہے جو لُٹ جاتا ہے

دہلی ۱۹٤۹

اشتراک

جابر ہو یا ہو مجبُور

قاہر ہو یا ہو مقہُور

قدرت کا ہے یہ دستُور

راجہ، پرجا سب مزدُور

یہ اوُنچے رنگیں ایوان

یہ سادہ کُٹیا کی شان

جس کو دیکھو ایک سمان

راجہ، پرجا سب مزدُور

دونو محنت کرتے ہیں

ہنستے، آہیں بھرتے ہیں

پیدا ہوتے مرتے ہیں

راجہ، پرجا سب مزدُور

دونو جیسے تیر کمان

دونو سے زندہ انسان

دونو مزدُوری کی شان

راجہ، پرجا سب مزدُور

دہلی ۱۹۵۱

سائے

رخِ گیتی پہ یہ منڈلاتے مچلتے سائے

چاہتے ہیں کہ اندھیروں کو اُگل دیں ہر سمت

نُور کی ایک کرن بھی کہیں آئے نہ نظر

ماند پڑ جائیں ستاروں کی یہ شمعیں ہرسمت

ایک سائے کی یہ خواہش ہے کہ قبضہ کر لے

دوسرے سائے کے پھیلائے ہوئے دامن پر

اور بڑھ جائے حدیں توڑ کے چاروں جانب

اُس کے قدموں میں ہوں سب کوہ و دمن،بحروبر

اِن میں سائے ہیں چھوٹے کہ نہیں ہیں گویا

جو بڑے سائے ہیں پا لیتے ہیں قابو بڑھ کر

چھوٹے سایوں پہ کہ چلتا نہیں کچھ بس اُن کا

اِنہیں سایوں کے تصادم سے جنم لیتا ہے

وہ اندھیرا جسے انساں کی قضا کہتے ہیں

شب کی چینخوں میں سُنائی نہیں دیتا کچھ بھی

ستم و جورکے لاوے میں سبھی بہتے ہیں

یہ بڑے، چھوٹے جو سائے ہیں اگر گھُل مِل جائیں

تیرگی ختم ہو، عالم بنے پھر بقعۂ نُور

ہر طرف صبح کی آمد کے فقط چرچے ہوں

اور بیدار ہو انسان میں ہستی کا شعوُر

مدراس ۱۹۵۳

ایشیَا

توڑ چُکا طلسمِ شب، جاگ اُٹھا ہے ایشیا

نُورِ سحر کے ساز پر نغمہ سرا ہے ایشیا

کس کی سمجھ میں آئے گا اِس کے سِوا غمِ جہاں

کرب واذ یّت آشنا خود بھی رہا ہے ایشیا

جلوۂ منزلِ حیات، دیدہ فروز دل فریب

امن و سکوں کی راہ میں آگے بڑھا ہے ایشیا

دل میں فسونِ عاشقی، سر میں جنونِ بندگی

عقدہ کشائے گردشِ ارض و سما ہے ایشیا

راہزنوں کے رُخ سے اب پردے تمام اُٹھ گئے

لوُٹا ہوا، لُٹا ہوا مِل تو گیا ہے ایشیا

مرگ و حیات کی حدیں ملتی ہیں آکے جس جگہ

ایسے ہی ایک موڑ پر آج کھڑا ہے ایشیا

غم کی گھٹائیں چَھٹ گئیں، نُورِ طرب ہے چار سُو

نِکھرا ہوا، دُھلا ہوا، سنورا ہوا ہے ایشیا

مدراس ۱۹۵۸

اے میرے خُدا

جہاں میں کر کے پیدا فکر رہتی ہے مِٹانے کی

یہ کیا تدبیر ہے مجبُوریوں کو آزمانے کی

تجھے کیوں بے کسوں پر رحم فرمانا نہیں آتا

کِسی گمراہ کو کیوں راہ پر لانا نہیں آتا

دعائیں جب دواؤں کی طرح ناکام رہ جائیں

ترے بندے یقیں تیرے کرم پر کِس طرح لائیں

اگر منظوُر تھا تجھ کو مجھے مغموم ہی رکھنا

تو بہتر تھا سرور و کیف سے محروم ہی رکھنا

موگا ۱۹٤۱

سالِ نَو

"آپ کو سال نو مبارک ہو"   "آپ کو بھی خدا کرے، حالات

سالِ نو کی نویدِ عشرت دیں"   یہی نو روز کی ہے رسمِ قدیم

سالِ رفتہ دلیلِ سالِ نَو   گردشِ صبح و شام رازِ حیات

انقلابات پردہ دارِ جمود   شورشوں میں سکوت ارزانی

سوچتا ہوں اسی طرح پیہم   سال جاتا ہے، سال آتا ہے

یونہیں شُبھ کامناؤں کے نغمے   رقص کرتے ہیں، مُسکراتے ہیں

تھا جو کل آج بھی وہی ہے سماں   اور جو آج ہے وہ کل ہوگا

آدمی کی مگر یہ خوش فہمی   کتنی دلچسپ و خوبصورت ہے

اک شعاعِ مسرّت آگئیں سے   زندگی جگمگانے لگتی ہے

اور پھر آنکھ کے جھپکتے ہی   گھُپ اندھیرا وہی جو پہلے تھا

ان گنت سالِ تازہ آئے ہیں   آرزوؤں کو گدُگدُاتے ہوئے

پھر چلے بھی گئے ہیں چُپ سادھے   جیسے بیگانہ، اجنبی، انجان

"آپ کو سالِ نَو مبارک ہو"   اِن دعاؤں میں کچھ اثر ہی نہیں

یہ اُمیدیں ہیں جاگتے کا خواب   وقت بہتا ہوا ہے اک دریا

کب کسی کا یہ ساتھ دیتا ہے

مدراس ۱۹۵۵

بھگوان کرشن

طلوُعِ مشرقِ گوکل سے اِک ستره ہوا

کہ جس کے جلوے سے ہر ذرّا ماه پارا ہوا

فروغِ ظلمتِ اندوه پڑ گیا مدھم

مسرّتوں سے چمکنے لگا رخِ آدم

چمن میں ختم ہوا دَور جبر و استبداد

رہا نہ برق کا کھٹکا، نہ خطرۂ صیّاد

مِلا پیامِ نشاطِ شگفتگی گلُ کو

مِلی نویدِ ترنّم زبانِ بلبل کو

فضائے دہر ہوئی ہمکنارِ ابرِ بہار

حیاتِ تازه ہوئی کائنات میں بیدار

دل و دماغ نے انساں کے پائی آزادی

نِکھر کے گوشۂ گوکل سے آئی آزادی

کِسی نے اُس کو تصوّر کیا خدا کا نُور

تمام عالمِ ہستی میں ظاہر و مستوُر

کِسی نے اُس کو غمِ زیست کی دوا سمجھا

کِسی نے کشتیِ انساں کا نا خدا سمجھا

کِسی نے اس کو محبّت کا دیوتا جانا

کِسی نے منزلِ ہستی کا رہنما جانا

کِسی نے مان لیا گوپیوں کا متوالا

کنارِ رودِ جمن راس کھیلنے والا

کِسی نے گوالوں کے ہمراه شاد ماں دیکھا

کِسی نے جنگ کے میداں میں کامراں دیکھا

غرض وہ سب کو نئے رُوپ میں نظر آیا
کہ آپ وشنُو بہ پیراہنِ بشر آیا

دلوں پہ سحر کیا بانسری کی تانوں سے
اُٹھائے دیدہ و دل سے حجاب غفلت کے
کچھ ایسا جھُوم کے گیتا کا ساز چھیڑ دیا
حیات و موت کا باطل طلسم ٹوٹ گیا
کہا کہ قوّتِ نوعِ بشر عمل ہی تو ہے
مآل و حاصلِ شام و سحر عمل ہی تو ہے
ہر ایک قلب کو غم آشنا کیا اُس نے
جو راہزن تھے اُنھیں رہنما کیا اُس نے
غرور و کبر و ریا کو دیا پیامِ شکست
مزاقِ جور و جفا کو دیا پیامِ شکست
زبانِ عام پر آہی گیا کلامِ "کرشن"
سرِ ہمالہ جھُکا بہرِ احترامِ "کرشن"
دلّی ۱۹٤۸

گرو نانک

جلوہ گر صحنِ گلستاں میں مہ کامل کی رات

در حقیقت اک شعاعِ حق "گرو نانک" کی ذات

زندگی کی ترجمانی اک نئے انداز سے

آسمانوں تک رسائی جرأتِ پرواز سے

امتیازِ خار و گل، چشمِ تماشا کا قصور

ظلمتِ شب مہرِعالم تاب کی وجہِ ظہور

آدمی اور آدمی میں فرق ذہنوں کا خلل

پیش خیمہ اِک حیاتِ نَو کا سامانِ اجل

جادۂ انسانیت میں ان گنت پیچ اور موڑ

مذہبِ انسانیت سارے مذاہب کا نِچوڑ

نیک بندوں پر ہمیشہ رحمت ایک اونکار کی

اپنوں، بیگانوں کی سیوا، خدمت ایک اونکار کی

دل میں بھگتی کی حرارت، آنکھ میں نُورِ حیات

اِک حقیقت، ایک سچّائی،"گرو نانک" کی بات

مدراس ۱۹۵۸

مُحمّد

اخلاق کی تعلیم ہے فرمانِ مُحمّد

توحید کا دریا مئے عرفانِ مُحمّد

ملتی ہے یہاں روح کی برنائی و تسکیں

ہے سایۂ حق، سایۂ دامانِ مُحمّد

دامِ ہوسِ دہر سے ہوتے ہیں جو آزاد

ملتا ہے انہیں منصفِ خاصانِ مُحمّد

گھٹتی گئی کوتاہیِ چشم و دلِ انساں

بڑھتی ہی گئی شوکتِ دیں شانِ مُحمّد

ہر نقشِ قدم اُن کا نشانِ رہِ منزل

سب قافلے والے ہیں شنا خوانِ مُحمّد

پردے ابھی آنکھوں پہ جہالت کے پڑے ہیں

پائے کوئی کیسے درِ فیضانِ مُحمّد

لکھی گئی دُنیا میں ضیا نُورِ یقیں سے

انسان کی تاریخ بہ عنوانِ مُحمّد

مدراس ۱۹۵۵

روشنی کا مینار

سر بسر انکسار تھا گاندھی   آدمی کا وقار تھا گاندھی

حق نما، حق شعا ر تھا گاندھی   حق کا آئینہ دار تھا گاندھی

فخرِ انسانیت، غرورِ حیات   نازشِ روز گارتھا گاندھی

نکہت و رنگ، نغمہ و آہنگ   گلستاں کی بہار تھا گاندھی

پی کے جامِ شراب حُبّ وطن   بیخود و ہوشیار تھا گاندھی

اپنی منزل پہ کارواں پہنچا   رہبرِ کامگار تھا گاندھی

جن کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا   اُن کا بھی غمگسار تھا گاندھی

حامیِ اتّحاد و یک جہتی   امن کا پاسدار تھا گاندھی

جان کردی نشار اہنسا پر   مردِ یزداں شکار تھا گاندھی

آدمی کی تباہ کاری پر   روز و شب اشک بار تھا گاندھی

محفلِ میکشانِ ہستی میں   باخبر، ہوشیار تھا گاندھی

اے ضیا ہولناک راتوں میں   روشنی کی مینار تھا گاندھی

دلّی ۱۹٤۹

دلِ جواں

ساقی وہ ترا بادۂ سر جوش کہاں ہے   دل میرا جواں ہے

ڈُوبا ہوا مستی میں سمن زارِ جہاں ہے   دل میرا جواں ہے

پھیلی ہوئی نغمات کی ہے گونج فضا میں   ارض اور سما میں

کُہسار سے گاتی ہوئی ندّی بھی رواں ہے   دل میرا جواں ہے

تاروں کی جھپکتی ہوئی آنکھوں میں ہے مستی   ہے وجد میں ہستی

ہر پھُول پہ اک ساغرِ صہبا کا گمُاں ہے   دل میرا جواں ہے

پُورب سے گھٹا جُھوم کے اُٹھّی ہے بصد ناز   ہے عشق سر افراز

بڑھ کر درِ جنّت سے درِ پیرِ مُغاں ہے   دل میرا جواں ہے

طوفاں سے لِپٹ جاؤں میں، سودا ہے یہ سر میں   کشتی ہے بھنور میں

اوجھل نگہِ شوق سے ساحل کا نشاں ہے   دل میرا جواں ہے

آگاہ جوانی ہے مقاماتِ جنوں سے   حالاتِ جنوں سے

مدہوش مسرّت ہے کبھی محوِ فُغاں ہے   دل میرا جواں ہے

بے بہرۂ آغاز ہوں، انجام سے بے فکر   اوہام سے بے فکر

ہے سُود کی اُمید نہ پروائے زیاں ہے   دل میرا جواں ہے

دریا متلاطم ہیں، گلستاں متبسّم   عالم مترنّم

اس آئینہ خانے میں نظر ہی تو زباں ہے   دل میرا جواں ہے

دلّی ۱۹٤۲

شکست

مجھ سے تم رُوٹھ کے گئی ہو کیوں　　ہجر کا داغ دے گئی ہو کیوں
یوں سکوں دل کا لے گئی ہو کیوں　　چاند کی سمت دیکھنا ہے گناہ
چاند کی سمت میں نہ دیکھوں گا

کیفِ جذبات میں کچھ ایسا بہا　　دین و دُنیا کا ہوش بھی نہ رہا
جو کہا بے خودی میں، جُھوٹ کہا　　چاند کی سمت دیکھنا ہے گناہ
چاند کی سمت میں نہ دیکھوں گا

چاند کو دیکھ کر ہوا میں تباہ　　کھو گئے رہنما و منزل و راہ
مٹ گئی میرے دل سے چاند کی چاہ　　چاند کی سمت دیکھنا ہے گناہ
چاند کی سمت میں نہ دیکھوں گا

دلِ مہجُور کو نہ تڑپاؤ　　میں پشیماں ہوں، مان بھی جاؤ
مُسکراتی ہوئی چلی آؤ　　چاند کی سمت دیکھنا ہے گناہ
چاند کی سمت میں نہ دیکھوں گا

لاہور ۱۹۳۵

تحریک

نگاہوں میں اندھیرا چھا گیا، لو اب تو آ جاؤ

دلِ درد آشنا گھبرا گیا، لو اب تو آ جاؤ

شکیب و صبر بھی دم توڑنے کو ہیں کوئی دم میں

غمِ فرقت بہت تڑپا گیا، لو اب تو آ جاؤ

ستاروں نے چمک پائی، ملی پھُولوں کو رعنائی

زمانہ رازِ اُلفت پا گیا، لو اب تو آ جاؤ

شبِ مہتاب، رنگ و بُو کا طوفاں، عالمِ وحشت

گیا وہ وقت واپس آ گیا، لو اب تو آ جاؤ

زمینِ باغ پر اُڑتا ہوا ابرِ جنوں پرور

شرابِ بے خودی برسا گیا، لو اب تو آ جاؤ

تمھارے حُسن کی ماہِ فلک کیا ہمسَری کرتا

نگاہیں جُھک گئیں، شرما گیا، لو اب تو آ جاؤ

غمِ امروز بھی باقی رہے کِس واسطے دل میں

غمِ ماضی، غمِ فردا گیا لو اب تو آ جاؤ

دلّی ۱۹۵۱

محبّت

کِیا بے ہوش کِس نے حضرتِ موسیٰ کو سینا پر

کِیا "ارجُن" کو کِس نے جنگ سے بے گانہ و مضطر

سِکھایا کِس نے "مجنوں" کو خرابِ در بدر ہونا

بتایا "کوہکن" کو کِس نے یُوں آشفتہ سر ہونا

کِیا "پرہلاد" کو مجبُور کِس نے جاں نثاری پر

"حقیقت" کو دیا درسِ فنا کِس نے عیاں ہو کر

فنا "منصُور" جِس پر ہو گیا آوازِ اُلفت تھی

چڑھایا دار پر جِس نے "مسیحا" کو محبّت تھی

امرتسر ۱۹۳۱

عالمِ شباب

محیط آسماں پہ ہیں وہ کالی کالی بدلیاں

کِھلے ہیں پھُول ہر طرف، مہک رہا ہے گلستاں

حسیں پھلوں کے بوجھ سے جھُکی ہوئی ہیں ڈالیاں

طیوُر کی زبان پر ہیں دل فریب بولیاں

دل و دماغ و روح پر مسرّتیں ہیں حُکمراں

برس رہی ہے چرخ سے مئے طرب، جنوں اثر

چٹک کے کہہ رہے ہیں گل کہ میکشی ہو بے خطر

کہیں یہ موسمِ حسیں لگا کے اُڑ نہ جائے پَر

بِکھر گئی ہیں عشرتیں، یہاں، وہاں، اِدھر اُدھر

مچل رہے ہیں ولولے، نشے میں غرق ہے نظر

چھُپی ہوئی ہیں جنّتیں فروغِ لالہ زار میں

مہ و کواکبِ فلک ہیں مستیِ خمار میں

بنی ہے جنّتِ نظر ہر ایک شے بہار میں

حیات آ گئی ہے پھر فریبِ اختیار میں

تمام کائنات ہے کسی کے انتظار میں

کسک سی ایک دل میں ہے، جھجھک سی اک نظر میں ہے

چمک چراغِ طور کی نگاہِ شوخ تر میں ہے

اُبھار ہے اُمنگ میں، اُمنگ دل، جگر میں ہے

شگفتگیِ گلُ نہاں شباب کی سحر میں ہے

بہار کی وہ کیفیت جو باغ میں ہے گھر میں ہے

یہ انقلابِ زندگی عجیب انقلاب ہے

یہ مستیِ نگاہ ہے کہ مستیِ شراب ہے

ہر ایک حُسن کی ادا، ادائے کامیاب ہے

سکوں کی آرزو بھی ہے، جنونِ اضطراب ہے

نہ ہوش ہے نہ بے خودی، یہ عالمِ شباب ہے

دلّی ۱۹٤۱

تیاگ

شیش محل سے راجکماری پریم کُٹی میں آئی

جنگل کی سنسان فضا نے لی اک مست انگڑائی

ڈالی ڈالی جھُوم اُٹھی، پتّی پتّی لہرائی

سُندر آشاؤں کی دُنیا ہردے میں مُسکائی

آنکھیں من موہن، مدھماتی، متوالی، دیوانی

سُندر پیشانی پر بل یوں جیسے ہو ابھیمانی

کندھوں پر گیسو لہراتے، مُکھ میں سُندربانی

جاگ اُٹھی کُٹیا کی قسمت دوُر ہوا اندھیارا

پھیل گیا کونے کونے میں درشن کا اُجیارا

جنگل میں منگل ہے جیسے کوئی نہیں دُکھیارا

پریم کُٹی کے ہر ذرّے پر چھائی ہے مدہوشی

ساقی کی آمد پر جیسے رندوں کی مے نوشی

دل میں اک جذبات کا طوفاں ہونٹوں پر خاموشی

کیونکر استقبال کروں میں کون سے نغمے گاؤں

اور تو کچھ بھی پاس نہیں ہے جیون بھینٹ چڑھاؤں

میں تو خود ہوں پریم بھکاری، پریم کی بھکشا پاؤں

شیش محل کا، پریم کٹی کا سارا بھید مٹاؤں

ایسے عالم میں کھو جاؤں، محو اِتنا ہو جاؤں

شیش محل سے راجکماری پریم کُٹی میں آئی

دلّی ۱۹٤۲

دوُر بینی

اک شعرِ سراپا کی طرف دیکھ رہا ہوں

اک موجۂ صہبا کی طرف دیکھ رہا ہوں

اُلفت کے کلیسا کی طرف دیکھ رہا ہوں

فردوسِ تمنّا کی طرف دیکھ رہا ہوں

میں دوُر سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

پُر نُور جوانی کی طرف دیکھ رہا ہوں

مسرُور جوانی کی طرف دیکھ رہا ہوں

مخمور جوانی کی ترف دیکھ رہا ہوں

مغرور جوانی کی طرف دیکھ رہا ہوں

میں دوُر سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

جنّت کی بہاروں کا سماں دیکھ رہا ہوں

ڈوُبا ہوا مستی میں جہاں دیکھ رہا ہوں

تسنیم کی اک موجِ رواں دیکھ رہا ہوں

معصوم سا اک حُسنِ جواں دیکھ رہا ہوں

میں دوُر سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

ہر سمت مسرّت ہی نظر آتی ہے مجھ کو

ہر بات حقیقت ہی نظر آتی ہے مجھ کو

ہر شے میں محبّت ہی نظر آتی ہے مجھ کو

دُنیا بھی تو جنّت ہی نظر آتی ہے مجھ کو

میں دُور سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

چھائی ہوئی گردوں پہ ہیں گھنگھور گھٹائیں

بوندوں سے گلے مِل کے ہیں مدہوش ہوائیں

آتی ہیں کہیں دُور سے گانے کی صدائیں

جذبات کے ہیجان میں رقصاں ہیں فضائیں

میں دُور سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

طاری ہے مری روح پہ اک عالمِ مستی

بےساغر و مینا ہے مری بادہ پرستی

اک لمحۂ رنگیں ہے یہی حاصلِ ہستی

نزدیک کے جلووں کو نہیں آنکھ ترستی

میں دُور سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

دلّی ۱۹٤۱

انجُمستاں

تارے چمک رہے ہیں، شمعیں سی جل رہی ہیں

یا ظلمتوں کی حوُریں موتی اُگل رہی ہیں

یا اُڑ کے آسماں پر پہنچے ہوئے ہیں جگنو

یا پھُول روشنی کے بکھرے ہوئے ہیں ہر سوُ

یاد کی یاد

جذبات کی طوفانی موجیں جب دل پر یورش کرتی ہیں
رنگین بہاروں کی کلیاں جب کِھلتی اور نِکھرتی ہیں
جب چاند کی روشن کرنوں سے زلفیں راتوں کی سنورتی ہیں
تم یاد مجھے آ جاتی ہو سپنوں کے گیت سناتی ہو

جب گیت سہانے اُلفت کے مدہوش جوانی گاتی ہے
جب کالی گھٹا اُفتاں خیزاں گردُوں پر شور مچاتی ہے
جب بادِ بہاری کی تھپکی سوتے فتنوں کو جگاتی ہے
تم یاد مجھے آ جاتی ہو ماضی کو واپس لاتی ہو

جب راگ الاپا کرتی ہے جاموں کی کھنک میخانوں میں
جب ہوش کی باتیں ہوتی ہیں خوش ہو ہو کر دیوانوں میں
جب ہلچل پیدا ہوتی ہے اُمیدوں میں، ارمانوں میں
تم یاد مجھے آ جاتی ہو آغوشِ جنوں گرماتی ہو

جب لمبی تیرہ راتوں میں سنّاٹے مہماں ہوتے ہیں

جب خوابوں کے دلکش پردے ہرسمت غزلخواں ہوتے ہیں

جب دوشِ جوانی پرگیسو اُلفت کے پریشاں ہوتے ہیں

تم یاد مجھے آ جاتی ہو دل کی دھڑکن بن جاتی ہو

میں پا کے تمھیں کھو دیتا ہوں، تم کھو کے مجھے پا جاتی ہو

میری تخّیل کے گلشن پر بدلی بن کر چھا جاتی ہو

پیغام جوانی کا لے کر تم یاد مجھے آ جاتی ہو

تم یاد مجھے آ جاتی ہو پہلو میں آگ لگاتی ہو

تم نے یہ کہاں سے سیکھا ہے انداز قیامت ڈھانے کا

کیا حال تمہیں معلوم نہیں غم کے مارے دیوانے کا

دلسوز بھی ہے، دلچسپ بھی ہے عنوان مرے افسانے کا

تم یاد مجھے آ جاتی ہو بہکاتی ہو، تڑپاتی ہو

تم یاد مجھے آ جاتی ہو، بیتے دِن واپس آتے ہیں

تم یاد مجھے آ جاتی ہو، ارمان مچلتے، گاتے ہیں ہیں

تم یاد مجھے آ جاتی ہو، جذبے دل کو گرماتے ہیں

رگ رگ میں لہو دوڑاتی ہو تم یاد مجھے آ جاتی ہو

دلّی ۱۹۵۰

حُسنِ آمد

وہ اٹھلاتی ہوئی آئی، وہ بل کھاتی ہوئی آئی

لُٹاتی مستیاں، پیمانے چھلکاتی ہوئی آئی

لچکتی، جھُومتی، محشر کو ٹھُکراتی ہوئی آئی

بصد انداز آئی، برق لہراتی ہوئی آئی

مہکتی، جِھلمِلاتی، ناچتی، گاتی ہوئی آئی

نسیمِ صبح کی مانند اِتراتی ہوئی آئی

ادا و ناز و شوخی، مُسکراہٹ، بانکپن، جوبن

ہزاروں بجلیاں محفل میں چمکاتی ہوئی آئی

شباب و شعر کی تکمیل کا اک پیکرِ رنگیں

خیال و ذہنِ شاعر پر ستم ڈھاتی ہوئی آئی

سحر کی تازگی میں نو شگفتہ پھُول کی صورت

چمن والوں میں ہنستی اور اِتراتی ہوئی آئی

سیہ گیسو، جبیں روشن، نظر تیکھی، لبِ لعلیں

ہزاروں تیر اہلِ دل پہ برساتی ہوئی آئی

نقوشِ پا سے لاکھوں گل کترتی راہِ اُلفت میں

لجاتی، مُسکراتی، نُور برساتی ہوئی آئی

لئے گنگ و جمن اپنی نشیلی، مست آنکھوں میں

گھٹا بنکر دماغ و رُوح پر چھاتی ہوئی آئی

دلوں میں حشرِ احساسات برپا کیوں نہ ہو جاتا

رگوں میں زندگی کی برق دوڑاتی ہوئی آئی

دلّی ۱۹۳۹

اے مِرے ہمالہ

غیر بن جائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

یوں ستم ڈھائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

تیری آغوش میں تھا میرا سکونِ خاطر

دل کو تڑپائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

سربلندی پہ تِری ناز بہت تھا مجھ کو

آہ جُھک جائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

برف زاروں سے ترے آتی تھی جنّت کی ہوا

آگ برسائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

بجلیاں جن سے مِرے امن کے خرمن پہ گریں

راگ وہ گائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

پاسباں بن کے مِرا خُود ہی مِرے دشمن کو

راہ دِکھلائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

مجھ سے پیمانِ وفا باندھ رہا تھا لیکن

یوں بدل جائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

تیری پُر کیف و جنوں بار فضاؤں کی قسم

خون رُلوائے گا تُو یہ مجھے معلوم نہ تھا

دلّی ۱۹٦۲

میرا وطن

میرا وطن سارے جہاں سے بے نظیر و بہترین

میرے وطن کا آسمانوں میں کوئی شانی نہیں

میرا وطن پیغمبروں کی دیوتاؤں کی زمیں

میرا وطن ہندوستاں

میرے وطن کے باغ میں کیا آئے گئ بادِ خزاں

میرے وطن کے باغ کا پرماتما ہے باغباں

میرے وطن کا باغ ہے عکسِ رُخِ باغِ جناں

میرا وطن ہندوستاں

میرے وطن کی صبح ہے آئینۂ صبحِ حیات

میرے وطن کی دوپہر تنویرِ حُسنِ کائنات

میرے وطن کی شام میں پوشیدہ ہے رازِ نجات

میرا وطن ہندوستاں

میرے وطن کی چاندنی راتیں ہیں الہام آفریں

میرے وطن کے دن ہیں اسرار و حقائق کے امیں

میرے وطن میں مادِیّت رُوح پر حاوی نہیں

میرا وطن ہندوستاں

میرے وطن کے کھیت سارے سال رہتے ہیں ہرے

میرے وطن کے کُل شجر پھُولوں پھلوں سے ہیں لدے

میرے وطن کی ندّیاں کوشر کو دامن میں لئے

میرا وطن ہندوستاں

دلّی ۱۹۳۷

شہید

موت جان آفریں شہیدوں کی　　رشکِ جنّت زمیں شہیدوں کی

عرش اِک شہ نشیں شہیدوں کی　　حرص ممکن نہیں شہیدوں کی

اِن کے مرنے سے قوم زندہ ہے

خون اِن کا بقادہندہ ہے

درِ فردوس کھولے جاتے ہیں　　اِن کی آمد فرشتے گاتے ہیں

کام اِن کے جو یاد آتے ہیں　　قوم کو جوش سا دلاتے ہیں

ایسے مرنے کو سب ترستے ہیں

اِن پہ رحمت کے گلُ برستے ہیں

امرتسر ۱۹۳۱

تین آوازیں، تین دَور

پہلی آواز:-

اُجڑا ہوا گھر آباد ہوگا　　آباد ہوگا، دل شاد ہوگا
دل شاد ہوگا، آزاد ہوگا　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

غنچے کھِلیں گے سہنِ چمن میں　　سازِ مسرّت گونجے گا بن میں
ہوگی مئے نَو جامِ کُہن میں　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

مسرُور ہوں گے گنگ و جمن پھر　　آئے گا لطفِ سیرِ چمن پھر
آزاد ہوگا میرا وطن پھر　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

دل میں اُمنگیں پیدا کروں گا　　ہنگامۂ نَو برپا کروں گا
انسانیت کو اُونچا کروں گا　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

نکہت کے فتنے جب دُور ہوں گے　　آپس کے جھگڑے سب دُور ہوں گے
ہاں دُور ہوں گے اب دُور ہوں گے　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

زرخیز میداں، امرت کے دریا　　یہ "تاجِ عرفح" یہ "لال قلعا"
اِن سب کو اب میں اپنا کہوں گا　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

گلُ اور لالہ سر کو اُٹھا لیں　　مسجد، شوالہ سر کو اُٹھا لیں
وِندھ ، ہمالہ سر کو اُٹھا لیں　　میرا وطن پھر آزاد ہوگا

دوسری آواز:-

صدیوں کی غلامی کے بندھن ٹوٹے ہم پھر آزاد ہوئے

تقدیر ہماری جاگ اُٹھی، آباد ہوئے، دل شاد ہوئے

جانیں دے کر، دولت کھو کر ہم نے آزادی پائی ہے

اب نصب العین ہمارا بس اس جھنڈے کی اُونچائی ہے

اندوہ کے سائے دُور ہوئے، عشرت کی کرنیں رقصاں ہیں

آزادی ہم پر نازاں ہے، ہم آزادی پر نازاں ہیں

دیوی کو منا لائے ہیں ہم، دیوی نہ یہاں سے جائے گی

دُنیا کی جو قوّت ہم سے ٹکّر لے گی، پچھتائے گی

وہ اپنا پرایا کوئی ہو، یہ سُن لے اب آزاد ہیں ہم

یہ رنجِ اسیرری کیا معانی، مسرُور ہیں ہم، آزاد ہیں ہم

تیسری آواز:-

(۱)

شاد ہے آباد ہے میرے وطن کی سر زمیں

کیا کہوں پھر بھی مرے دل کو سکوں حاصل نہیں

ولولے سوئے ہوئے، خاموش اُمنگوں کے رباب

زندگی پر یاس کی تیرہ گھٹاؤں کا شباب

ذہن میں اُجڑے گھروں کی داستانیں نوحہ خواں

ہر قدم، ہر موڑ پر اک آزمائش، امتحاں

خوشنما صدیوں کی پروردہ غلامی کا خمار

دامن آزادی کی دیوی کا ہے اب تک تار تار

آہ دیوِا شتہا سے ہر بشر سہما ہوا

زندگی سے ڈر رہا ہے موت سے کھیلا ہوا

قحط ، رشوت، چوربازاری، سر و سامانِ زیست

روز و شب کی نالہ و زاری سر و سامانِ زیست

موت ہیبتناک سائے ہر طرف ڈالے ہوئے

زندگی کے تیرہ گوشے اور بھی کالے ہوئے

یہ بلائیں ہیں تو میں آزاد خود کو کیا کہوں

خانماں برباد ہوں، آباد خود کو کیا کہوں

(۲)

جو کل تک ظلمتیں تھیں، آج بھی طاری دِلوں پر ہیں

یہ غم کے پرورده لمحے عمر کے، بھاری دِلوں پر ہیں

نمی آنکھوں میں اشکِ یاس کی دیکھی نہیں جاتی

جنوں پرور خلش احساس کی دیکھی نہیں جاتی

نشانِ منزلِ اصلی نظر آتا نہیں اب تک

خیالِ خانہ ویرانی یہ کیوں جاتا نہیں اب تک

چُھپا بیٹھا ہے رہزن آج بھی رہبر کے پردے میں

سکونِ دل میسّر ہے نہ نالے میں نہ نغمے میں

وہی پابندیاں، مجبوریاں ہیں آج، جو کل تھیں

وہی محرومیاں، مہجوریاں ہیں آج، جو کل تھیں

گلوں میں رنگ و نکہت کی کمی محسوس ہوتی ہے

بہارِ باغ میں اک تشنگی محسوس ہوتی ہے

دلّی ۱۹٤۵ تا ۱۹٦۲

جنگِ آزادی کے بے نام شہید

اے شہیدانِ وطن، اے جاں نشارانِ وطن

ہے تمھارے خون سے رنگین دامانِ وطن

شمعِ آزادی کے تم پروانۂ جاں باز تھے

جو عبارت سوز سے ہے وہ نوائے ساز تھے

جاگتے، ہُشیار ذہنوں میں جو تھی تصویرِ خواب

اک صدی کے بعد آخر بن گئی تعبیرِ خواب

آج صحنِ گلستاں میں رقص کرتی ہے بہار

ذرّہ ذرّہ، پتّا پتّا شاد کام و کامگار

آج ہم آزاد ہیں، آباد ہیں، دلشاد ہیں

جو سبق تم نے دئے تھے ہم کو اک اک یاد ہیں

ہم تمہارے جذبۂ اشیار کے قائل ہیں آج

چھا کے رہ جائیں زمانے بھر پہ اس قابل ہیں آج

گو تمھارے نام سے اچھّی طرح واقف نہیں

خود بخود دل میں اُبھر آئی ہے اک یادِ حزیں

ہم اُسی یادِ حزیں کے نُورِ ظلمت پاش میں

دیکھتے ہیں رُوئے فردا کی جھلک آکاش میں

تم کہیں بھی ہو تمھارے کام کو حاصل دوام

اے شہیددوں کی مقدّس، پاک رُوحو! لو سلام

مدراس ۱۹۵۷

یومِ آزادی

خون کی آہوتی دے کر قومیں آزادی پاتی ہیں

قوموں کے ایشار سے زنداں کی دیواریں گر جاتی ہیں

راز یہ ہم نے اب پایا ہے

آزادی کا دن آیا ہے

ختم ہوئی صدیوں کی مسافت، آخر منزل آ ہی گئی

دل سے دعا جو نکلی تھی وہ گوشِ خدا تک جا ہی گئی

قسمت نے پلٹا کھایا ہے

آزادی کا دن آیا ہے

جھومیں گیت خوشی کے گائیں، ناچیں، دُنیا ناچ رہی ہے

اپنا روزِعید یہی ہے، دیوالی کی رات یہی ہے

کیف نگاہوں پر چھایا ہے

آزادی کا دن آیا ہے

گاندھی، بوس، پٹیل، جواہر، راجندر، آزاد کی جے ہو

بھارت کی آگوش میں جتنے مذہب ہیں سب کی اک لے ہو

بس یہ ہمارا سرمایہ ہے

آزادی کا دن آیا ہے

مسجد میں دئیں آج اذانیں، مندر میں گھڑیال بجائیں

ہندو مسلم دونو مل کر ہندوستاں کی شان بڑھائیں

پریم کا سندیسہ لایا ہے

آزادی کا دن آیا ہے

کوہِ ہمالہ کی چوٹی پر ہم نے اب لہرایا جھنڈا

جب تک اپنے دم میں دم ہے اُونچا ہوگا اپنا جھنڈا

ہم پر جھنڈے کا سایا ہے

آزادی کا دن آیا ہے

دلّی ۱۹٤۷

آزادی کے دس برس

آزادی کے دس برسوں میں اپنے قدم آگے ہی بڑھے ہیں

اپنی کوشش، اپنی ہمّت ہی سے ہم پروان چڑھے ہیں

آزادی کے دس برسوں میں سیکھ لیا ہے ہم نے جینا

طوفانوں سے ٹکر لیتا آ پہنچا ساحل پہ سفینا

آزادی کے دس برسوں میں ہم نے اُونچا خود کو اُٹھایا

دریاؤں پر قابو پا کر دھرتی کو شاداب بنایا

آزادی کے دس برسوں میں دُنیا ہم کو جان گئی ہے

امن کے حامی، صلح کے جویا ہم ہیں، یہ پہچان گئی ہے

آزادی کے دس برسوں میں بُھوکے رہ کر، ننگے رہ کر

منزل کی حد چُھو لی ہم نے راہوں کی ہر ٹھوکر سہہ کر

آزادی کے دس برسوں میں پھُول کھلے، کلیاں مُسکائیں

کانٹے ہولی کھیل چُکے، باغوں کی بہاریں واپس آئیں

آزادی کے دس برسوں میں نُور کی باتیں، نار کی باتیں

بیگانوں کے جورکے چرچے، اپنوں کے ایثار کی باتیں

آزادی کے دس برسوں میں نکھرا ہے بھارت کا مُکھڑا

پھر بھی آ جاتا ہے ضیا کے لب پر ٹوٹے دل کا دُکھڑا

مدراس ۱۹۵۷

پریورتن

اندھیارے کے بعد اُجالا روشن رُوپ دِکھائے

دُکھ کی کالی رین کٹے تو سُکھ کا دِن آ جائے

نیل گگن سے مدھ ماتی بدلی مدرا برسائے

برہن کے مرگ نینن میں آس اپنی جوت جگائے

بیٹھا ایک منڈیر پہ کاگا "کا کا " شور مچائے

ہولے ہولے پگڈنڈی پر راہی پاؤں بڑھائے

ہریالی کی سُندر دیوی کھیتوں میں مُسکائے

امبر ناچے، دھرتی جھُومے، گیت جوانی گائے

پنگھٹ کی گوری گگری سے امرت جل چھلکائے

دھیمی دھیمی بہتی ندی لہرائے، بل کھائے

پیار کی باتیں، پریت کی گھاتیں سمجھے اور سمجھائے

ساجن کے سواگت کو سجنی چلی کمر لچکائے

ختم ہوئیں بپتا کی گھڑیاں، سُکھ کے لمحے آئے

جالندھر ۱۹۵۷

دیپاولی

دیپ جلے، دیوالی آئی

باغوں میں ہریالی چھائی

جوتیں روشن محفل محفل

پروانوں نے پائی منزل

مہکی بگیا، پھیلی خوشبُو،

کالی رین میں چمکے جُگنُو

تانیں گونجیں، دُنیا ناچی

لیلیٰ جُھومی، رادھا ناچی

ہر چہرے پر سُکھ کا اُجالا

ہر سینے میں پریم کی جوالا

در چمکے، دیواریں چمکیں

سگوں کی جھنکاریں چمکیں

دل نے لی اک مست انگڑائی

ارمانوں کی پھر بن آئی

مار کے راون کو رام آئے

اندھیارا اب سر نہ اُٹھائے

سچّائی کی جیت ہوئی پھر

جاری پریت کی ریت ہوئی پھر

دلّی ۱۹٦۰

بِرھن

تارے تو دیں تعنے مجھکو، چندر مجھے تڑپائے

رین برہ کی سائیں سائیں کرکے روز ڈرائے

بالم ہیں پردیس سکھی ری، نیند نہ مجھ کو آئے

پھُولوں سے بھونرا کرتا ہے میٹھی میٹھی باتیں

دِن میرے ہیں سُونے سُونے، اُجڑی اُجڑی راتیں

بالم ہیں پردیس سکھی ری، نیند نہ مجھ کو آئے

مجھ سے پوچھ بتاؤں تجھ کو بِرہن کیا ہے سجنی

سانجھ سویرے چین نہ آئے، سُلگے من میں اگنی

بالم ہیں پردیس سکھی ری، جیون بیتا جائے

دلی — ۱۹٤۰

اُلجھن

مایا جال میں پھنس کر دُنیا بُھولی پریم کہانی

اُلٹی گنگا بہتی ہے اب اگیانی ہے گیانی

کِس سے کہوں میں من کا دُکھڑا کون سُنے یہ باتیں

کون سُنے یہ باتیں سجنی، کون سُنے یہ باتیں

سُندر سپنے دیکھ رہے ہیں سُورج، چاند، سِتارے

مست ہیں اپنی اپنی دُھن میں دھرتی کے متوارے

اپنے اپنے دِن ہیں سب کے، اپنی اپنی راتیں

دِن ہیں جیسے راتیں سجنی، کون سُنے یہ باتیں

چھیڑوں میں کیونکر اپنے من کے وہ تار جو ٹُوٹے

جن کو بنایا جیون ساتھی وہ بھی مجھ سے چُھوٹے

ہاری میں نے پریم کی بازی، کھائیں میں نے ماتیں

میرے بھاگ میں ماتیں سجنی، کون سُنے یہ باتیں

کون سُنے اور کِس کو سُناؤں میں جو کہنا چاہوں

چُپکے چُپکے ہی سارے دُکھ درد یہ سہنا چاہوں

روتے روتے آنکھیں آئیں، کیسی ہیں برساتیں

ساون کی برساتیں سجنی، کون سُنے یہ باتیں

کویل کوُکے اور پپیہا پی پی شور مچائے

بھونرا گوُنجے اور پتنگا چُپکے سے مر جائے

مر کر جینا، جی کر مرنا، سچّے پریم کی باتیں

سچّی من کی باتیں سجنی، کون سُنے یہ باتیں

دلّی ــ ۱۹٤۲

پُکار

آئی گھٹا ساون کی گاتی دھرتی پر امرت برسَاتی

من میں آشائیں مُسکاتی آشاؤں میں تم مُسکاؤ

بالم آ بھی جاؤ

سکھیاں جُھولا جھُول رہی ہیں پریم نشے میں پھُول رہی ہیں

جیون کا غم بھُول رہی ہیں اور نہ اب مجھ کو تڑپاؤ

بالم آ بھی جاؤ

کب تک دیکھوں باٹ تمہاری دو دِن کا جینا ہے بھاری

میں تو ایسے پریم سے ہاری میری ہار کو جیت بناؤ

بالم آ بھی جاؤ

دیکھ رہی ہوں سُندر سپنے میٹھے میٹھے، پیارے پیارے

روشن روشن، ننّھے ننّھے اِن تاروں کو توڑ کے لاؤ

بالم آ بھی جاؤ

جب سے پریم کا روگ لگایا پل بھر بھی آرام نہ آیا

دُکھ نے بدلی میری کایا کوئی سُکھ کا گیت سُناؤ

بالم آ بھی جاؤ

دلّی ــ ١٩٤٤

مایا

دھرم، گیان کو کھوکر مُورکھ پاپ، موہ کو پایا

کیوں مایا کے پھیر میں آ کر اپنا رُوپ گنوایا

اپنا رُوپ گنوایا بابا جھُوٹی جگ کی مایا

دو دِن کے جیون پر کیوں اِتراتا ہے ابھیمانی

آج ہے جو بھی کل وہ نہ ہوگا، سوچ ذرا اگیانی

چلتی پھرتی چھایا بابا جُھوٹی جگ کی مایا

دیکھ کے سُندر رُوپ کو اِس کے، جو اِس پر مرتا ہے

یہ اُس کو ہی ڈس لیتی ہے، وہ آہیں بھرتا ہے

ہوش نہ تجھ کو آیا بابا جُھوٹی جگ کی مایا

پھُول کو لینے ہاتھ بڑھائے تو کانٹا چُبھ جائے

جو جیسی کرنی کرتا ہے، ویسا ہی پھل پائے

لاکھ تجھے سمجھایا بابا جھُوٹی جگ کی مایا

جاگ اُٹھے سب سونے والے، تُو بھی جاگ اب پیارے

توڑ دے اندھیاروں سے رشتہ، کیوں پھیلیں اندھیارے

جُھوٹی جگ کی مایا بابا جُھوٹی جگ کی مایا

دلّی ــ ۱۹۳۸

دَریچے سے

میں نے دیکھا ہے دَریچے سے کئی بار تجھے،
تیری نوخیز جوانی کے حسیں جلووں سے
میری آوارہ نگاہوں نے خیالوں میں مرے
جال مو ہوم سے خوابوں کے بنے ہیں صَدہا،

یہ شب و روز کا اِک سلسلہ لامتناہی
زندگی اِن میں بھٹکتی ہے مسلسل پیہم ---
کیا کوئی منزلِ مقصود نہیں ہے اِس کی؟
اُڑتی، پر مارتی، آزاد فضا میں رُوحیں
جِسم کی قید کو کرتی ہیں گوارا کیوں کر؟
ٹوٹ ہی جاتا ہے معصوم امنگوں کا طلِسم،
کشمکش زیست کی بن جاتی ہے بُغض اور حسد،
مکر کا نام یہاں رکھّا ہے انسانیّت ---

اینٹ چونے کی نظر آتی ہیں جو دیواریں
اوٹ میں اِن کی گنُاہوں کے لگے ہیں انبار
---- وہ گنُہ جن کے تصوّر سے ہے لرزاں ابلیس !
خود کو دھوکا یونہیں رہ رہ کے دیئے جاتا ہے

خود غرض، اہلِ ہوس کا وہ جفا کار گروہ

جسے کہتے ہیں سماج

رہنمائی کی جگہ راہزنی پر مائل

اِس کے قانون و اصول – ابنِ آدم کے لئے ایک فریبِ عظیم –

درمیاں میرے تِرے دوست جو حائل ہے خلیج

جِسمِ خاکی کو ہم آغوش نہ ہونے دے گی

سوچتا ہوں کہ یہ لمحاتِ حسینِ ہستی

کیا یونہیں فکر و تردّ د میں گزر جائینگے؟

کیا تجھے دیکھ سکوں گا میں دریچے سے مُدام؟

اینٹ چونے کی یہ دیوار ---- یہ مکرُوہ سماج!

دلّی – ۱۹٤۳

نِروان

میں آج منزلِ مقصود پا کے دم لوں گا
یہ دشت و کوہ و بیاباں و خارزار، کوئی
خلل نہ ڈال سکے گا مِرے ارادوں میں ---
مِرے ارادے ہیں مضبوط سنگ و آہن سے
ہراس و خوف سے میں دل کو کر چکا ہوں پاک
بُھلا چُکا ہوں میں ماضی کی کوششِ ناکام ---
قدم جو آگے بڑھا ہے وہ رُک نہیں سکتا
میں آج منزلِ مقصود پا کے دم لوں گا -،

یہ کس نے چھیڑ دیا سازِ عشرتِ فردا ؟
یہ میری روح کو تڑپا دیا ہے پھر کِس نے ؟
سرور و کیف سے پھر جُھک گئیں مِری آنکھیں
دماغ و ذہن پہ ابرِ خمار چھایا ہے
حسین خوابوں کی دُنیا میں کھو گیا ہوں میں ---

نویدِ عشرتِ فردا نہ دے مجھے اے دل !
کہ تیرے نغموں سے آتی ہے پاؤں میں لغزش
مجھے تو حال میں رہنا ہے، زندگی ہے یہی،
حدیثِ جنّت و حُور و ملک درست – مگر
سُنوں میں تیرے فسانے کہاں مجھے فرصت
ابھی تو منزل مقصود دوُر ہے میری ----

بچھے ہوئے ہیں ہر اِک سمت راہ میں کانٹے

جو آ رہے ہیں نظر پھُول چشمِ ظاہر کو،

فریبِ عشرتِ فردا نہ دے مجھے اے دل !

فریب کاریٔ دُنیا ہے مجھ پر آئینہ

یہاں تو نُور بھی کھویا ہوا ہے ظلمت میں،

میں اِس چمن میں رہوں مجھ سے ہو نہیں سکتا

بجائے جذبۂ اُلفت ہے دل میں اب نفرت،

نشانِ منزلِ مقصود مل گیا مجھ کو

میں آج منزلِ مقصود پا کے دم لوں گا -----!

دلّی - ۱۹٤۱

جنگ کے بعد

حیوانی پیاس بُجھانے کو

دُنیا کی مہذّب قوموں نے فردا کے سنہری خوابوں میں

عصمت پر امن کی دیوی کی ڈاکہ ڈالا اور لوُٹ لیا

انسانیت کو دفن کیا زندہ لاشوں کے ڈھیروں میں

تعمیر کے موڑ پہ سائنس کو تخریب کی راہ پہ ڈال دیا

دُنیا کی مہذّب قوموں نے

تہذیب کا یہ حاصل تو نہ تھا

سائنس کا یہ مصرف تو نہ تھا

انسان بھی حیواں کی صورت آپس میں لڑیں،

خاک و خوں سے ہولی کھیلیں ------

لیکن ایسا بھی ہوتا ہے،

ایسا ہی ہوتا آیا ہے،

کل کو بھی ایسا ہی ہوگا، ---------

جنگ اور جدل سے قوموں کی تقدیر بدل ہی جاتی ہے،

بہتی ہوئی خون کی ندّی میں تحریر بدل ہی جاتی ہے،
پھر دل میں زندہ رہنے کی قوّت اِک کروٹ لیتی ہے
انسانیّت، حیوانیّت اپنی قربانی دیتی ہے،

جو ہار گیا وہ ملزم ہے، مجرم ہے، سزا کے قابل ہے،
آنے والی نسلوں کے لئے
اس کا مٹ جانا دُنیا سے ہے امنِ دوامی کا ضامِن،
جیتی ہوئی قوموں کو ملتی ہے امن کی دیوی --- آزادی

وہ امن ہو یا ہو آزادی طاقت سے حاصِل ہوتی ہے
شاید اب بھی انسانیّت اپنی قسمت کو روتی ہے –

دلّی ــ ۱۹٤٥

پس منظر

مجھے بیتے ہوئے ایّام پھر کیوں یاد آئے ہیں

محبّت کے وہ لمحے ---- ہاں وہی لمحے

جنھیں زرّیں سمجھتے ہیں جہاں والے -----

مگر جن کے تصّور سے لرز جاتا ہے دل میرا،

محبّت کے وہ ہیبتناک لمحے ---- موت کے لمحے،

گھٹائیں اُ ڑکے آتی ہیں کہاں سے آسمانوں پر،

ٹپکتے ہیں خوشی کے اشک تاروں کی نگاہوں سے،

نکھرتا ہے چمن، غنچے چٹک کر پھُول بنتے ہیں،

فضاؤں میں مہک جاتے ہیں نغمے آبشاروں کے –

وہ نغمے جو دلِ ویراں کو میرے گدگداتے ہیں

سما جاتے ہیں میری رُوح کے آئینہ خانے میں، -

اُبھر آتے ہیں دُھندلے نقش یادِ عہدِ رفتہ کے ستانے کے لئے مجھ کو،

مرے ساقی، درِ رنگیں پہ تیرے سر بسجدہ ہونے آیا ہوں،

سُنا ہے آتشِ سیّال تیرے پاس ایسی ہے

جلا کر دم زدن میں راکھ کر دیتی ہے جو افکارِ ہستی کو، -

یہ دوش و حال و فردا اک فریبِ عقلِ انساں کے سوا کیا ہے ؟

وہ دن جو واپس آتے ہی نہیں دُنیائے فانی میں –

مجھے کیوں یاد آئیں --- یاد آ کر دل کو تڑپائیں ؟ دلّی – ۱۹٤۰

خواب اور خواب

(ہٹلر)

میں بنوں سردار اپنی قوم کا اور ہو ممتاز میری قوم سب اقوام میں،

میرے دشمن اصل میں دشمن ہیں میری قوم کے

سب سے پہلے میں کروں اُن کو سپُردِ نیستی،

یوں کروں ہموار اپنی راہ میں،

خوف و ہیبت سے دلوں کو جیت لوں،

دیوتاؤں کی طرح پُوجیں مجھے افرادِ قوم،

ہو زمیں و آسماں میں ذکر عظمت کا مِری،

پھر اُٹھوں میں ساری دُنیا پر حکومت کے لئے

چھوٹے چھوٹے پتّھروں کو روندتا، دَوڑتا جاؤں بلندی کی طرف

اور ٹکّر لوں پہاڑی آہنی دیوار سے،

قوم کے ہر فرد کو کر دوں نثار –

خون کے ساگر میں لاش انسانیت کی ڈوب جائے !؟

(گاندھی)

میں بنوں اک فرد اپنی قوم کا
اور ہو ممتاز میری قوم سب اقوام میں،
دوست، دشمن کو میں اپناؤں سلوک و جذب سے،
دوں محبّت کا سبق، جینے کا درس،
زندگی دراصل ہے آزادیٔ فکر و عمل،
شخصیت کے توڑ دوں بُتہائے ہیبت آفریں،
جذبۂ انسانیت انگڑائی لے کر جاگ اُٹھے،
تذکرے عظمت کے میری قوم کی
پھیلتے جائیں جہاں تک آدمی کا ہے گزر
ظلمتیں کھو جائیں، پیدا نُور ہو،
منزلِ مقصود کی ہموار راہ
ہو نظر کے سامنے ---------
دوسری اقوامِ عالم خود بخود مجبور ہوں
میرے نقشِ پا پہ چلنے کے لئے !!

دلّی ــ ۱۹٤۹

طُوفان

اُٹھا طوفاں -------

گرجتے بادلوں نے آسماں پر کر لیا قبضہ ،

چمکتی بجلیوں میں چُھپ گیا جلوہ ستاروں کا،

نظر آتا نہیں مہتاب کا تابندہ چہرہ بھی،----

قریب و دُور ہر جانب اندھیرا ہی اندھیرا ہے

بہت تاریک ہے ماحول گردابِ حوادش کا،

ہوائیں چینختی ہیں اور موجیں تلملاتی ہیں،

سکوں دھوکا ہے، ہستی اِک مسلسل کشمکش کا نامِ شانی ہے-

کہاں ہے نا خدا اس کا؟

بہی جاتی ہے کشتی خود بخود موجوں کے دامن میں

کبھی پانی کی چادر میں یہ چُھپ جاتی ہے نظروں سے

کبھی یہ پھر اُبھر آتی ہے سطحِ آب پر، --------- گویا

اثر اِس پر نہیں ہوتا ہے طوفانی تھپیڑوں کا،

------- بہی جاتی ہے کشتی خود بخود موجوں کے دامن میں –

کہیں ساحِل بھی ہے یا رب ؟

لئے جاتی ہیں کشتی کو بہا کر کس طرف موجیں

شبِ تاریک میں ------ ظالم اندھیرے میں، ------

کبھی وہ وقت آ جائے گا جب خورشید بھی مشرق سے اُبھرے گا

نویدِ دَورِ نَو لے کر

کٹیں گے بندِ مجبوری، -------   دلی – ۱۹۳۸

انگڑائی

گدُگدُی دل میں ہوئی،

ولولے جاگ اُٹھے،

آرزوؤں کے شگوفے پُھوٹے،

اُفقِ یاس سے پیدا ہوئی امید کی بے تاب کرن،

شبنمستانِ تمنّا میں ہر اک سمت اُجالا پھیلا،

کھول دی دیر سے سوئے ہوئے جذبات نے آنکھ

خرمنِ دل میں پھر اِک آگ سی بھڑکی، چمکی،

اِک تڑپ، ایک شرار ------

اِس پہ ہے انجمنِ دہر کی گرمی کا مدار،

خون رگ رگ میں رواں،

اِس سے حرکت میں ہے عالم کا نظام !

دلّی — ۱۹٤۸

سوچ

میں یہاں بیٹھی ہوں تنہا اور اداس

سوچ کے دَریا میں ہوں ڈوبی ہوئی

کاش تم ہوتے یہاں میرے قریب !

تم بھی کیا تنہا ہو میری ہی طرح

یا تمھارے پاس کوئی دوسری لڑکی ہے اب !

تم اگر ہوتے یہاں میرے قریب

اور کوئی بھی نہ ہوتا آس پاس -------

میں تمھارے رُخ پہ لہراتی ہوئی

دیکھتی رنگین جذبوں کی بہار ، ----

کیا کبھی تم نے بھی چاہا ہے یہی ؟

دلی ــ ١٩٤٤

نظر سے پردۂ حائل اُٹھا لیتا تو کیا ہوتا

جو نا محرم کو تُو اپنا بنا لیتا تو کیا ہوتا

دلِ نا داں خرد کا آسرا لیتا تو کیا ہوتا

تِرے جلووں میں کھو کر خود کو پا لیتا تو کیا ہوتا

جو آنکھیں انتظارِ جلوہ میں آتش بداماں تھیں

دو آنسو میں اُن آنکھوں سے بہا لیتا تو کیا ہوتا

مجھے میرا دلِ با مدّعا منزل پہ لے آیا

جو میں تیرا دلِ بے مدّعا لیتا تو کیا ہوتا

جو کل مایوسیاں، نا کامیاں تھیں، آج بھی وہ ہیں

میں اپنے حوصلوں کو آزما لیتا تو کیا ہوتا

عنادل نغمہ آرا، خندہ زن گل، رنگ و بو رقصاں

اگر کچھ دیر میں بھی مُسکرا لیتا تو کیا ہوتا

سحر کی منزلِ پُر نُور سے بھٹکا ہوا راہی

اندھیری رات میں شمعیں جلا لیتا تو کیا ہوتا

ہزاروں پیچ و خم ہر گام پر تھے راہِ ہستی میں

محبّت کو نہ میں رہبر بنا لیتا تو کیا ہوتا

مِلا ہی کیا ضیا دیر و حرم کی جبہّ سائی سے

درِ میخانہ پر میں سر جُھکا لیتا تو کیا ہوتا

مدراس ــ ۱۹۵۸

بہار تمہید ہے خزاں کی بہار لے کر میں کیا کروں گا

قرار تو نام موت کا ہے قرار لے کر میں کیا کروں گا

تمھارے وعدے، تمھارے پیماں، تمھارے قول و قرار، لیکن

یہ دو دِلوں کا ہے نقد سودا، اُدھار لے کر میں کیا کروں گا

وہی ہے پژمُردگی گلوُں پر، وہی عنادِل کے لب پہ نالے

بہار اگر نام ہے اِسی کا، بہار لے کر میں کیا کروں گا

نسیمِ صبحِ چمن تجھے کچھ خبر بھی ہے اُن کی بے رُخی کی

گلوں میں بُو باس ہی نہیں ہے، یہ ہار لے کر میں کیا کروں گا

مجھے محبّت کا سوز دے دو، یہ ایٹموں کا جلال لے لو

حرارتِ خوں کی آرزو ہے، شرار لے کر میں کیا کروں گا

مجھے محبّت ہے اُس عدُو سے، جسے عداوت سے دُشمنی ہے

جسے محبّت سے ہے عداوت، وہ یار لے کر میں کیا کروں گا

طویل راتوں کی ظلمتوں میں ضیا میں اکثر یہ سوچتا ہوں

گراں ہے بارِ غمِ محبّت، یہ بار لے کر میں کیا کروں گا

مدراس ــ ۱۹۵۹

سمجھ میں چارہ گر کی آئے گا کیا

مِرا غم کیا، مِرے غم کی دوا کیا

فریبِ زیست کھائے جا رہے ہیں

حقیقت آشنا، نا آشنا کیا

مجھے دھوکا دیا میری نظر نے

کروں تجھ سے شکاتات کیا، گلا کیا

کِسی کی یاد سے دل ڈر رہا ہے

خدا جانے اِسے یہ ہو گیا کیا

سمیٹو رات کے پُر ہول سائے

سحر آ ہی گئی اب سوچنا کیا

محبّت نے لگا دی آگ دل میں

اشاروں میں کسی نے کہہ دیا کیا

جو جینا ہے تو جینے کی طرح جی

بھروسہ زندگی میں موت کا کیا

دِلوں کی راہ میں سب کچھ روا ہے

ضیا تیری وفا، اُن کی جفا کیا

مدراس ــ ۱۹۵٦

آنکھ سے آنسوُ ڈھلکا ہوتا

تو پھر سُورج اُبھرا ہوتا

کہتے کہتے غم کا فسانہ

کٹتی رات، سویرا ہوتا

کشتی کیوں ساحل پر ڈوُبی

موجیں ہوتیں، دریا ہوتا

جو گرجا پیاسی دھرتی پر

کاش وہ بادل برسا ہوتا

پھُولوں میں چُھپنے والے کو

کانٹوں میں بھی ڈھونڈا ہوتا

تجھ کو پانا سہل نہیں ہے

سہل جو ہوتا تو کیا ہوتا

اپنے سو بیگانے ہوتے

ایک یگانہ اپنا ہوتا

پوچھ ضیا یہ اہلِ دل سے

پیار نہ ہوتا تو کیا ہوتا

دلّی ــ ۱۹٤۹

انجام مِری بے تابی کا اے گردشِ دوراں کیا ہوگا

یہ عالم، حشر کا عالم ہے، تسکین کا ساماں کیا ہوگا

اب زنداں کی دیواروں پر سُورج کی کرنیں رقصاں ہیں

زنجیریں سوچا کرتی تھیں، اِس گھر میں چراغاں کیا ہوگا

امیدِ عمل اُس دل سے ہے جو درد و محن کی شدّت میں

تقدیر سے پوچھا کرتا ہے تدبیر کا عنواں کیا ہوگا

اے ذوقِ طلب، اے پاسِ وفا، اے لذّتِ غم، اے مجبوری

سمجھا نہ جسے دل نے اب تک، اُس درد کا درماں کیا ہوگا

آؤ تو ذرا یہ پوچھ ہی لیں ہر روز بدلتی قدروں سے

انساں نہ ملے گا جب کوئی، وہ عالمِ انساں کیا ہوگا

دریائے جنوں میں دل ہر دم ہچکولے کھاتا رہتا ہے

کشتی نہ ابھی تک ڈوُب سکی، اے موجۂ طوفاں کیا ہوگا

اشعارِ ضیا تم تو سُن لو، کہتے ہیں جو اُن کو کہنے دو

اِس شعر و سخن کی محفل میں اب کوئی غزلخواں کیا ہوگا

مدراس ــ ١٩٥٤

مِری دُنیا ہے ویرانوں کی دُنیا

تِری دُنیا، گلستانوں کی دُنیا

خیال اُن کا رفیقِ شامِ فرقت

منوّر ہے شبستانوں کی دُنیا

مِری ریندی، مِری مستی کا حاصل

تِری آنکھوں کے پیمانوں کی دُنیا

فلک کو اِک نہ اِک دِن چھُو ہی لے گی

بہت دانا ہے نادانوں کی دُنیا

کِسی کی کم نگاہی نے اُجاڑی

بسائی تھی جو ارمانوں کی دُنیا

سکوں کا ایک لمحہ ڈھُونڈتی ہے

پریشانوں، پشیمانوں کی دُنیا

لہو ارزاں، گراں نانِ جویں ہے

کہاں ہے یہ تن آسانوں کی دُنیا

مِری فکروں میں ہستی کارفرما

مِرے شعروں میں انسانوں کی دُنیا

سجی بیٹھی ہے شب کی انجمن میں

چراغوں اور پروانوں کی دُنیا

یہ کِس کافر نے چھیڑا سازِ مستی

لرز جائے نہ ایمانوں کی دُنیا

ضیا کیا راس آتی غمزدوں کو

یہ خوابوں اور افسانوں کی دُنیا

مدراس ۔۱۹۵۳

بہکی بہکی ہیں، نگاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

کھوئی کھوئی سی ہیں، راہوں کو نہ جانے کیا ہوا

دل کی رگ رگ میں رواں تھا جن سے خونِ زندگی

اُن تمنّاؤں کو، چاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

نا مکّمل تھا فسانہ دہر کا جن کے بغیر

اُن گداؤں، بادشاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

آسماں سے واپس آئیں، دل میں گھُٹ کر رہ گئیں

کیا بتاؤں، میری آہوں کو نہ جانے کیا ہوا

معبدِ ہستی میں تھا جن کو عبُودیّت پہ ناز

اُن جبینوں، سَجدہ گاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

بن گئی ہیں دَورِ ساغر بزمِ رنداں میں ضیا

اُن کی شرمیلی نگاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

دلّی ــ ۱۹٤۹

شبِ غم ہے مِری تاریک بہت

ہو نہ ہو صبح ہے نزدیک بہت

اُن سے میں دوُر ہوا، خوُب ہوا

آ گئے وہ مِرے نزدیک بہت

غمِ جاناں مِرے دل سے نہ گیا

کی غمِ دہر نے تحریک بہت

مل گئی مَر کے حیاتِ جاوید

تیرے بیمار ہوئے ٹھیک بہت

کم سے کم حُسن کی رُسوائی میں

تھی غمِ عشق کی تضحیک بہت

رہ نوردانِ جنوں بیٹھ گئے

منزلِ شوق تھی نزدیک بہت

اے ضیا ہم کو درِ ساقی سے

کم سہی پھر بھی مِلی بھیک بہت

سیلم ــ ۱۹۵۷

غموں سے دو عالم کے گھبرا گئے ہم

پلٹ کر درِ یار پر آ گئے ہم

نہ جادہ، نہ منزل، نہ رہبر، نہ رہزن

تجھے ڈھونڈتے یہ کہاں آ گئے ہم

زمانے پہ چھائے ہیں طوفان بن کر

وہ آنسو جو آنکھوں سے برسا گئے ہم

تڑپنا ہمارا بڑے کام کا تھا

تِرے غم میں، دُنیا کو تڑپا گئے ہم

وہاں بن گیا معبدِ عشق اے دل

رہِ غم میں ٹھوکر جہاں کھا گئے ہم

نہ جنّت، نہ دوزخ، نہ ہے دین و دنیا

بتا اے محبّت کہاں آ گئے ہم

گلوں ہی سے رغبت نہ کانٹوں سے نفرت

تِرے در سے کیا ہو کے رُسوا گئے ہم

بیانِ غمِ دل تو دُشوار تھا ہی

مگر بے زبانی سے سمجھا گئے ہم

عجب دائرہ ہے محبّت کی دُنیا

چلے تھے جہاں سے وہیں آ گئے ہم

جو دل کھو دیا ہے اُسے ڈھونڈنا کیا

اشارہ تِری آنکھ کا پا گئے ہم

فضائیں معطّر، ہوائیں غزلخواں

ضیا میکدے کے قریب آ گئے ہم

تماشا ہے سب کچھہ، مگر کچھ نہیں

سوائے فریبِ نظر کچھ نہیں

زمانہ یہ ہے رقصِ ذرّات کا

حکایاتِ شمس و قمر کچھ نہیں

ستاروں سے آگے مِری منزلیں

بلا سے اگر بال و پر کچھ نہیں

محبّت کی یہ محویت، کیا کہوں

وہ آئے تو اپنی خبر کچھ نہیں

مِرا شوقِ منزل ہے شابت قدم

کوئی رہزن و راہبر کچھ نہیں

محبّت ہے انسان کی آبرو

بغیرِ محبّت بشر کچھ نہیں

ضیا تو مریضِ غمِ عشق ہے

علاج اِس کا اے چارہ گر کچھ نہیں

مدراس ــ ۱۹۵۳

ختم عہدِ قیصر و فغفُور کی باتیں کریں

دَورِ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں

کیوں نہ بڑھ کر چھین لیں ساقی سے مینا و سبُو

رندِ سرکش، میکشِ مغرور کی باتیں کریں

حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج

دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں

دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہالائیں گے ہم

خونِ دہقاں، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

زہر جس کا در پئے تخریبِ انساں ہے ہنوز

سینۂ گیتی کے اُس نا سُور کی باتیں کریں

ہم نے کرنی ہے مرّتب داستانِ حُسن و عشق

صبحِ دلّی، شامِ نیشاپور کی باتیں کریں

آؤ شمعِ آگہی روشن کریں دل میں ضیا

اور اُن کے جلوۂ مستُور کی باتیں کریں

مدراس ــ ۱۹۵٦

نکہت و رنگ ہیں شریک فطرتِ لالہ زار میں

کون کرے خزاں کی فکر انجمنِ بہار میں

ذکر جب اُن کا آ گیا دل سے نکل گئی اِک آہ

ہے تو خطا، مگر نہ تھی یہ مِرے اختیار میں

درد، دوا فروش ہے، ناز نیاز مند ہے

عشق کا انتظار ہے، حُسن ہے انتظار میں

اُن کو جفا کی فکر تھی، ہم کو وفا کا پاس تھا

کِس کو سکونِ دل ملا گردشِ روز گار میں ؟

جذبۂ عشق کی قسم، دیدہ و دل ہیں باغ باغ

رقصِ جمال و حُسن ہے، دشت میں کوہسار میں

دل کو ہجومِ یاس نے رات دیا عجب فریب

زور حیات پر نہیں، موت ہے اختیار میں

منزلِ شوق خود مجھے بڑھ کے پکار لے ضیا

یار کا نقش پا لئے بیٹھا ہوں رہگزار میں

دلّی ــ ۱۹۳۸

کیا کیا پیام غمکدۂ دل سے آئے ہیں

ہم نا مُراد حُسن کی محفل سے آئے ہیں

زنجیر گل گئی، درِ زنداں بھی کھُل گئے

پیغام کیا بہار کی منزل سے آئے ہیں

ہے لذّتِ فراق، حیاتِ دلِ حزیں

ہم آپ اُٹھ کے یار کی محفل سے آئے ہیں

فردا کی فکر، حال کا غم، اضطرابِ شوق

دیوانے تنگ دہر کی محفل سے آئے ہیں

دے تو چُکے تھے پاؤں جواب اے ضیا مگر

منزل تک اپنے حوصلۂ دل سے آئے ہیں

مدراس ــ ۱۹۵٦

جذبۂ عشق ہے کامراں

درد دل میں، زباں پرفغاں

مشکلیں، آفتیں، حادثے

اور تنہا دلِ نا تواں

حشرِ تازہ اُٹھے گا کوئی

حُسن سے عشق ہے بد گمُاں

پھر چمن میں بہار آ گئی

پھر ہوئے زخمِ دل خونچکاں

رُک گئی گردشِ روز و شب

کِس نے چھیڑی مِری داستاں

اُن کے ماتھے پہ دِن کی دمک

رات کا گیسوؤں میں سماں

مِل ہی جائے گی منزل کہیں

جادہ پیما رہے کارواں

ہمدمِ غم، شریکِ الم

یہ زمیں اور وہ آسماں

کہہ سکا میں نہ وہ سُن سکے

غم میں ڈوُبی ہوئی داستاں

دُشمنی کو ضیا مِل گئی

سایۂ دوستی میں اماں

مدراس ــ ۱۹۵۸

کبھی خلوت کے افسانے کبھی محفل کی باتیں ہیں

اِنہیں کیا عقل سمجھے گی، یہ میرے دل کی باتیں ہیں

اندھیرے محفلِ ہستی کے کیا مجھ کو ڈرائیں گے

منوّر تیرے جلووں سے دماغ و دل کی باتیں ہیں

یہ گردش روز و شب کی، یہ کشاکش شادی و غم کی

سکونِ دل کہاں، نا حق سکونِ دل کی باتیں ہیں

خدا جانے امیرِ کارواں کے دل پہ کیا گزری

نہ وہ راہوں کے قصّے ہیں، نہ وہ منزل کی باتیں ہیں

محبّت، آرزو، آنسو، تبسّم، حوصلہ، کوشش

فرشتے کچھ نہ سمجھیں گے، یہ مُشتِ گل کی باتیں ہیں

رِہ پُر خار و بادِ تُند و ہیبت ناک خاموشی

دلِ ناداں، یہی تو قُربتِ منزل کی باتیں ہیں

ضیا یہ نا خدا بھی ہے کوئی بگڑا ہوا شاعر

جہاں ذکرِ تلاطم ہے، وہاں ساحل کی باتیں ہیں

مدراس — ۱۹۵۷

سُہانا سا زمانا چاہتا ہوں

جنوں کے گیت گانا چاہتا ہوں

نئے رہرو، نئی منزل، نیا دل

نئی راہیں دکھانا چاہتا ہوں

جُھکاتا ہوں سر اپنا تیرے در پر

سرِ گردوں جُھکانا چاہتا ہوں

اُٹھو کم ضو چراغوں کو بُجھا دو

نئی شمعیں جلانا چاہتا ہوں

مجھے اب تم نئی لے میں پُکارو

فریب اک اور کھانا چاہتا ہوں

میں احساں نا خدا کا کیا اُٹھاؤں

خدا کو آزمانا چاہتا ہوں

ضیا جی بھر کے رویا ہوں شبِ غم

سحر ہے، مُسکرانا چاہتا ہوں

مدراس ــ ۱۹۵۵

جنوں پہ عقل کا سایہ ہے دیکھئیے کیا ہو

ہوس نے عشق کو گھیرا ہے دیکھئیے کیا ہو

گئی بہار مگر آج بھی بہار کی یاد

دلِ حزیں کا سہارا ہے دیکھئیے کیا ہو

خموش شمعِ محبّت ہے، پھر بھی حُسن کی ضَو

گلوں سے تابہ ثریّا ہے دیکھئیے کیا ہو

شبِ فراق کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں

خدا کو میں نے پُکارا ہے دیکھئیے کیا ہو

وہی جفاؤں کا عالم، وہی ہے مشقِ ستم

وہی وفا کا تقاضا ہے دیکھئیے کیا ہو

غمِ بتاں میں کٹی عمر اور اب دل کو

شکایتِ غمِ دُنیا ہے دیکھئیے کیا ہو

ہزار بار ہی دیکھا ہے سوچنے کا مآل

ہزار بار ہی سوچا ہے "دیکھئیے کیا ہو"

مِرا شباب، تِرا حُسن اور سایۂ ابر

شراب و شعرِ مہیا ہے دیکھئیے کیا ہو

ضیا جو پی کے نہ بہکا وہ رندِ مستی کوش

پئے بغیر بہکتا ہے دیکھئیے کیا ہو

مدراس ــ ۱۹۵۸

صبح نے روشن تیر چلائے

شب کا درپن ٹوُٹا جائے

مجھ کو مِلا وہ دیوانہ دل

اشکوں سے جو آگ لگائے

ماتھے پر بیندی کا سورج

آنکھوں میں کاجل کے سائے

بادل جھُومے نیل گگن پر

گوری نے گیسو لہرائے

آؤ دل کی کلیاں چٹکیں

جیون کی بگیا مُسکائے

کوئی لگائے آگ دِلوں میں

کوئی دِلوں کی آگ بُجھائے

حُسن قیامت ڈھانے نکلا

آنچل کا پرچم لہرائے

کیا پریتم آنے والے ہیں

کاگا توُ کیوں شور مچائے

اُس انساں کا جینا ہی کیا

جو انساں کے کام نہ آئے

ہر ذرّے میں سورج روشن

دھرتی سے آکاش لجّائے

کِس نے چھیڑا گیت ضیا کا

پیار کا ساگر اُمڑا آئے

مدراس ــ ۱۹۵۳

گو آج اندھیرا ہے، کل ہوگا چراغاں بھی

تخریب میں شامل ہے تعمیر کا ساماں بھی

مظہر تِرے جلووں کے، مامن مِری وحشت کے

کوُہسار و گلستاں بھی، صحرا و بیاباں بھی

دم توڑتی موجیں کیا ساحل کا پتا دیں گی

ٹھہری ہوئی کشتی ہے، خاموش ہے طوفاں بھی

مجبورِ غمِ دُنیا، دل سے تو کوئی پُوچھے

احساس کی رگ میں ہے خارِ غمِ جاناں بھی

بُغض و حسد و نفرت، ناکامی و محرُومی

انسانوں کی بستی میں کیا ہے کوئی انساں بھی ؟

دیوانۂ الفت کو در سے تِرے ملتا ہے

ہر زخم کا مرہم بھی، ہر درد کا درماں بھی

لیتی ہے جب انگڑائی بیدار کرن کوئی

ہوتا ہے ضیا خود ہی رقصاں بھی، غزل خواں بھی

مدراس ــ ۱۹۵٤

فرشتے امتحانِ بندگی میں ہم سے کم نِکلے

مگر اِک جُرم کی پاداش میں جنّت سے ہم نِکلے

غمِ دُنیا و دیں اُن کو نہ فکرِ نیک و بد اُن کو

محبّت کرنے والے بے نیازِ بیش و کم نِکلے

غرض کعبہ سے تھی جن کو نہ تھا مطلب کلیسا سے

حدِ دیر و حرم سے بھی وہ آگے دو قدم نِکلے

سحر کی منزلِ روشن پہ جا پہنچے وہ دیوانے

شبِ تاریک میں جو نُور کا لے کر عَلم نِکلے

مہ و خوشید بن کر آسمانوں پر ہوئے روشن

دو آنسو وہ مِری آنکھوں سے جو شامِ اَلم نِکلے

سکوتِ شب میں ہم نے ایک رنگیں خواب دیکھا تھا

مسرّت جاوداں ہوگی اگر تعبیرِ غم نِکلے

نہ ملتی ہوں شرابِ زندگی کی تلخیاں جن میں

سُنا یہ ہے ضیا کے دل سے ایسے شعر کم نِکلے

مدراس — ۱۹۵۷

حُسن ہے، محبّت ہے،موسمِ بہاراں ہے

کائنات رقصاں ہے، زندگی غزلخواں ہے

عشرتوں کے متلاشی غم سے کیوں گریزاں ہے

تیرگی کے پردے میں روشنی کا ساماں ہے

گیت ہیں، جوانی ہے، ابر ہے، بہاریں ہیں

مضطرب اِدھر میں ہوں تُو اُدھر پریشاں ہے

دھُوپ ہو کہ بارش ہو تُو ہے مونس و ہمدم

مجھ پہ یہ تِرا احساں، اے غمِ فراواں، ہے

رند بخلِ ساقی پر کس قدر تھے کل برہم

میکدہ ہے آج اپنا اور تنگ داماں ہے

اُف دورنگیٔ دُنیا، اُف تضاد کا عَالم

کُفر کے اُجالے ہیں، تیرگیٔ ایماں ہے

بے نقاب دیکھا تھا خواب میں اُنھیں اِک شب

آج تک نگاہوں میں اے ضیا چراغاں ہے

دلّی ــ ۱۹۵۰

صورت اُمید بر آنے کی نظر آتی ہے

دوُر ہو اے شبِ ظلمت کہ سحر آتی ہے

جسے مِل جائے تِرا نقشِ کفِ پا اے دوست

اُس کی ٹھوکر میں تو ہر راہ گزر آتی ہے

اُسے لے اڑتے ہیں یارانِ خرد کیا کہیے

عالمِ بے خبری میں جو خبر آتی ہے

ہآئے یہ کشمکشِ زیست، یہ افکارِ جہاں

آ نہ سکتی تھی تِری یاد، مگر آتی ہے

متبسّم، مترنّم لبِ لعلیں کی قسم

چاندنی شب کدۂ زیست میں در آتی ہے

شبِ تاریک کے سہمے ہوئے سنّاٹے میں

کیوں ہنسی مجھ کو بہ اندازِ دگر آتی ہے

اے ضیا شعر کا اِس طور سے ہوتا ہے نزول

عرش سے جیسے کوئی حوُر اُتر آتی ہے

مدراس ــ ۱۹۵۷

خود سری کا بھرم نہ کُھل جائے

آدمی کا بھرم نہ کُھل جائے

تیرگی کا طلِسم ٹوُٹ گیا

روشنی کا بھرم نہ کُھل جائے

موت کا راز فاش تو کر دوں

زندگی کا بھرم نہ کُھل جائے

حُسن مختار اور دل مجبور

عاشقی کا بھرم نہ کُھل جائے

کون دیوانگی کو دے الزام

آگہی کا بھرم نہ کُھل جائے

کیجئے رہبروں کا کیا شکوہ

گمرہی کا بھرم نہ کُھل جائے

امتحانِ وفا درست، مگر

جور ہی کا بھرم نہ کُھل جائے

اے مغنی، غزل ضیا کی نہ چھیڑ

شاعری کا بھرم نہ کُھل جائے

مدراس ــ ۱۹۵٤

دُنیا مِری نظر سے تجھے دیکھتی رہی

پھر میرے دیکھنے میں بتا کیا کمی رہی

کیا غم اگر قرار و سکوں کی کمی رہی

خوش ہوں کہ کامیاب مِری زندگی رہی

اِک درد تھا جگر میں جو اُٹھتا رہا مُدام

اُک آگ تھی کہ دل میں برابر لگی رہی

دامن دریدہ، لب پہ فغاں، آنکھ خونچکاں

گر کر تِری نظر سے مِری بے کسی رہی

آئی بہار، جام چلے، مے لُٹی مگر

جو تشنگی تھی مجھ کو وہی تشنگی رہی

کھوئی ہوئی تھی تیری تجلّی میں کائنات

پھر بھی مِری نگاہ تجھے ڈھونڈتی رہی

جلتی رہیں اُمید کی شمعیں تمام رات

مایوس دل میں کچھ تو ضیا روشنی رہی

مدراس ــ ۱۹۵۷

آنکھ میں آنسوُ لب پر نالے

کیسے ہیں یہ چاہنے والے !

پریتم کا سندیسہ لے کر

گِھر آئے ہیں بادل کالے

ہم کو لے آئے منزل تک

راہ کے کانٹے، پاؤں کے چھالے

نُور سحر کا چھین ہی لیں گے

ظلمتِ شب سے لڑنے والے

کون بنے بے گانہ اُن کا

کون آنکھوں میں آنکھیں ڈالے

بانہیں جیسے گُل کی شاخیں

آنکھیں جیسے مدھ کے پیالے

اہلِ ساحل دیکھ رہے تھے

ڈوُب گئے جب ڈوُبنے والے

فیضانِ غم عام ضیا ہے

اپنی بِگڑی توُ بھی بنا لے

دلّی — ۱۹۶۱

مِرے جنوں میں، مِری وفا میں خلوص کی جب کمی ملے گی

چمن گرفتِ خزاں میں ہوگا- بہار اُجڑی ہوئی ملے گی

جواں ہے ہمّت، ہے عزم محکم، نظر اُٹھائیں تو اہلِ دانش

الم کی تاریک اُفق پہ روشن شعاعِ اُمید بھی ملے گی

تصّور اُس ماہرو کا ہوگا کبھی تو دل میں ضیا بدامن

کبھی تو ظلمت کدے میں ہم کو کِھلی ہوئی چاندنی ملے گی

مِرا پتا پوُچھ کر نہ توڑوسکوت میرا، جمود میرا

بلند محلوں میں رہنے والو، کہاں مِری جھونپڑی ملے گی

یہ کور چشمی کا ہے تماشا کہ ظلمتوں کی تہیں جمی ہیں

نظر سے پردہ ہٹا کے دیکھیں یہاں وہاں روشنی ملے گی

روایتی پیکرِ غزل میں بھرا ہے رنگِ جدید میں نے

ضیا مِرے شعر میں مہیا کوئی نئی بات ہی ملے گی

دلّی ــ ۱۹٤۹

موجِ جذبات میں جو بہہ نہ سکے

اُن سے وہ دل کا حال کہہ نہ سکے

حالِ دل کہہ دیا اشاروں میں

چُپ رہے اور چُپ بھی رہ نہ سکے

کہہ دیا اُن سے جو نہ کہنا تھا

اور کہنا جو تھا وہ کہہ نہ سکے

رنگ و بُو سے گُلوں کی تھی ترکیب

رنگ و بُو کے بغیر رہ نہ سکے

زندگی کے ہزار وار سہے

موت کا ایک وار سہہ نہ سکے

وہ بھی کیا قُربتِ محبّت تھی

دُور رہ کر بھی دُور رہ نہ سکے

اپنی رُوداد کہہ رہا تھا جہاں

ہم ہی اپنی زباں سے کہہ نہ سکے

اے ضیا دن کو دن وہ کیا کہتے

رات کو رات بھی جو کہہ نہ سکے

مدراس ــ ۱۹۵۹

لب پر دل کی بات نہ آئی

واپس بیتی رات نہ آئی

خشک ہوئی رو رو کر آنکھیں

مدھ ماتی برسات نہ آئی

میری شب کی تاریکی میں

تاروں کی سوغات نہ آئی

میخانے کی مست فضا بھی

راس مجھے ہیہات نہ آئی

دل تو اُمڑا، رو نہ سکا میں

چھائی گھٹا، برسات نہ آئی

میرا چاند نکلنے کو تھا

شام سے پہلے رات نہ آئی

جس پر محفل لُٹ جاتی ہے

تجھ کو ضیا وہ بات نہ آئی

مدراس — ۱۹۵۳

نالۂ نارسا نہیں کچھ بھی

اب مجھے آسرا نہیں کچھ بھی

پُوچھتے ہیں وہ، "کیا نہیں کچھ بھی"

کیا کہوں، حوصلہ نہیں کچھ بھی

ہو وفا یا جفا، محبّت میں

ابتدا، انتہا نہیں کچھ بھی

میں ہوں، کشتی ہے، موجِ طوفاں ہے

ساحل، اے ناخدا، نہیں کچھ بھی

روز کرتے ہیں یوں جفا مجھ پر

جیسے میری وفا نہیں کچھ بھی

گفتۂ عقل کچھ تو ہے ورنہ

جو جنوں نے کہا نہیں کچھ بھی

کٹ گئی عمر پائے ساقی پر

تلخیوں کا گلا نہیں کچھ بھی

ہو مِری خامشی پہ چین بجبیں

ابھی میں نے کہا نہیں کچھ بھی

آزمائش اگر جفا سے نہ ہو

امتحانِ وفا نہیں کچھ بھی

میری دُنیا میں کیوں سوائے اجل

زندگی کا صلا نہیں کچھ بھی

وادئ غم میں لا کے چھوڑ دیا

اب کُھلا، رہنما نہیں کچھ بھی

اے ضیا اِن بتوں کے عشق میں کیوں

ناروا و روا نہیں کچھ بھی

مدراس ــ ۱۹۵۹

شاعرِ رنگ و نور ہوں، حُسن سے مجھ کو کام ہے

پُھول ہیں مجھ سے ہم سخن، چاند بھی ہمکلام ہے

در پہ ہوں تیرے سجدہ ریز، بس یہی اب تو کام ہے

میری یہی نماز ہے، میرا یہی سلام ہے

دل جو نہیں تو غم نہیں، غم جو نہیں تو کچھ نہیں

زیست مجھے وبال ہے، موت مجھے حرام ہے

چاند بھی کہہ کے چُھپ گیا، شمع بھی کہہ کے بُجھ گئی

حُسنِ ازل کی داستاں قصّۂ ناتمام ہے

آتا ہے روزِ ہجر بھی تیرگیاں بِکھیرتا

ہوتا ہے یہ مجھے گمُاں، ظلمتِ شب دوام ہے

دَورِ خزاں کہ فصلِ گل، شامِ الم کہ صبحِ کیف

کِس کو یہاں شبات ہے، کس کو یہاں قیام ہے

ناز تو ہے مجھے ضیا اپنے کلام پر مگر

اہلِ سخن کی بزم میں میرا کوئی مقام ہے ؟

لاہور ــ ١٩٣٤

غمِ انجامِ شادمانی سے

دل ہراساں ہے کامرانی سے

نکہت و رنگِ گل کو نسبت ہے

میرے غم سے، تِری جوانی سے

کاروبارِ ہوس چلا کیا کیا

جنسِ اخلاص کی گرانی سے

ہُوا ہموار جادۂ منزل

پائے ہمّت کی سخت جانی سے

سوز بھی اشکِ غم میں شامل ہے

آگ کا میل اور پانی سے !

کیوں مِرا دل دھڑکنے لگتا ہے

قیس و فرہاد کی کہانی سے

سیکھ لی بُلبُلوں نے نغمہ گری

اے ضیا میری خوش بیانی سے

دلی — ۱۹٦۰

یاس و ناکامی کا اِک دن انجام یہی تو ہونا ہے

دل کھو کر راہِ اُلفت میں پھر اپنے آپ کو کھونا ہے

جینے کی خلش، غم مرنے کا، میرا دلِ ناداں کیا جانے

کھو کر عقبیٰ کو پانا ہے، پا کر دُنیا کو کھونا ہے

پھُولوں سے ہوتا ہے گویا، سُنتا ہے ہواؤں سے نغمے

تاروں سے بہلا کرتا ہے، دل اپنا ایک کِھلونا ہے

میرے دل کی بربادی پر ہنسنے والے کیوں بُھول گئے

اپنے دل کی بربادی پر اِک روز اُنھیں بھی رونا ہے

آؤ جب تک بیدار ہیں ہم، رودادِ دل کہہ لیں سُن لیں

اِک دو لمحے کی فرست ہے، پھر گہری نیند ہی سونا ہے

انسانیّت سے کام نہیں، انسانیّت کا نام نہیں

انسانوں کی نظروں میں تو یا چاندی ہے یا سونا ہے

کانٹوں کی چُبھن نے کھُول دیا یہ بھید ضیا دیوانوں پر

پھُولوں کا مقدّر ہنسنا ہے، شبنم کی قسمت رونا ہے

دلی ــ ۱۹۳۹

حُسن تیرا بادۂ سرجوش ہے

عشق میرا آتشِ خاموش ہے

یہ ہجومِ رنگ و بو، یہ جام و مے

ہوش میں آنے کا کِس کو ہوش ہے

کِس نے چھیڑا صبحدم سازِ شباب

کائناتِ دل سراپا گوش ہے

رات کیا گزرے گی، کب ہوگی سحر ؟

شام ہی سے شمعِ دل خاموش ہے

گردشِ پیہم، طوافِ آفتاب

اے زمیں، تجھ کو کچھ اپنا ہوش ہے ؟

کھائے غم، آنسو پئے، اُلفت شکار

بے نیازِ فکرِ ناؤ نوش ہے

بارِ غم یوں تو سُبک ہوتا نہیں

کچھ تو کہہ تُو کیوں ضیا خاموش ہے

دلّی ــ ۱۹۶۲

شبِ غم محرمِ انوارِ سحر ہوتی ہے

سہمی سہمی سی ستاروں کی نظر ہوتی ہے

ہوش ہوتا ہے نہ کچھ اپنی خبر ہوتی ہے

ہائے کیا چیز محبّت کی نظر ہوتی ہے

عالمِ بے خودی و وجد میں ہوتی ہے حیات

مجھ پہ جب تیری محبّت کی نظر ہوتی ہے

کیا بتاؤں کہ سمجھتے نہیں اب صبح کو صبح

وہ جو کہتے تھے کہ ہر شب کی سحر ہوتی ہے

ابر ہو سایہ فگن یا ہو جُھلستی ہوئی دُھوپ

زندگی اپنی بہر حال بسر ہوتی ہے

پائے ہمّت ہے سلامت تو گلہ کیا، غم کیا

ہو جو دُشوار مِری راہ گزر ہوتی ہے

کھو کے دل یوں ہوں سرِ شام ضیا محفل میں

جس طرح سہمی ہوئی شمعِ سحر ہوتی ہے

دلّی ــ ۱۹٤۹

شب و روز رونے سے کیا فایدہ ہے

گریباں بِھگونے سے کیا فایدہ ہے

جہاں پھُول خود ہی کریں کارِ نشتر

وہاں خار بونے سے کیا فایدہ ہے

اُجالوں کو ڈھُونڈو سحر کو پُکارو

اندھیروں میں رونے سے کیا فایدہ ہے

ہمیں موڑنا ہے رخِ موجِ طوفاں

سفینہ ڈبونے سے کیا فایدہ ہے

تِری یاد سے دل کو بہلا رہا ہوں

مگر اِس کِھلونے سے کیا فایدہ ہے

ستاروں سے نُورِ سحر چھین لو تم

شبِ غم میں رونے سے کیا فایدہ ہے

پریشانیاں حاصلِ زندگی ہیں

پریشان ہونے سے کیا فایدہ ہے

وہی تیرگی ہے ابھی تک دِلوں میں

ضیا صبح ہونے سے کیا فایدہ ہے

مدراس ــ ۱۹۵۹

حالِ دل اُن سے کسی عنواں بیاں کر دیکھتے

اپنی رُودادِ محبّت، داستاں کر دیکھتے

دیکھ لیتے برقِ سوزاں میں ہے کتنا حوصلہ

ہم بھی شاخِ گل پہ تعمیر آشیاں کر دیکھتے

ضبط اگر دیتا اجازت ہم کو اے پاسِ وفا

جوشِ غم میں جرأتِ آہ و فغاں کر دیکھتے

کب ہمیں اتنی خبر تھی اُن کا مسکن ہے کہاں

سر کو محوِ سجدۂ ہر آستاں کر دیکھتے

تھا مآل آغاز سے روشن اگر اہلِ وفا

ساتھ اپنے دوست کا بھی امتحاں کر دیکھتے

پانی پانی سنگدل خود ہی نہ ہو جاتا تو ہم

سیلِ اشک آنکھوں سے شامِ غم رواں کر دیکھتے

ضبطِ گریہ، دعوتِ مشقِ ستم، پھر اے ضیا

کیوں نہ وہ آخر ہمارا امتحاں کر دیکھتے

دلّی — ۱۹٦۲

دلِ آدم کو وحشت ہے زمیں سے

ہوا آئی کوئی خلدِ بریں سے ؟

جو نکلی تھی دلِ اندوہگیں سے

جلی بجلی اُس آہِ آتشیں سے

ہوئیں تیّاریاں دار و رسن کی

اناالحق کی صدا آئی کہیں سے

جہاں سے قہقہے اُٹھے تھے، شاید

مِرے آنسو بھی آئے ہیں وہیں سے

چلی دُنیا میں رسمِ سجدہ ریزی

کچھ اُن کے در سے کچھ میری جبیں سے

یقیں کے پاؤں میں لغزش نہ آئے

بدل جاتی ہیں تقدیریں یقیں سے

محبّت کی ضیا سرشاریاں ہیں

نہیں مجھ کو غرض دُنیا و دیں سے

دلّی ــ ۱۹٦۰

دھُوپ اور چاندنی

ناشر : بزم سیماب ، دہلی

۱۹۷۷

حرفِ آخر

جناب ضیا فتح آبادی کی ذاتِ جامع صفات اُن کے کلام میں پوری آ ب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے –

وہ سادہ بھی ہیں پُرکار بھی

وہ بے خُود بھی ہیں اور ہُشیار بھی

وہ سادہ الفاظ میں دقیق نفسیاتی حقائق بیان کر جاتے ہیں اور وطنیت کے پرستار رہنے کے باوجود آفاقیت سے رشتہ جوڑ لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے – اُن کا کلام انسانیتِ کُبرأے کی اعلےأ قدروں کا حامل ہونے کے ساتھ ہی حُسن پرستی اور عاشق مجازی کے شور انگیز جذبات کا بھی مظہر ہے- اُن کی نظمیں دلکش اور غزلیں دلکشُائی کے لحاظ سے مقبولِ خاص و عام ہیں اور قطعات اور رباعیات میں طلاقت اور جزالت کا امتزاج قابلِ دید ہے –

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ڈاکٹر منوہر سہا ئے انور (مرحوم)

۳۰ مارچ ۱۹٦۵

حُسن ہر رنگ سزاوارِ خوُدآرائی تھا

کیا تماشا تھا کہ آئینہ تماشائی تھا

در و دیوارِ قفس پر ہیں لہوُ کے چھینٹے

مُرغِ پربستہ کو شوقِ چمن آرائی تھا

بھُولی یادوں کے سہارے تو دھڑکتا تھا مگر

بھری محفل میں بھی دل کو غمِ تنہائی تھا

ہائے اُس عہدِ محبّت کی فسانہ سازی

دلِ ناداں کو جب اندیشۂ رُسوائی تھا

کوئی انسان نہ انسانوں کی بستی میں ملا

کوئی ہندُو، کوئی مُسلِم، کوئی عسائ تھا

دل سے اُٹھ کر لبِ گویا پہ چلا ہی آیا

نالہ نا واقفِ آدابِ شکیبائی تھا

یہ بھی نا کام رہا، وہ بھی نہ پُورا اُترا

قیس مجنوں تھا تو فرہاد بھی سودائی تھا

عزم و ہمّت کے قدم روک سکا کون ضیا

حائلِ راہ اگر کوہ ہوا، رائی تھا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

فکرِ حیات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

راہِ نجات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

دل ہے کسی کے بس میں، نہ پُوچھو ، سمجھ بھی لو

اب دل کی بات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

اب تک عنانِ وقت مِری دسترس میں ہے

دِن کیا ہے، رات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

منتی نہیں منانے سے محبوبۂ حیات

ایسی بھی بات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

پردے اُٹھا رہا ہوں تِری ذات سے مگر

خود میری ذات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

آئینہ میری شکل بھی پہچانتا نہیں

حیرت کی بات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

تدبیرِ زندگی پہ بھروسہ ہے اے ضیا

قسمت کی بات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

نئی دہلی – ۱۹۷۲

تھی کل بھی اور آج بھی تنہا کھڑی ہے رات

اے ہمنشیں، نہ پُوچھ کہ کِتنی پڑی ہے رات

ڈرتا ہوں آگہی سے، کہیں ٹوُٹ ہی نہ جائے

شام و سحر کے بیچ اَہم جو کڑی ہے رات

نکلی طویل عمرِ خضر سے بھی، اے خدا

میرا خیال تھا کہ گھڑی، دو گھڑی ہے رات

اِک دِن تو صبح آئے گی اِس کو پھلانگ کر

دیوار بن کے بیچ میں کب سے کھڑی ہے رات

اُڑ جائے کیوں نہ نیند فلک پر لگا کے پر

بیٹھی جو بن سنور کے یہ تاروں جڑی ہے رات

کٹتی دِکھائی دیتی نہیں، کیا کہوں ضیا

دِن کی تو اور بات تھی، ضِدّی بڑی ہے رات

بمبئی – ۱۹٦۸

ہر طرف سے غموں نے گھیرا ہے

دوُر تک ہولناک اندھیرا ہے

تم مِلے تو خوُشی مِلی، ورنہ

میں نے سمجھا تھا غم ہی میرا ہے

وادیوں کی یہ چاک دامانی

پربتوں پر جنوں کا ڈیرا ہے

راکھ پروانے کی نہ شمع کا سوز

بھری محفل میں کون میرا ہے

نُور دیتا ہے ظلمتوں کو جنم

شام کے سائے میں سویرا ہے

گھر جلا کر ہی روشنی کر لیں

ہر گلی، کوچے میں اندھیرا ہے

اے ضیا، دل تو ہو چکا برباد

اب کہاں درد کا بسیرا ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۱

بے وفا کہیئے مجھے یا با وفا کہیئے مجھے

اپنے ہی در کا گدائے بے نوا کہیئے مجھے

پہلے رعبِ حُسن سے کر دیجئے مجھ کو خموش

پھر بھری محفل میں سازِ بے صدا کہیئے مجھے

کچھ کہے دُنیا مگر اے بندہ پرور آپ تو

پاسبانِ غم، نگہدارِ وفا کہیئے مجھے

آپ کا سودائی کہتا ہے مجھے سارا جہاں

آپ سے میں کیا کہوں اب آپ کیا کہیئے مجھے

میں ہی دریا، میں ہی ساحل، میں ہی طوفاں، میں ہی موج

بادباں، چپوُ، سفینہ، ناخدا کہیئے مجھے

جانے کوئی رام کب آکر مجھے بھی دے نجات

ٹھوکروں میں ایک پتھّر راہ کا کہیئے مجھے

ظلمتوں کا نام تک باقی نہ ہوگا بعد ازاں

رات بن کر ہی ذرا اپنا ضیا کہیئے مجھے

نئی دہلی – ۱۹۷۲

یہ کون بزم سے اُٹھا کہ بزم ہی نہ رہی

دِلوں میں آگ، چراغوں میں روشنی نہ رہی

بنائی عاقبت اپنی تو پاکبازوں نے

یہ اور بات ہے، دُنیا رہی، رہی، نہ رہی

نہ پُوچھ رُک گئیں کیوں گردشیں زمانے کی

بنے وہ دوست تو دُنیا سے دُشمنی نہ رہی

وہ تُند و تیز ہوائیں، وہ تپتی دھُوپ کہاں

ہمارے بعد فلک کی ستم گری نہ رہی

درست فیصلۂ ترکِ دوستی اُن کا

بجا کہ اب کوئی صورت نباہ کی نہ رہی

بنا تھا جس پہ نشیمن، گری تھی برق جہاں

بہار آئی ہے کیوں جب وہ شاخ بھی نہ رہی

چلی وہ یاس کی آندھی ضیا شبِ فرقت

چراغ بُجھ گئے، تاروں میں روشنی نہ رہی

نئی دہلی ــ ۱۹۷۲

دل کو احساس کی آنچوں میں تپایا جائے

پھر درِ غم پہ سرِ شوق جھُکایا جائے

ہو وہیں بارشِ انوار و ضیا شامِ الم

دامنِ تر پہ جہاں اشک گرایا جائے

دردِ دل کی ہو دوا کوئی، یہ ممکن ہی نہیں

ہائے جب دستِ دعا بھی نہ اُٹھایا جائے

جذبِ الفت میں ابھی کوئی کمی ہے ورنہ

میں بُلاؤں اُنھیں اور اُن سے نہ آیا جائے

وہی کوچے، وہی گلیاں، وہی بازار، چلو

شہر اُجڑا ہوا دوبارا بسایا جائے

گمرہی منزلِ معدوم پہ لے آئی ہے

ایسے کھو جائیں کہ پھر ہم کو نہ پایا جائے

ایک آنسوُ ہی گِرانے کی اجازت ہو وہاں

آدمیّت کا جہاں خون بہایا جائے

ظلم ڈھاتے ہیں اور اُس پر ہے ضیا یہ تاکید

ایک آنسوُ بھی نہ پلکوں سے گِرایا جائے

نئی دہلی – ۱۹۷۲

پامالِ جنوں آج بھی انسان بہت ہے

اے دل تِری دھڑکن سے پریشان بہت ہے

مشکل سہی تا منزلِ مقصود رسائی

چلنا تو رہِ عشق میں آسان بہت ہے

کیا کم ہے مِری ترکِ تمنّا کی تمنّا

ارمان نہ ہونے کا یہ ارمان بہت ہے

بیتے ہوئے لمحوں میں بھی تسکیں کی کمی تھی

بیتے ہوئے لمحوں کی مگر شان بہت ہے

کرتی ہے جگر چاک بہ عنوانِ تبسّم

اے بادِ بہاراں کلی نادان بہت ہے

کم اشک کے قطرے کو نہ سمجھے یہ زمانہ

برپا ہے مِرے دل میں جو طوفان بہت ہے

آغاز سے مطلب ہے نہ انجام کی پروا

ہم عشق پہ لے آئے ہیں ایمان، بہت ہے

جو اپنی دوا آپ ضیا ہے شبِ ہجراں

دل کو مِرے اُس درد کا عرفان بہت ہے

نئی دہلی — ۱۹۶۱

نہ ہم کو وہ سمجھتے ہیں، نہ اُنکو ہم سمجھتے ہیں

زیادہ ہو محبّت کا نشہ تو کم سمجھتے ہیں

عجب احساس کے عالم میں ہیں اُلفت کے دیوانے

تِرے غم کو خوشی، اپنی خوشی کو غم سمجھتے ہیں

تمنائے سکونِ دل وہاں بھی تھی، یہاں بھی ہے

مگر اس بات کو کب حضرتِ آدم سمجھتے ہیں

کہاں ہیں، درد کا حد سے گزرنا تھا دوا جِنکو

رُخِ بادِ زمانہ، کچھ وہی ہمدم سمجھتے ہیں

جو آ جاتا ہے ہم تک دَورِ ساغر بے خیالی میں

اُسے بھی آسماں کی گردشِ پیہم سمجھتے ہیں

ہماری سادہ لوہی مار ڈالے گی ضیا اِک دِن

نہیں کچھ بھی، مگر دُنیا کو سب کچھ ہم سمجھتے ہیں

نئی دہلی — ۱۹۷۳

جاتی ہیں سبھی راہیں میخانے کو، کیا کہیئے

توبہ کے ہوئے ٹکڑے، پیمانے کو کیا کہیئے

آنا ہے تو جانا ہے، جانا ہے تو آنا ہے

اِس آنے کو کیا کہیئے، اِس جانے کو کہیئے

سو بجلیاں رقصاں ہیں ہر تنکے کے سینے میں

تعمیرِ خرابی ہے، کاشانے کو کیا کہیئے

ہے مُرغِ قفس تیری پرواز میں کوتاہی

خود دام بچھاتا ہے، پھر دانے کو کیا کہیئے

واعظ، تِری جنّت کو ہم نے غمِ ہستی میں

کھو کر ہی اگر پایا، اِس پانے کو کیا کہیئے

سر میری غزل سُن کر دُھنتے ہیں جو کہتے تھے

آنکھوں سے لہُو دل کا برسانے کو کیا کہیئے

مر مر کے ضیا ہم نے کاٹی ہے شبِ حرماں

تا صبح تڑپنے اور تڑپانے کو کیا کہیئے

نئی دہلی ١٩٧٤

اے بے بسیِ امن کوئی میں بھی سنگ ہوں

گردِ رہِ حیات ہوں، سر گرمِ جنگ ہوں

کٹ جاؤں گا جو ڈھیل نہ دی دستِ شوق نے

زد میں ہوائے تُند کی، اُڑتی پتنگ ہوں

فصلِ بہار بھی ہے مجھے موسمِ خزاں

ہوں باغ میں مگر گلِ بے آب و رنگ ہوں

پہنا دو حسرتوں کا کفن مجھ کو دوستو

جو چاٹتی ہے دل کا لہو، وہ اُمنگ ہوں

کچھ بھی تو پانیوں میں نہیں فرق و امتیاز

میں ہی تو رُود نیل ہوں، دریائے گنگ ہوں

لاؤں کہاں سے دشت نوردی کی لذّتیں

مجنوں نہیں کہ وسعتِ صحرا سے تنگ ہوں

پیشہ مِرا ازل سے ضیا ہے سپہہ گری

میں زیر بارِ دشنہ و تیغ و تفنگ ہوں

نئی دہلی — ۱۹۷٤

رہِ وفا میں ضرر سودمند ہے یارو

ہے درد اپنی دوا، زہرقند ہے یارو

گھٹا بڑھا کے بھی دیکھا، مگر نہ بات بنی

غزل کا رُوپ روایت پسند ہے یارو

کھُلا جسے غلطی سے میں چھوڑ آیا تھا

مِرے لئے وہی دروازہ بند ہے یارو

غزل سرائی تھی جس کے لئے، بغیر اُس کے

گلوں کا خندۂ لب زہر خند ہے یارو

مجھے خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں مجھ کو

مِرے سوا بھی کوئی ہوشمند ہے یارو

مِلے جو دستِ تمنّا سے کیوں نہ پی جاؤں

وہ زہر بھی تو مِرے حق میں قند ہے یارو

نہ جانے توڑ کے اُڑ جائے گی کہاں اِک دِن

حصّارِ جسم میں جو روح بند ہے یارو

زمیں پہ رہتا ہے، اُڑتا ہے آسمانوں پر

ضیا کی پستی بھی کتنی بلند ہے یارو

نئی دہلی ــ ۱۹۷٤

اب لبِ چارہ گراں پر ہے دعا میرے بعد

مل گئی کیا غمِ دل، تیری دوا میرے بعد

میری ہستی سے تھی تعظیم سُبوخانوں کی

پائے ساقی پہ کوئی سر نہ جُھکا میرے بعد

اپنے سینے میں جسے میں نے چُھپا رکھّا تھا

میری ہستی کا وہی راز کھُلا میرے بعد

رنگ لائے گا یہ آخر مِرا خونِ ناحق

آندھیوں سے بھی بُجھےگا نہ دِیا میرے بعد

خود کُشی جرم تھا، یہ اُس کی سزا مجھ کو ملی

حُسن کی آنکھ سے اِک اشک گِرا میرے بعد

اور ہے کون، جو کھائے گا فریبِ ابلیس

اپنی جنّت میں ہے خوش کتنا خدا میرے بعد

میں ضیا ہوں، مجھے پہچانو، مِری قدر کرو

پھر ملے گا نہ تمہیں میرا پتہ میرے بعد

نئی دہلی - ۱۹۷۵

دل کہ تھا منّت گزارِ حسرتِ دیدارِ دوست
شوق کے ہاتھوں ہوا رُسوا سرِ بازارِ دوست

ریگزارِ زندگی کی دین ہے، جس کو ملے
اِس جُھلستی دُھوپ میں یہ سایۂ دیوارِ دوست

وقت تھم جاتا ہے جب ہوتی ہے بزمِ ناز میں
ہم سخن روحِ غزل سے شوخیِ گفتار دوست

کیوں نہ دے دادِ اسیری مُرغِ پر بستہ، کہ ہے
حلقۂ زنجیرِ زنداں گیسوئے خمدارِ دوست

سر پٹک کر رہ گئی برقِ تجلّی طور پر
جب نظر آیا نہ کوئی عاشقِ دیدارِ دوست

دل کو افکارِ دوعالم ہوش میں لائیں گے کیا
بادہ مستی ہے رہینِ ساغرِ سرشارِ دوست

بند آنکھوں ہی سے اکثر دیکھ لیتا ہوں ضیا
آئینہ خانے میں عکسِ روئے پُرانوارِ دوست

نئی دہلی — ۱۹۷٤

خزاں قریب ہے صحنِ چمن سے بھاگ چلو

پریدہ رنگ گل و نسترن سے بھاگ چلو

ہوس شکار دلوں کو کہاں مجالِ خلش

اُجڑ گئی ہے جو اُس انجمن سے بھاگ چلو

وطن کی یاد ستاتی ہے اب تو غربت میں

یہ تم سے کس نے کہا تھا، وطن سے بھاگ چلو

نیا زمانہ، نئی روشنی، نئے دستور

قدیم رسم و رواجِ کہن سے بھاگ چلو

بٹھائے جاتے ہیں پہرے زبانِ حق گو پر

غلط سیاستِ دار و رسن سے بھاگ چلو

یہاں تو سانس بھی لینا ہے اے ضیا مشکل

دھواں دھواں ہے فضا، اِس گھُٹن سے بھاگ چلو

نئی دہلی — ۱۹۷۲

رگِ احساس میں نشتر ٹوُٹا

ہاتھ سے چُھوٹ کے ساغر ٹوُٹا

ٹوُٹنا تھا دلِ نازک کو نہ پوُچھ

کب، کہاں، کِس لئے، کیونکر ٹوُٹا

سینہ دھرتی کا لرز اُٹھا ہے

آسماں سے کوئی اختر ٹوُٹا

جُھک گیا پائے بتاں پر لیکن

پتھّروں سے نہ مِرا سر ٹوُٹا

سخت جانی مِری توبہ توبہ

قتل کرتے تھے کہ خنجر ٹوُٹا

اشک پلکوں سے گِرا یوں جیسے

خشک ٹہنی سے گلِ تر ٹوُٹا

اے ضیا ہو کے رِہا زنداں سے

اُڑنے پایا بھی نہ تھا، پَر ٹوُٹا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

موآج سمندر کے کنارے پہ کھڑا ہوں

غرقاب سفینوں کے سِسکنے کی صدا ہوں

اِک خاک بہ سر برگ ہوں، ٹہنی سے جُدا ہوں

جوڑے گا مجھے کون کہ میں ٹوُٹ گیا ہوں

اب بھی مجھے اپنائے نہ دُنیا، تو کروں کیا

ماحول سے پیمانِ وفا باندھ رہا ہوں

مستقبلِ بتخانہ کا حافظ ہے خدا ہی

ہر بُت کو یہ دعویٰ ہے کہ اب میں ہی خدا ہوں

افکارِ دو عالم نہ جھنجھوڑیں مجھے اس وقت

اپنے ہی خیالات کی دلدل میں پھنسا ہوں

منزل کا تو عرفان نہیں، اتنی خبر ہے

جس سمت سے آیا تھا، اُسی سمت چلا ہوں

مدّت ہوئی گزرا تھا اِدھر سے مِرا سایہ

کب سے یونہی فُٹ پاتھ پہ خاموش پڑا ہوں

ہوں آپ کا بس مجھ کو ہے اتنا ہی غنیمت

اِس سے کوئی مطلب نہیں، اچھا کہ بُرا ہوں

پہناؤ مِرے پاؤں میں زنجیرِ بوئے گل

آوارہ چمن میں صفتِ بادِ صبا ہوں

چھیڑو نہ مجھے جانِ ضیا فصلِ جنوں میں

کیا میں بھی کوئی نغمۂ اندوہ رُبا ہوں

نئی دہلی - ۱۹۷٤

چشمۂ نُور سرِ کوہ اُبلتا دیکھا

ٹوُٹتا وقتِ سحر ہر رگِ شب کا دیکھا

سر کشی جسکی تھی جنّت سے نکلنے کا سبب

پائے دُنیا پہ اُسے ناصیہ فرسا دیکھا

بند کر لیتا ہوں آنکھیں کہ وہ مجھ سے پوچھیں

میں نے محفل میں کھُلی آنکھوں سے کیا کیا دیکھا

سنگ کا لمسِ خنک، ٹوُٹ گیا شیشۂ دل

سجدۂ در میں زیاں اپنے ہی سر کا دیکھا

میں نہ کہتا تھا، بھری بزم میں اُس نے مِری سمت

غلط انداز نظر سے بھی نہ دیکھا، دیکھا

اب بھی جاتا ہے اُسی کوچۂ وحشت کو نہ پوُچھ

لاکھ ہم نے دلِ نافہم کو سمجھا دیکھا

میری تردامنی دھوکا ہے نظر کا، ورنہ

دیکھنے والوں نے کب ابر برستا دیکھا

اپنی پستی کا ہوا خاک نشینوں کو ملال

کیوں کِسی نے طرفِ اوجِ ثریا دیکھا

ناخداؤں نے ڈبو کر ہی سفینے تارے

دوُر تک جب نہ سمندر کا کِنارہ دیکھا

دل جلا لوگ مجھے کہتے تھے، میں نے ہی ضیا

دل جلا کر کِیا محفل میں اُجالا دیکھا

نئی دہلی- ۱۹۷۵

بیتے ہوئے دِنوں کی یادیں سجا رہے ہیں

جو پا کے کھو چُکے تھے، وہ کھو کے پا رہے ہیں

اِک ہم کہ بدلی بدلی آنسوُ بہا رہے ہیں

اِک وہ کہ بِجلی بِجلی شمعیں جلا رہے ہیں

ناداں ہیں کِتنے بھونرے، پھُولوں کی جُستجوُ میں

کانٹوں سے اپنے دامن ناحق بچا رہے ہیں

کیا جانے رات گزری کیا شاخِ آشیاں پر

خاموش بلبلیں ہیں، گل گنگنا رہے ہیں

منہ اپنا دیکھتے ہیں جو دل کے آئنے میں

بے چہرہ زندگی سے پردہ ہٹا رہے ہیں

کیفیت اپنے دل کی سمجھا نہ کوئی اب تک

ہم شہرِ آرزو میں بےمدّعا رہے ہیں

خوابوں میں رہنےوالے کیسے ہیں، جو زمیں سے

بس ایک جست ہی میں گردوں پہ جا رہے ہیں

کیسہ تہی ہے لیکن بے دست و پا نہیں ہم

تدبیر کے دھنی ہیں، بِگڑی بنا رہے ہیں

اُن کو ضیا ہے کیسی فکرِ خدا شناسی

جو اپنے آپ سے بھی نا آشنا رہے ہیں

نئی دہلی — ۱۹۷٤

میرا سایہ جُدا نہیں ہوتا

یہ کبھی دُوسرا نہیں ہوتا

اجنبی اجنبی ہی ہے لیکن

آشنا، آشنا نہیں ہوتا

سُنتے آئے تھے آج دیکھ لیا

بے کسوں کا خدا نہیں ہوتا

کھٹکھٹاتا رہوں گا میں، جب تک

گھر کا دروازہ وا نہیں ہوتا

اِتنے صدمے سہے کہ اب دل کو

اعتبارِ وفا نہیں ہوتا

گوہرِ تابدار تھا آنسوُ

جو پلک سے گِرا نہیں ہوتا

کیا کہا، رات کے اندھیرے میں

آسماں دیکھتا نہیں ہوتا

اُن کی آتی اگر خبر تو ضیا

کہیں میرا پتا نہیں ہوتا

نئی دہلی — ١٩٧٤

برقِ سوزاں گِری، آشیاں جل گیا

آتشِ گل بڑھی، گلستاں جل گیا

راکھ ہر سوُ دلِ سوختہ کی اُڑی

دوُر سے دیکھ کر پاسباں جل گیا

تھا قیامت دلِ ذرّہ کا ٹوُٹنا

خاکداں جل گیا، آسماں جل گیا

شمع کے جلنے سے بزم روشن ہوئی

حیف پروانہ جو رائگاں جل گیا

پھر دلِ مردہ میں جان سی آ گئی

رات کوئی دِیا نا گہاں جل گیا

ہائے وہ دل جو گرمئی احساس سے

صورتِ کوہِ آتش فشاں جل گیا

تھا سوا نیزے پر آفتاب اے ضیا

حشر برپا ہوا، کُل جہاں جل گیا

نئی دہلی ــ ١٩٧٤

ہاں مجھی کو ہر جگہ دھوکا لگا

خود کو میں ہر حال میں ٹوُٹا لگا

آپ کی دیدہ وری کا شکریہ

تھا جواں میں، آپ کو بوُڑھا لگا

اُس طرف ہی مُڑ گیا موجوں کا رُخ

جس طرف بہتا ہوا دریا لگا

جس پہ چہرہ اور کوئی بھی نہ تھا

مجھ کو تو چہرہ وہی اچھا لگا

آگیا ہوں توڑ کر زندانِ جسم

اب بتا اے زندگی، کیسا لگا

میں تو دیکھوں، تُو نہ دیکھے ایسا بھی

اپنے در پر اب کوئی پردا لگا

ڈوُبنے والے کو کافی ہے ضیا

کوئی تِنکا ہی کِنارے جا لگا

ناگپور ــ ۱۹۷٦

دل اپنی دھڑکنوں کو جاوداں سمجھا تو کیا سمجھا

ستم کو التفاتِ دوستاں سمجھا تو کیا سمجھا

مِری ناکامیوں نے کامرانی کو جِلا بخشی

میں اپنی کوشِشوں کو رائگاں سمجھا تو کیا سمجھا

خوشی بھی عارضی تھی، مستقل غم بھی نہ تھا میرا

خوشی کو سود اور غم کو زیاں سمجھا تو کیا سمجھا

ہو کوئی تُک بھی فکرِ عاقبت کی ناصحِ مشفق

زمیں مجھ کو نہ سمجھی، آسماں سمجھا تو کیا سمجھا

ہے ذرّہ ذرّہ رشکِ طور جلوہ گاہِ ہستی کا

جو خاکِ رہ کو گردِ کہکشاں سمجھا تو کیا سمجھا

نہیں جب ایک قطرہ مے بھی باقی جام و مینا میں

بلا نوشوں کا غم پیرِ مغاں سمجھا تو کیا سمجھا

ضیا، سمجھا نہ وہ جس نے کِیا سوز آشنا دل کو

تو پھر کوئی مِرا سوزِ نہاں سمجھا تو کیا سمجھا

نئی دہلی ـــ ۱۹۷۵

چارہ گر درد آشنا نہ ہوا

اُس کے پہلوُ میں دل مِرا نہ ہوا

وہ تِرا در تو ہو نہیں سکتا

کھٹکھٹانے سے بھی جو وا نہ ہوا

عمر بھر جس پہ جبہ سائی کی

وہ تو پتھّر ہوا، خدا نہ ہوا

ٹوُٹا بھی میں تو مثلِ نجمِ سحر

کوئی اُس وقت دیکھتا نہ ہوا

جب مِرا ساتھ مجھ سے چھُوٹ گیا

توُ بھی میرا ہوا ہوا نہ ہوا

اپنا چہرہ تو دیکھ ہی لیتا

میرے ہاتھوں میں آئینہ نہ ہوا

اے ضیا دل میں رہ گئی دل کی

لب کشائی کا حوصلا نہ ہوا

نئی دہلی — ۱۹۷٤

شور اُٹھا، میکدے کا در کُھلا

کِس نے کھولا، کیوں کُھلا، کیونکر کُھلا

پھر ردائے شب زمیں نے اوڑھ لی

پھر فلک پر دیدۂ اختر کُھلا

اندلیبیں نوحہ خواں، گل سینہ چاک

کیا مِرا حالِ دلِ مضطر کُھلا

موت کی ساری خلِش جاتی رہی

زندگی کا راز جب دل پر کُھلا

اب مجھے دو بھی محبّت کی سزا

لے لیا اِلزام اپنے سر، کُھلا

کیا خبر، کب اِس طرف آجاؤ تم

رکھتا ہوں ہر وقت اپنا گھر کُھلا

خاکِ نقشِ پا ہوا، اے راہِ شوق

میں ہی تھا رستے کا اِک پتھّر، کُھلا

منزلِ مقصود اتنی ہی کِھنچی

اے ضیا جتنا مِرا رہبر کُھلا

نئی دہلی — ۱۹۷٤

کِسے معلوم ہے، اِس زندگی کے بعد کیا ہوگا

نہ ہوگا آدمی تو آدمی کے بعد کیا ہوگا

جو تاج و تخت تھے وہ ٹھوکروں میں ہیں زمانے کے

مگر یہ دیکھنا ہے قیصری کے بعد کیا ہوگا

امیدِ صبح میں کٹ تو رہی ہیں ساعتیں غم کی

خدا معلوم شب کی تیرگی کے بعد کیا ہوگا

جگر چھلنی، دلِ پُرخوں، نگاہیں حسرت آلودہ

ہوا یہ دوستی میں، دوستی کے بعد کیا ہوگا

یہ مانا وسعتِ عالم ہے مجھ پرتنگ تر لیکن

میں خود سے پُوچھتا ہوں خودکُشی کے بعد کیا ہوگا

بُلاتا ہوں بمجبوری اُنھیں لیکن یہ اُلجھن ہے

مِرا گھر اُن کے آنے کی خوشی کے بعد کیا ہوگا

جبینِ شوق کے سجدوں میں ہے رسوائیِ اُلفت

تو پھر اے بندہ پرور بندگی کے بعد کیا ہوگا

ضیا، کِس کو خزاں کا ہوش ہے فصلِ بہاراں میں

کبھی سوچا بھی ہے گل نے، ہنسی کے بعد کیا ہوگا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

اور ابھی تازہ گل کِھلائے دیدۂ اشکبار کیا

حشر نہ جانے ہو تِرا اے دلِ داغدار کیا

اپنا نشانۂ ستم مجھ کو بنا کے، میرے بعد

دہر میں چین پائے گا فتنۂ روزگار کیا

جلتے ہوئے چراغ گل کر نہ سکیں جب آندھیاں

حائلِ راہِ شوق ہیں وادی و کوہسار کیا

انجمنِ جنوں تو ہے، ذوقِ جنوں مگر نہیں

میں جو اُٹھا تو اُٹھ گئے رسم و رواجِ دار کیا

مقصدِ زندگی عمل، آج نہ سوچ کل کی بات

لطف و نشاط کار میں فکرِ مآلِ کار کیا

رنگ و نوا کی بھیڑ میں اُنکی خبر نہ اپنا ہوش

اُترا ہوا ہے باغ میں قافلۂ بہار کیا

کہتا ہوں اُن سے حالِ دل، یہ بھی جانتا ہوں میں

ہوگا مِرا شریکِ غم، جو نہیں غمگسار، کیا

جام و سبو سے ہے ضیا گرمئیِ بزمِ میکدہ،

جام و سبو ہی توڑ دیں ساقی و بادہ خوار کیا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

حسرتِ جذبۂ اشیار پہ رونا آیا

بیکسیِ رسن و دار پہ رونا آیا

عظمتِ رفتہ کے آشار پہ رونا آیا

کہیں در پر، کہیں دیوار پہ رونا آیا

دلِ حسّاس کا ممنونِ کرم ہوں کہ مجھے

کبھی غنچے پہ، کبھی خار پہ رونا آیا

بزمِ خوباں میں مِلی خوُب مجھے دادِ وفا

کس مپرسیِ دلِ زار پہ رونا آیا

سُست گامی نے پہنچنے نہ دیا تا منزل

وقت کی تیزیِ رفتار پہ رونا آیا

پیاس دھرتی کی بُجھی جِتنی، بڑھی اُتنی ہی

بخششِ ابرِ گہُر بار پہ رونا آیا

ریگزاروں میں جُھلستی ہوئی، تپتی ہوئی دُھوپ

خشکیِ سایۂ اشجار پہ رونا آیا

اے ضیا دل پہ جو شب گزری محبّت میں نہ پوچھ

مونس و ہمدم و غم خوار پہ رونا آیا

نئی دہلی ــ ۱۹۷٤

ہٹ گئی دیوار، دروازہ کھُلا

پردہ اُٹھا، روئے بے غازہ کھُلا

شاخ سے توڑا، پِرویا ہار میں

راز تیرا اب گلِ تازہ کھُلا

دشمنی لی، کر کے اُن سے دوستی

تھا غلط اپنا ہی اندازہ، کھُلا

اتنی پی لی تھی کہ چھوڑ آئے ہمیں

رات میخانے کا دروازہ کھُلا

آج سُن کر اے ضیا تیری غزل

شعر کی قدرت کا اندازہ کھُلا

نئی دہلی – ۱۹۷۳

ہر طرف شور کی دیوار دِکھائی دے ہے

میری آواز بھی کب مجھ کو سُنائی دے ہے

دل لگاتا تو ہوں دُنیا سے مگر جانتا ہوں

جو بھلائی کرے، یہ اس کو بُرائی دے ہے

شعلۂ گُل کو دمِ صبح ہَوا دی جس نے

وہی موسم تو مجھے نغمہ سرائی دے ہے

خوفِ تنہائی سے سہما ہوا بیٹھا ہے جو دل

بات بِگڑی ہوئی پھر بنتی دِکھائی دے ہے

مانگنے پر نہیں دیتا ہے جو میرا پتہ

وہی بِن مانگے مجھے ساری خُدائی دے ہے

اُس کے ظلمتکدۂ شب میں کہاں دِن کا نشاں

لذّتِ وصل جسے دردِ جُدائی دے ہے

کھو چکا ہوں کسی تاریک گُپھا میں خود کو

ٹوُٹ کر میری انا میری دُہائی دے ہے

سایہ سایہ مِرے پیچھے ہے، کہیں دل کی نہ ہو

یہ جو آواز ہمہ وقت سُنائی دے ہے

وہاں سمجھے گا ضیا کون، کسے جانے گا

جہاں ہر شخص ہی بے چہرہ دِکھائی دے ہے

نئی دہلی — ۱۹۷٤

وہ پردۂ شب اُٹھا ، پیغامِ سحر آیا

اُمید بر آنے کا سامان نظر آیا

تھا محو اندھیروں میں، بچتا ہوا سائے سے

آئنے کو کیا دیکھا، آپ اپنے سے ڈر آیا

پتّوں کی طرح ٹوُٹا، مٹی میں ہوا مٹی

شاخوں کی طرح مجھ کو جُھکنا نہ مگر آیا

اتنی تو خبر،ہم کو تھی بے خبری میں بھی

سر اپنا جُھکا جس جا، سمجھے تِرا در آیا

ارزانیِ جلوہ نے دی تابِ نظر یا رب

اِلزامِ تماشا کیوں پھر بھی مِرے سر آیا

سوتے میں تیری یادیں کیا کیا نہ دِکھاتی تھیں

جب آنکھ کُھلی مجھ کو کچھ بھی نہ نظر آیا

پہچانی ہوئی سی ہے صورت مِری منزل کی

اے لغزشِ پا مشدہ، انجامِ سفر آیا

اس موڑ پہ آ پہنچا میں جادۂ ہستی میں

رُک جائیں جہاں پاؤں، کہدوں مِرا گھر آیا

ہنستا ہوا نکلا تھا اِک روز ضیا جس سے

واپس اُسی کوچے میں با دیدۂ تر آیا

نئی دہلی — ۱۹۷۳

توبہ نا کردہ گناہوں سے کئے جاتا ہوں میں

دامنوں کے چاک اشکوں سے سئے جاتا ہوں میں

تا دمِ آخر، بہ فیضِ گردشِ شام و سحر

جامِ زہرابِ غمِ دوراں پئے جاتا ہوں میں

کون سُورج سے مِلائے آنکھ، توڑے شب کا دل

روشنی دینے لگے بُجھتے دیئے، جاتا ہوں میں

تلخیاں، تنہائیاں، مایوسیاں، نا کامیاں

بے مزہ ہے زندگی، پھر بھی جئے جاتا ہوں میں

چشمِ آئینہ مجھے اچھّی ترح پہچان لے

اِک نہ اِک دِن واپس آنے کے لئے جاتا ہوں میں

تیرے پاس آ کر ہزاروں رنگ کے صدمے سہے

دُور تجھ سے وقت کے بہروپئے ! جاتا ہوں میں

اِتنا بِکھرا، اِتنا ٹُوٹا دل طلسمِ زیست میں

نغمہ خواں آیا تھا، گاتا مرثئے جاتا ہوں میں

خانہ ویرانی کا عالم، ہیبتِ آوارگی

ہو کوئی، تو کھولے در، دستک دیئے جاتا ہوں میں

ہر قدم پر سجدہ کرتا، تا درِ ساقی، ضیا

جانے کیا کیا دل میں اُمیدیں لئے جاتا ہوں میں

نئی دہلی — ۱۹۷٤

سمجھ کے اپنا جسے سینے سے لگاتا رہا

پرایا تھا، مِرے زخموں پہ مُسکراتا رہا

ہوئی سحر، تو کہاں کھو گیا اُجالے میں

جو رات بھر مِرا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا

مِرے ہی سینے میں ٹوُٹا ہے آکے آخر کار

وہ تیر، زہرِ الم میں جسے بُجھاتا رہا

حصّارِ جسم سے باہر نکل تو آتا مگر

مِرا ہی سایہ مجھے رات بھر ڈراتا رہا

بِچھاتے لوگ نہ کیوں میری راہ میں کانٹے

کہ میں خزاں میں بھی کلیوں کے گیت گاتا رہا

وہ ہار کر بھی نہ ہارا، عجب تماشا ہے

میں جیت کر بھی زمانے سے مات کھاتا رہا

بہت ملال تھا تنہا روی کا اپنی ضیا

کسی کے ساتھ چلا بھی تو ڈگمگاتا ہوا

ناگپور ــ ۱۹۷٦

جلائیں شمعیں داغوں کی کہاں تک

اندھیرا ہے زمیں سے آسماں تک

محبّت کھائے گی در در کی ٹھوکر

نہ تھا اِس بات کا وہم و گماں تک

گزر کر بیش و کم کے مرحلےوں سے

کوئی پہنچا حدِ سود و زیاں تک

تم اس سے پہلے آجاؤ کہ پہنچے

جنوں کا ہاتھ دامانِ زماں تک

زمیں کی آنکھ کا آنسوُ بنا ہے

وہ نالہ، جو نہ پہنچا آسماں تک

تمہارے نقشِ پا پر گام زن ہوں

مگر یہ راہ جاتی ہے کہاں تک

تجلّی ہی تجلّی، نوُر ہی نوُر

دلِ سوزاں سے برقِ آشیاں تک

ضیا، پُر پیچ و خم ہے جادۂ غم

چلو گے ساتھ میرے تم کہاں تک

نئی دہلی ــ ۱۹۷۰

سائے بڑھ کر آشیاں تک آ چکے

دن بہاروں کے چمن سے جا چکے

قافلے والو ذرا سُستا بھی لو

راستوں کی ٹھوکریں تو کھا چکے

ہے یہی عالم ، تو لفظوں کا لباس

دل کے ارمانوں کو ہم پہنا چکے

کام آیا بے پر و بالی کا غم

اُس طرف گردوں سے اُڑ کے جا چکے

رنگ لائے دو دِلوں کے فاصلے

درمیاں دیوار تھی جو ڈھا چکے

تیری دُنیا میں جنہیں جینا پڑا

وہ تِری رحمت پہ ایماں لا چکے

اے ضیا توُ اُڑتی باتوں پر نہ جا

لوگ افواہیں بہت پھیلا چکے

نئی دہلی – ۱۹۷٤

فریبِ تیرگی کھاؤ کہ روشنی پھیلے

لہو چراغ جلاؤ کہ روشنی پہلے

سکوت اندھیروں کا ہر لمحہ بڑھتا جاتا ہے

اب ایک حشر اٹھاؤ کہ روشنی پھیلے

تمہارے سائے کے پروردہ ہیں غم و حرماں

پرے ہٹو بھی، بلاؤ ! کہ روشنی پھیلے

پہاڑ کاٹو، تراشو نئے نئے اصنام

حریم شوق سجاؤ کہ روشنی پھیلے

یہ چاروں سمت اُگلتا سیاہیاں ماحول

گھٹاؤ ! برق گِراؤ کہ روشنی پھیلے

تمہیں ترانۂ بلبل، تمہیں تبسّمِ گل

ہرے رہو مِرے گھاؤ، کہ روشنی پھیلے

مہیب اندھیروں کا یہ رقص سطحِ دریا پر

ڈبو رہا ہوں میں ناؤ، کہ روشنی پھیلے

ضیا جی، ختمِ شبِ غم ہے، سازِ صبح اُٹھاؤ

سُلگتا گیت سُناؤ کہ روشنی پھیلے

نئی دہلی ــ ۱۹۷٤

بوڑھا درخت ہوں مجھے جڑ سے اُکھاڑ دو

میرا پھٹا ہوا ہے لباس، اور پھاڑ دو

سچ ہے کہ جانتے ہو تمہیں میرے دل کی بات

دریا جو مانگتا ہوں تو مجھ کو پہاڑ دو

چاہوں بھی تو بسا نہ سکوں پھر کبھی اُسے

اُجڑے ہوئے دیار کو اِتنا اُجاڑ دو

کبتک یہ اشک ریزی و ماتم، یہ شور و غُل

اب لاش عہدِ مردہ کی مٹی میں گاڑ دو

لڑنا ہی ہے تو پھر تمہیں ڈر کیا، فکر کیا

اس پہلوانِ وقت کو بڑھ کر پچھاڑ دو

اک ہو تو اُس کو کاٹ کے لے آؤں نہرِ شیر

حائل ہیں راستے میں جنوں کے پہاڑ دو

چھیڑی تھی تم نے تازہ غزل اے ضیا مگر

پھُولوں سے کب کہا تھا کہ دامن ہی پھاڑ دو

ناگپور - ١٩٧٦

کِن منزِلوں میں گمُ ہے ابھی کاروانِ وقت

ہیں پتھّروں کی راہ میں شیشہ گرانِ وقت

نا آ گہی کے ہاتھ میں کب تک عنانِ وقت

کیوں سرفگندہ بیٹھے ہیں دانِشورانِ وقت

میری نوائے غم کی جہاں تک ہے دسترس

صحرا میں گونجتی ہے وہاں تک اذانِ وقت

طولِ شبِ فراق سے آگے ہے دو قدم

بازیچۂ حیات میں کارِ جہانِ وقت

آگے نکل گیا تو نہ پھر ہاتھ آئے گا

اپنے قدم سنبھل کے رکھیں ہمرہانِ وقت

کیا پاؤں حادثات کے پتھراؤ سے نجات

ہر سمت ہے محیطِ زمیں آسمانِ وقت

ہے انتظار میں کِسی فرہاد کے ہنوز

اِک ضربِ تیشہ کے لئے کوہِ گرانِ وقت

چیرا جو اُس کا دل تو کھُلا راز یہ کہ ہے

ہر ذرّہ ریگزار کا اِک کہکشانِ وقت

یہ نظمِ بزمِ زیست بھی ہے اے ضیا عجیب

ہیں اختیارِ وقت میں نا قدردانِ وقت

نئی دہلی — ۱۹۷٤

کل کا بندہ ہے آج بندہ نواز

مِٹ چُکا امتیازِ ناز و نیاز

کیسی اُلٹی ہوا چلی کہ ہُوا

مُرغِ پَر بستہ مائلِ پرواز

تم تو اہلِ نظر ہو، کر دو گے

میری کوتاہیاں نظر انداز

اب تو پہچانتے ہیں لالہ و گل

میری آواز سے تِری آواز

ایک ہی گھُونٹ میں، ارے توبہ

آ گیا لب پہ دردِ دل کا راز

جانتا ہوں مآلِ قصّۂ غم

کرتا ہوں اپنے نام سے آغاز

اے ضیا یہ ستم ظریفیِ وقت

مختصر عمر، داستان دراز

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

جلی جو شمع، ہوا راکھ جل کے پروانہ

اب اِس کو کوئی حقیقت کہے کہ افسانہ

نظر اُسی پہ پڑی برق و باد و باراں کی

جو شاخِ گل پہ بنایا کِسی نے کا شانہ

نہ لطفِ بادہ فروشی، نہ کیفِ مے نوشی

سُبو شکستہ، تہی جام، اُداس میخانہ

گدائے کوئے محبّت تھا، پاسباں نے مگر

اُٹھا دیا مجھے در سے سمجھ کے دیوانہ

بلا کشوں کے لبوں تک جو آ گیا ساقی

ہے کیا ضرور کہ خالی رہے وہ پیمانہ

شریک رنگِ چمن پھُول بھی ہے کانٹا بھی

کِسے یگانہ کہوں اور کِس کو بیگانہ

صلیب و دار نے پھوُنکا عجب فسونِ سکوت

کہ ہم کو لگتی ہے بستی بھی آج ویرانہ

کوئی سُنے نہ سُنے اب، ضیا نے کہہ تو دیا

غزل کے پردے میں خونِ جگر کا افسانہ

نئی دہلی — ۱۹۷۳

جس دل پہ کرم چشمِ فسوں بار کرے ہے

اے بادِ سحر کیا اُسے بیدار کرے ہے

بندہ ہوں تِرے عشق کا، ایماں کی کہوں کیا

کافر، جو تِرے حُسن سے انکار کرے ہے

مرنے بھی نہ دیوے ہے مجھے اب وہ جفا کوش

اوچھا ہی کرے ہے جو کوئی وار کرے ہے

وابستہ ہوئیں اُس سے محبّت کی اُمیدیں

جو شکوہ شکایت سرِ بازار کرے ہے

سائے سے ڈر سے ہے کہ ہے دل دُھوپ کا پالا

کیا کیا نہ اشارے تِری دیوار کرے ہے

رکھے ہے نہ تُو کوئی کمی جور و جفا میں

ناداں ہے، جو دل پھر بھی تجھے پیار کرے ہے

لکھتا ہوں ضیا نامۂ دل خونِ جگر سے

تھا کام جو خامے کا وہ تلوار کرے ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۰

وہ جو روداد میرے من کی ہے

داستاں قیس و کوہکن کی ہے

علم و فن کی بدل گئیں قدریں

کیا یہ کم قدر علم و فن کی ہے

دل کے داغوں سے روشنی کرنا

رسمِ کُہنہ اِس انجمن کی ہے

کہاں سمجھے گا فائزِ منزل

بات جو راہِ پا شکن کی ہے

کس سے پوچھوں میں اپنے گھر کا پتا

کوئی موجی ہے، کوئی سنکی ہے

تیری دُنیا میں ہو نشاط، تو ہو

میری دُنیا غم و محن کی ہے

"بزمِ سیماب" میں ضیا چلئے

عام دعوت وہاں سخن کی ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

رات سوتے میں خواب کیا دیکھا

دِن میں دُشوار جاگنا بھی ہوا

اپنا منہ دیکھنے سے ڈرتا ہوں

کہیں ہنس دے نہ مجھ پہ آئینہ

جانتا تو نہ مانگ کر لیتا

دل میں سارے جہاں کا غم ہوگا

بلبلیں بھی اُسی کی گھات میں تھیں

پھُول جو میں نے شاخ سے توڑا

چاندنی مجھ کو نُور کیا دیتی

چاند ہے خود گدائی سُورج کا

وادیوں سے نکل کے پھیل گیا

دوُر تک سلسلہ پہاڑوں کا

ڈوبنی ہی تھی ایک دِن کشتی

ناخدا کو سمجھ لیا تھا خدا

ہو گیا فاش دل کا راز ضیا

شاعری نے کِیا مجھے رُسوا

بمبئی ــ ١٩٦٩

زندگی موت ہے کِسی کے بغیر

کیوں نہ مر جائیں خودکُشی کے بغیر

بلبلیں لاکھ گیت گائیں مگر

رنگ و نکہت کہاں کلی کے بغیر

اُس کی دیوانگی کو کیا کہیۓ

کوئی رو دے اگر ہنسی کے بغیر

تیرے جانے سے چِھن گئی وہ بھی

لذّتِ غم جو تھی خوشی کے بغیر

لغزشِ پاۓ شوق ڈھونڈوں کہاں

تیرے کوچے، تِری گلی کے بغیر

تیری محفل میں رازِ دل میرا

کون جانے گا اجنبی کے بغیر

سجدہ توہینِ بتکدہ ہی تو ہے

سرِ سوداۓ بندگی کے بغیر

چل نکلتی اگر تو کیا ہوتا

بات گیسوُ کی برہمی کے بغیر

شعر میں نام کر لیا پیدا

اے ضیا تُونے شاعری کے بغیر

نئی دہلی – ۱۹۷۱

تھا مِرا درد آشنا صحرا

ہر قدم پر مجھے مِلا صحرا

کِسی لیلیٰ کا آئینہ بردار

کِسی مجنوں کا نقشِ پا صحرا

خود بہ خود ٹوُٹتی ہے ہر زنجیر

دے رہا ہے مجھے صدا صحرا

اہلِ صحرا کا مدعا محفل

اہلِ محفل کا مدعا صحرا

کاش، سُنتا بھی میرے کانوں سے

میری آنکھوں سے دیکھتا صحرا

ریت کا ڈھیر، دھوپ، گرد و غبار

ہو گئے جمع تو بنا صحرا

نظر آتا ہے اے ضیا دیکھو

دُور سے کِتنا دل رُبا صحرا

نئی دہلی – ۱۹۷۱

تھے زمانے میں اہلِ فن تنہا

اپنی دُھن میں رہے مگن تنہا

بانٹ لو دردِ عشق، میں کب تک

جمع کرتا رہوں یہ دھن تنہا

رہزنی اصلِ رہنمائی ہے

نکل آیا ہوں گھر سے تن تنہا

کاش، دل کو مِرے مِلی ہوتی

تجھ کو پانے کی یہ لگن تنہا

کتنی تیرہ ہے انتظار کی شب

ڈرنے لگتا ہے میرا من تنہا

دعوتِ دید عام تھی، لیکن

دی مجھے دعوتِ سخن تنہا

تارے گِن کر بھی اے ضیا دیکھا

نہیں کٹتی شبِ محن تنہا

نئی دہلی ــ ١٩٦٥

پھاند کر جیل کل جو بھاگا تھا

پاؤں میں اُس کے کچا دھاگا تھا

ٹوُٹتا اور کون میرے سِوا

ایک میں ہی یہاں ابھاگا تھا

حق پرستوں کا ساتھ کس نے دیا

جھُوٹ والوں کا پیچھا آگا تھا

سونے والے، تجھے خبر نہ ہوئی

دل مِرا نصفِ شب میں جاگا تھا

جسے اپنایا، تھا وہ خوش قسمت

جسے ٹھُکرا دیا، ابھاگا تھا

آنکھ کیا کھولتا اندھیرے میں

روشنی میں بھی میں نہ جاگا تھا

اے ضیا، مجھ سے میرا ہی سایہ

رکھ کے کل سر پہ پاؤں، بھاگا تھا

نئی دہلی — ۱۹۷۱

جو مُرغانِ چمن پیدا دِلوں میں گرمیاں کرلیں

تو شاخِ برق پر تعمیر اپنے آشیاں کرلیں

غزل کہہ کر مغنی کو جو دی ہے، مدّعا یہ ہے

کہ چُپ رہ کر ہم اپنی داستانِ غم بیاں کرلیں

جلا کر شمع پروانے کو خود بھی جلتی رہتی ہے

ہمارے امتحاں سے پہلے اپنا امتحاں کرلیں

ستارے سرنگوں ہوں، چاند چُھپ جائے، فلک کانپے

شبِ فرقت جو سوتے میں ہم اُٹھ کر اِک فغاں کرلیں

نقوشِ پا ہی کوئی چھوڑ جاتا کاش صحرا میں

نہ کعبہ ہے نہ بتخانہ، تو پھر سجدہ کہاں کرلیں

فریبِ شعلہ و شبنم، اُنھیں کھانا ہی پڑتا ہے

غم و عشرت سے جو اندازۂ سود و زیاں کرلیں

بھروسہ اے ضیا کیا ناخدا کا کیوں نہ ہم بڑھکر

کِنارے توڑ ڈالیں، بحرِ غم کو بیکراں کرلیں

نئی دہلی — ۱۹۷۲

سینۂ گیتی کا اب ہر زخم اِک ناسوُر ہے

کون کہتا ہے کہ روزِ حشر کوسوں دوُر ہے

جا رہی ہے شب، سواری آ رہی ہے صبح کی

لب پہ نغمہ، آنکھ میں جادو جبیں پُر نُور ہے

ہیں سبھی ناصح یہاں، کوئی نہیں ہے چارہ گر

کیوں وہ ظاہر ہو کسی پر دل میں جو مستوُر ہے

کاش کوئی حضرتِ موسیٰ کو کر دیتا خبر

داغِ دل کے سامنے مدّھم چراغِ طوُر ہے

کب کھُلے گی یہ حقیقت قا تِلانِ وقت پر

جھُک نہیں سکتا وہ مٹ جانا جسے منظوُر ہے

شوق سے پامال کر، لیکن نگارِ زندگی

شیشۂ دل ایک ہی ٹھوکر میں چکنا چوُر ہے

اے ضیا تیری نمازیں کیوں نہ ہوں گی باریاب

دل میں ہے یادِ خدا، سر میں جنونِ حوُر ہے

نئی دہلی — ۱۹۷۵

توڑے گئے جو شاخ سے گل، خار ہو گئے

آئے کسی کے کام تو بے کار ہو گئے

زخموں نے دل کو مہلتِ ضبطِ فغاں نہ دی

جتنے چھُپائے اُتنے نمودار ہو گئے

پردہ رُخِ حیات سے اُٹھنے کی دیر تھی

دل نا شناسِ حسرتِ دیدار ہو گئے

تعمیرِ 'تاج' سے تھی نمودِ ہوس مُراد

سب ریگزار بے در و دیوار ہو گئے

دریائے آرزو کی یہ رسمِ قدیم ہے

منجدہار میں جو ڈُوب گئے، پار ہو گئے

اہلِ سخن میں اپنا بھی ہوتا ہے اب شمار

دو چار اِس زمیں میں جو اشعار ہو گئے

دل کو ملا کہ میرے لئے وقف اے ضیا

دو نوں جہان کے غم و افکار ہو گئے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

دل غمِ ہجر کا ہو لے تو غزل ہوتی ہے

خون آنکھوں سے جو ٹپکے تو غزل ہوتی ہے

پے بہ پے جام پئیوں، پھر بھی مِری تشنہ لبی

ایک اِک قطرے کو ترسے تو غزل ہوتی ہے

جستجو شعر کی جیسے ہو تلاشِ منزل

چلتے رہتے ہیں جو رستے تو غزل ہوتی ہے

آندھیاں گاتی ہوئی چلتی ہیں صحراؤں میں

رقص کرتے ہیں بگولے تو غزل ہوتی ہے

دل میں جلووں کا اُترنا ہے نزولِ اشعار

آنکھ سے اُٹھتے ہیں پردے تو غزل ہوتی ہے

رات کا پچھلا پہر، موسمِ گُل، فصلِ بہار

کوئی ایسے میں پُکارے تو غزل ہوتی ہے

غلط انداز نگاہوں سے مِری سمت ضیا

وہ بھری بزم میں دیکھے تو غزل ہوتی ہے

جاتے جاتے زندگی کے حادثے فرما گئے

یاد کر وہ داستانیں، ہم جنہیں دُہرا گئے

آشنا تھے ہم زمانے کی دورنگی سے مگر

یہ ہماری سادہ لوہی تھی کہ دھوکا کھا گئے

جب ہیولہ آدمی کا ذہنِ فطرت میں بنا

خود بہ خود گردش میں سورج، چاند، تارے آ گئے

آگہی تھی منزلِ مقصود کی کس کو نصیب

میری گمراہی سلامت، راستے گھبرا گئے

میں لئے پھرتا ہوں نغموں کے جنازے دوش پر

چھیڑ کر سازِ دلِ درد آشنا وہ کیا گئے

اے شعاعِ اولینِ مہر کر دینا معاف

تنگ آ کر ہم اندھیروں سے اگر ٹکرا گئے

جاگتی گلیوں کی آوارہ خرامی، کچھ نہ پوچھ

پانے والے کھو گئے کیا کھونے والے پا گئے

پتھّروں سے میرے خوابوں نے تراشے وہ صنم

میری صورت دیکھ کر آئنے بھی پتھّرا گئے

دل کی اس بنجر زمیں میں آرزوؤں کے ضیا

میں نے جو پودے لگائے تھے وہی مرجھا گئے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

کب تیری آرزو نے سہارا دیا مجھے

خود سے بھی جب رہی نہ امیدِ وفا مجھے

اِس چشمِ نیم باز کا یوں دیکھنا مجھے

سب بندھنوں سے جیسے رِہا کر دیا مجھے

میرا ہی دل ہجوم میں ڈھُونڈا کیا مجھے

اب کیا بتاؤں در سے تِرے کیا ملا مجھے

دیر و حرم سمٹ کے مِرے دل میں آ گئے

غم ساری کائنات کا راس آ گیا مجھے

ملتا ہے مشکلوں سے دلِ درد آشنا

اے چارہ ساز، دے نہ فریبِ دوا مجھے

کیوں خوش نہ ہوں کہ لوگ تو کہتے تھے کل اور آج

سودائی اپنا آپ نے بھی کہہ دیا مجھے

مجرم ہوں ایکبار ہی تجھ کو پُکار کر

آواز دی ہے توُنے مگر بارہا مجھے

اُن تک غزل کے روپ میں پہنچا رہا ہوں میں

پیغام دے گئی ہے جو بادِ صبا مجھے

منزل بھی مل ہی جائے گی، اے گردِ کارواں

بیٹھا ہوں رہگزر میں، بنا نقشِ پا مجھے

تُو مجھ کو پڑھ کے مطلبِ غم تک پہنچ گیا

حرفِ غلط ہوں، صفحۂ دل سے مٹا مجھے

میرا وجود ننگِ چمن، بارِ شاخِ گل

ہوں برگِ زرد و خشک، زمیں پر گِرا مجھے

میں ہی تو ہمکلام ہوں پردے میں شعر کے

پہچانتا نہیں ہے مگر تُو ضیا مجھے

پا بندِ سلاسل جو گرفتار نہیں ہیں

وہ زلفِ غمِ دل کے سزاوار نہیں ہیں

بیفایدہ ہے چرخِ جفا کار کی گردش

اس دَور میں لذّت کشِ آزار نہیں ہیں

پردہ تو اُٹھے، آپ ہی کھُل جاینگی آنکھیں

ہم سوۓ ہوئے کب ہیں، جو بیدار نہیں ہیں

بیگانہ عمل سے رہیں ہم باغ میں کیونکر

اے بے بصری ! نرگسِ بیمار نہیں ہیں

اِک تاج محل ریت کے ذرّوں کا بنالوں

صحرا میں تو بام و در و دیوار نہیں ہیں

دیتے ہیں ہمیں زخم پہ جو زخم شب و روز

اپنے ہی تو وہ لوگ ہیں، اغیار نہیں ہیں

وہ جنسِ گرا نمایہ، وفا نام ہے جس کا

ہیں اُس کے طلبگار، خریدار نہیں ہیں

کچھ سوچ کے ہی بادِ خزاں اب اِدھر آۓ

غنچے بھی ہیں گلشن میں، فقط خار نہیں ہیں

لو کھُل ہی گیا بھید، غزل سُن کے ضیا کی

دل میں جو نہ اُتریں تو وہ اشعار نہیں ہیں

نئی دہلی — ۱۹۷۳

میں اپنے آپ سے ہوں محوِ گفتگو اب تک

مِرا ہی چہرہ ہے بس میرے روبرو اب تک

یہ کس بگولے کے چکّر میں ہے دلِ نا داں

خرابِ دشت بہ عنوانِ جستجو اب تک

نہ ہاتھ جامہ دری سے اُٹھائے وحشت نے

نہ اپنا چاکِ گریباں ہوا رفو اب تک

جمودِ کہنگیِ خمکدہ، ارے توبہ !

وہی ہے رند، وہی مے، وہی سُبو اب تک

ہوا زمانہ کہ دم بھر کو برق چمکی تھی

کلیم و طور کی باقی ہے گفتگو اب تک

ہنوز میرے تعاقب میں ہے غمِ دُنیا

ہوئی ہے ختم کہاں میری جستجو اب تک

ہجومِ یاس نے کوشش تو کی، مگر نہ چھُٹا

خزاں کے ہاتھ سے دامانِ آرزو اب تک

زباں پہ اُن کی نہ کیوں روحِ میر خندہ کرے

"کبھی کبھی" کو کہیں جو "کبھو کبھو" اب تک

جفا و ظلم کا اب اپنے جائزہ کر لے

نہ پوچھ مجھ سے، وفا کیوں ہے میری خوُ اب تک

ہزاروں سال سے دھڑکن ہوں تیرے دل کی مگر

سمجھ رہا ہے مجھے اجنبی ہی توُ اب تک

بدل چُکا ہے زمانہ مگر ضیا صاحب

نہ بدلا آپ کا اندازِ گفتگو اب تک

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

بہ مقدارِ وفا ضبطِ فغاں ہے

گِلے شِکوے کی گُنجائش کہاں ہے

خوشی ترکِ تعلق کی مسّلم

مگر یہ غم کہ اُلفت درمیاں ہے

نہیں جب فکرِ بیش و کم دِلوں میں

تو کیا اندیشۂ سود و زیاں ہے

ہوا معلوم یہ طولِ امل سے

بہت ہی مختصر کارِ جہاں ہے

کہاں تک اے ہجومِ نا مرادی

کہیں تو حدِ سعیِ رائگاں ہے

سُناتا ہوں کہ میری آپ بیتی

بہ عنوانِ حد یشِ دیگراں ہے

ہزاروں عکس ہیں اک آئینہ میں

دلِ تنہا، ہجومِ مہ و شاں ہے

جسے میں سینچتا ہوں خونِ دل سے

ضیا، جذبہ وہی تو دلستاں ہے

نئی دہلی — ۱۹۷٤

مرنے کے بعد اُس کو نئی زندگی ملے

غم جس کو زندگی میں بجائے خوشی ملے

پایا جو خود کو، ہم پہ کھُلا آدمی کا راز

مدّت سے آرزو تھی کوئی آدمی ملے

ہر جھونپڑے کو تاج محل سے تھا واسطہ

سڑکیں ملیں جہاں، وہیں فُٹ پاتھ بھی ملے

حاصل ہے دن میں چین، نہ راتوں کو ہے سکوں

یا تیرگی ملے مجھے یا روشنی ملے

اِک رہنما کو ڈھُونڈ رہی ہے مِری نظر

یوں ہمسفر تو راہِ وفا میں کئی ملے

جس کے لئے کہی تھی غزل، اُس نے سُن تو لی

یہ کیا ضرور ہے کہ مجھے داد بھی ملے

وعدے کے اعتبار پہ جینا محال ہے

سچ بات کہہ دوں میں جو اماں جان کی ملے

کرتے رہیں ستم پہ ستم مجھ پہ وہ ضیا

جب تک مِری وفا میں اُنھیں کچھ کمی ملے

بمبئی — ۱۹۶۹

بیٹھا رہے سکون سے اُنکے خیال میں

اتنی سکت کہاں دلِ فرسودہ حال میں

اس کا ستارا اب ہے یقیناً زوال میں

انسان بٹ گیا ہے جنوب و شمال میں

سچ ہے، عزیز ہوتی ہے ہر اپنی شے مگر

ہے دلکشی کچھ اور ہی مسروقہ مال میں

اُڑنے کا نام لیتا نہیں پھر وہ عمر بھر

طائر جو آ پھنسے کوئی اِس مایا جال میں

اب اُن سے کیا اُمید کہ آیا بھی ہے کبھی

دامن جواب کا مِرے دستِ سوال میں

اُلجھا رہے گا یہ دلِ ناداں اِسی طرح

کب تک غمِ فراق و نشاطِ وصال میں

جب پوچھتا ہوں کیا ہے کلامِ جگر گداز

کرتے ہیں پیش شعر مِرا ہی مثال میں

جو خود ہی ٹوُٹ جاتی ہے، رکھ دی ہے کس لئے

ایسی کڑی بھی سلسلۂ ماہ و سال میں

اُس رند پر نثار خُم و جام اے ضیا اگر

دیکھے شکستِ توبہ جو شیشے کے بال میں

نئی دہلی – ۱۹۷۶

ٹوُٹی دیوار، ہوا آئی گلستانوں کی

مانگ اے دستِ جنوں، خیر گریبانوں کی

پھُوٹ نکلی ہے رگِ شاخ سے اے ابرِ بہار

پھُول کے بھیس میں رعنائی گلستانوں کی

شکوۂ جورِ زمانہ، گلۂ دوراں سے

بات آگے نہ بڑھی آپ کے دیوانوں کی

ہائے اُس شمع کا انجام، جو چُپکے چُپکے

رات بھر جلتی رہی آگ میں پروانوں کی

پی کے جب رند نکلتے ہیں تو ہر لغزش میں

ٹوُٹ جاتی ہیں حدیں مسجدوں، بتخانوں کی

رنگ لائی ہے عجب وقت کی کجرفتاری

کوئی انسان نہیں بستی میں انسانوں کی

سُن کے اشعارِ ضیا آج سرِ بزمِ سخن

آ گئی وجد میں پھر روح غزلخوانوں کی

نئی دہلی — ۱۹۷٦

گود میں آنسوؤں کی پلتی ہے

اِک ادا زندگی کی یہ بھی ہے

اہلِ دُنیا کی زخم کاری بھی

بہ تقاضائے چارہ سازی ہے

ذرّہ بن جائے کیا عجب سورج

برف خانوں میں آگ ڈھلتی ہے

سائے میں گیسوؤں کے دم لے لوں

دوُر جانا ہے، رات باقی ہے

کل گریزاں تھی موت سے مگر آج

زندگی موت کو ترستی ہے

کوئی نجمِ سحر طلوع بھی ہو

شام کب سے اُداس بیٹھی ہے

میرے جانے کا وقت آ پہنچا

اُن کے آنے میں دیر کتنی ہے

اے ضیا، حُسن و عاشقی کے بغیر

داستانِ حیات ادھوری ہے

تر دامنی سے چاک گریباں ہوئے تو ہیں

اپنے کئے پہ آپ پشیماں ہوئے تو ہیں

آ ہی گئی ہے بے پر و بالی ہمیں بھی راس

دلدادۂ سلاسل و زنداں ہوئے تو ہیں

اب ہو نہ ہو علاج دلِ زخم زخم کا

ظلمت کدے میں جشنِ چراغاں ہوئے تو ہیں

گل بھی کھلینگے، چہکینگے بلبل بھی، باغ بھی

سامانِ اہتمامِ بہاراں ہوئے تو ہیں

جنّت بھی مل ہی جائے گی ساقی بہ فیض جام

دُنیا سے بے نیاز و گریزاں ہوئے تو ہیں

موجوں سے کھیلتے ہوئے جو غرق ہو گئے

بیڑے وہ پار، شورشِ طوفاں ! ہوئے تو ہیں

تحسینِ نا شناس، نہ کچھ پوچھ اے ضیا

اپنے حضور ہم بھی غزلخواں ہوئے تو ہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

اُٹھا جو گِھر کے ابرِ سیہ، جام بھر گئے

رندانِ تشنہ کام کے چہرے نِکھر گئے

محرومِ التفات رہا دل، ہزار بار

نالے زباں پہ آئے مگر بے اثر گئے

دیوانگانِ شوق کی یہ بدحواسیاں

جس راہ میں لُٹے تھے، اُسی راہ پر گئے

کچھ سادہ فکر لوگ سمجھتے ہیں آج بھی

سُولی پہ چڑھ کے حضرتِ منصور مر گئے

شوقِ غلط روی کی پشیمانیاں نہ پوچھ

ساحل کو توڑ پھوڑ کے دریا نکل گئے

دستک درِ حیات پہ کل رات جس نے دی

وہ تو ہوا کا جھونکا تھا، کیوں آپ ڈر گئے

آئے گا کس کو اُن کی تہی دامنی پہ رحم

جو کاسۂ گدائی لئے در بہ در گئے

سایہ بھی سانس لے نہ سکا تپتی دھوپ میں

شاخوں سے پتّے ٹوُٹ کے ہر سوُ بِکھر گئے

کہتے رہے غزل پہ غزل، یوں بھی اے ضیا

بے کار زندگی میں بڑا کام کر گئے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

دل خریدارِ جنسِ ہستی ہے ؟

یہ گراں کل تھی، آج سستی ہے

تابِ نظّارۂ جمال نہیں

آنکھ جلووں کو کیا ترستی ہے

دوستدارِ وفا کا حال نہ پوچھ

تنگ دستی ہے، فاقہ مستی ہے

باغباں کا یہ شوقِ گل چینی

زرد شاخِ چمن پرستی ہے

جو مِرے صحن میں نہیں برسی

وہ گھٹا بھی کہیں برستی ہے ؟

دیر اُجڑتے تو کچھ نہیں لگتی

بستے بستے ہی بستی بستی ہے

اے ضیا سرکشی ہو جس کا مآل

وہ بلندی فریبِ پستی ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۷

چمن والو، ہے یہ بھی کیا زمانہ

نہ بجلی ہے، نہ میرا آشیانہ

مہ و انجم کی شمعیں ہو گئیں گل

ادھورا رہ گیا دل کا فسانہ

کسی کی نیم وا آنکھوں کا جادو

بنا جاتا ہے دل خود ہی نشانہ

نیا سورج، نئے دل میں ارادے

نئی کروٹ بدلتا ہے زمانہ

دھڑکنا دو دلوں کا کہہ رہا ہے

نیاز و ناز کا رنگیں فسانہ

ضیا، یہ پردہ ہائے لفظ و معنی

اُٹھاتی ہے نگاہِ عارفانہ

نئی دہلی — ۱۹۶۸

چلے اب ہوائے زمانہ سنبھل کے

چراغ آرزو کا نہ بُجھ جائے جل کے

سحر خیز کلیوں نے انگڑائیاں لیں

ہوئے دل میں بیدار ارماں مچل کے

ہواؤں نے کالی گھٹاؤں کو چُوما

کئی رند بہکے، کئی جام چھلکے

وہ دامانِ گیتی کی زینت بنیں گے

جو آنسو محبّت کی آنکھوں سے ڈھلکے

رواں جادۂ ارتقا پر ہے دُنیا

کہیں دل مسل کے، کہیں سر کچل کے

مہ و مہر پر دام پھیلا رہا ہے

یہ انساں اُمیدوں کے سائے میں پل کے

پیامِ سحر شب گزیدوں کو دے گا

مِرے چاکِ دامن سے سورج نکل کے

وہاں تک ضیا نور ہی نور ہے اب

جہاں تک نظر آ رہے تھے دھند لکے

چمنیوں سے دھواں نکلتا ہے

دلِ مزدور چپکا بیٹھا ہے

ہجر کا مارا، بھوک کے ڈر سے

رات بھر کروٹیں بدلتا ہے

آ پڑا کام کیوں مشینوں سے

دلِ آہن کہیں پگھلتا ہے

پگھلا سیسہ ہے جن میں مے کی جگہ

اُن پیالوں کا دوَر چلتا ہے

وقت بہروپیا نہیں ہے، تو کیوں

نئے سانچے میں روز ڈھلتا ہے

وہی پاتا ہے منزل اپنی ضیا

جو زمانے کے ساتھ چلتا ہے

بمبئی ــ ۱۹٦٦

گرویدۂ شام ہے صبح یہاں، تنویر اندھیرا مانگے ہے

سمجھا نہ دلِ ناداں اب تک دُنیا اُس سے کیا مانگے ہے

احساسِ غم و شادی نہ رہے، قرب و دوُری کا بھید مِٹے

یہ گردشِ پیہم تاروں کی اِک ایسا بھی لمحہ مانگے ہے

دُنیا کی دورنگی سے آخر تنگ آ ہی گیا دل انساں کا

یا رقصِ دوام بگولوں کا، یا قلقلِ مینا مانگے ہے

راتوں میں سجائی تھی جس نے محفل پردیسی خوابوں کی

وہ تیرہ بخت خدا جانے کیوں دِن میں اندھیرا مانگے ہے

یاس و ناکامی نے آخر منہ میں گونگوں کے زباں رکھ دی

ذرّہ ہے سورج کا جویا اور قطرہ دریا مانگے ہے

جنّت کھو کر دُنیا پائی، اے جذبِ محبّت توُ ہی بتا

کیا لے کے کروں عقبیٰ کو جو مجھ سے مِری دُنیا مانگے ہے

اس کار گہِ ہستی میں ضیا مصروفِ عمل ہیں شام و سحر

ہوتا ہے وہی جو ہونا ہے، تُو اچھا بُرا کیا مانگے ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۱

بجلیوں نے کیا پایا آگ میں جلانے سے

عشرتِ بہاراں تھی میرے آشیانے سے

آدمی نے لی کروٹ انقلاب آنے سے

میری چینخ ٹکرائی تیرے شادیانے سے

انتقام لینا ہے سنگدل زمانے سے

میں شروع کرتا ہوں عشق کے فسانے سے

اے نفس تِری خاطر صبح و شام جیتا ہوں

زندگی غنیمت ہے تیرے آنے جانے سے

لے کے نُور آ پہنچا، کائنات جاگ اٹھی

آفتاب کیا چھپتا رات کے چھپانے سے

آؤ بیٹھ کر اک دن کوئی فیصلہ کر لیں

امن لاکھ اچھا ہے جنگ آزمانے سے

زندگی کے در پردہ جانے کیا حقیقت ہے

موت بھی جب آتی ہے تو کسی بہانے سے

میں تجھے بُھلا تو دوں، کیا کروں مگر اس کو

خود کو بُھول جاتا ہوں، تیرے یاد آنے سے

جب نئے زمانے کا ذکر کوئی کرتا ہے

ذہن میں اُبھرتے ہیں واقعے پُرانے سے

اب فقط یہی شے تو تیرے کام آئے گی

سیکھ لے ریاکاری اے ضیا زمانے سے

پانوں رکھتا ہوں سنبھل کر راہ میں

رسّیاں بیٹھی ہیں جل کر راہ میں

ٹھوکریں مارو کہ سینے سے لگاؤ

آ گیا گھر سے نکل کر راہ میں

جانے کیوں دستِ صبا نے پھینک دیں

پتّیاں گل کی مسل کر راہ میں

خاکِ نقشِ پا سے تھی نسبت کوئی

گِر پڑے آنسوُ مچل کر راہ میں

منزلیں رہتیں کنواری ہی اگر

بیٹھ جاتے دل دہل کر راہ میں

رات کی چینخوں کے پیکر بن نہ جائیں

شام کے کچھ سائے ڈھل کر راہ میں

سامنے آتے ہیں کیوں ہر گام پر

اے ضیا منظر بدل کر راہ میں

بمبئی — ۱۹٦۹

پا شکستہ تھا خامہ مانی کا

نقش ادھورا رہا جوانی کا

ڈھُونڈ ہی لیں گے میرے بعد احباب

کوئی عنواں مِری کہانی کا

یاس، حسرت، ملال، نومیدی

ہائے انجام شادمانی کا

اُس طرف کیوں نہ موڑ دوں کشتی

جس طرف ہو بہاؤ پانی کا

حادشاتِ زمانہ لے بھی چُکے

امتحاں میری سخت جانی کا

لفظ سے کیا بیاں ہو حالِ دل

لفظ تو پردہ ہے معانی کا

مختلف ہے، مقابلہ نہ کریں

نقشِ اوّل سے نقشِ ثانی کا

اُن کی محفل میں ذکر چل نکلا

اے ضیا ! تیری خوش بیانی کا

نئی دہلی — ۱۹۷۲

لوُٹ لیا دل اِک گوری نے پنگھٹ پر

چونک اُٹھتا ہوں سوتے میں ہر آہٹ پر

شمعِ لحد کا کس نے پگھلنا دیکھا ہے

جلتی چتائیں سب نے دیکھی مرگھٹ پر

ساغر میں بھر کر میخانہ پی گئے لوگ

ٹال دیا ساقی نے ہم کو تِلجھٹ پر

بوُڑھا سُورج تاک لگائے بیٹھا ہے

تاروں کے اک ننھے مُنھے جھُرمٹ پر

آج بھی ٹکراتا ہے دل سے وہی نغمہ

چھیڑ دیا تھا تم نے جسے کل پنگھٹ پر

ڈُوبی جب منجھدہار میں میری ناؤ ضیا

میں بیٹھا تکتا تھا دریا کے تٹ پر

نئی دہلی ــ ۱۹۷۲

رکھا ہے میں نے تیرہ نصیبی کا نام شب

مجھ سے ہے تپتی دھُوپ میں بھی ہمکلام شب

اُن کا تو کچھ پتا نہیں، اے چارہ گر نہ پوچھ

اپنی فغاں و نالہ میں گزری تمام شب

پا سوز آفتاب کے آتشکدے میں، دن

خوابوں کے برف زار میں محوِ خرام، شب

وعدے کا اعتبار نہیں، تو بھی دل مِرا

اس انتظار میں ہے کہ کب ہوگی شام شب

ڈرتا ہوں لگ نہ جائے نظر مہتاب کی

سج دھج کے آج بیٹھی ہے بالائے بام شب

شب سے لگاؤ ٹھیک تو دن سے بجا گریز

نا پائیدار دن ہے مگر ہے مدام شب

شوق و اُمید و عزم کا گہوارہ، تیرگی

ارمان و آرزو کا شبابِ دوام شب

کرتا ہوں اس لئے مے و مینا بہم ضیا

کٹتی نہیں کسی کی بغیر اہتمام شب

نئی دہلی — ۱۹۷۲

کارگہہِ ہستی میں تھا جو ممکن،میں نے کام کیا

فکر نہ کی آغاز کی مطلق، کچھ نہ غمِ انجام کیا

ہوش و خرد نے انساں کے دل میں بویا نفرت کا بیج

ہوش و خرد کو ہم نے نذرِ جامِ مئے گلفام کیا

اُس دہکاں کی بات ہے جس نے دست و بازو کے بل پر

پودا پودا خون سے سینچا، دانہ دانہ دام کیا

تیرے جسم کی خوشبوؤں سے میری خلوت مہکے گی

حیراں ہوں کیوں بھولے دل نے ایسا خیالِ خام کیا

یہ بھی کبھی تم نے سوچا ہے جس پر سر دھُنتا ہے پھُول

بلبل کے اُس درد بھرے نغمے کو کس نے عام کیا

سچ نے جھُوٹ کے کالے دل کو چھید دیا بانوں سے ضیا

ڈھا ہی دی سونے کی لنکا، راون مارا، رام کیا

نئی دہلی – ۱۹۷۲

سجدوں کی جبیں اور، بغاوت کا ہے سر اور

تسلیم کا دل اور، شکایت کا جگر اور

تھم جاتی ہے جب گردشِ پیمانہ و ساغر

بڑھ جاتی ہے کچھ کشمکشِ شام و سحر اور

ہوتا نہ کبھی طور پہ رُسوا تِرا جلوہ

مل جاتی اگر حضرتِ موسیٰ کو نظر اور

کِھلتا ہے کوئی پھُول، تو سر پھوڑ کے اپنا

دیوار میں زنداں کی بنا لیتا ہوں در اور

ڈرتا ہوں کہیں پانوں میں آ جائے نہ لغزش

باقی ابھی کتنا ہے محبّت کا سفر اور

ہر پیڑ ہے آسیب تو ہر شاخ ہے تلوار

تنہائی میں بڑھ جائے نہ کیوں خوف و خطر اور

لب بستہ ضیا ہوں، کہ ہے جلووں کا تقاضا

اُلجھی رہے پردوں ہی میں کچھ روز نظر اور

نئی دہلی — ۱۹۷۲

کوئی گزرا ہے اِدھر سے شہسوارِ کہکشاں

اُڑ رہی ہے ہر طرف گرد و غبارِ کہکشاں

ٹہنی ٹہنی پر ہیں روشن رنگ و نکہت کے چراغ

رقص فرما پتّی پتّی پر بہارِ کہکشاں

روشنی میں دن کے بُنتی رہتی ہے خوابوں کے جال

اور جاگ اُٹھتی ہے شب میں رہگزارِ کہکشاں

اس کے رگ رگ میں ہزاروں آفتابوں کا لہو

ہے یدِ بیضا سے بڑھ کر شاخسارِ کہکشاں

ظلمتیں ہی ظلمتیں ہوں گی ضیا ہر سُو مُحیط

رفتہ رفتہ اُٹھ گیا جب اعتبارِ کہکشاں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

طرب سے بھر گیا جب دل، ترب خانے کا کیا ہوگا

نہ ہوگی تشنگی باقی، تو پیمانے کا کیا ہوگا

کسی کی کم نگاہی کا صلا معلوم ہے، لیکن

دلِ درد آشنا انجام غم خانے کا کیا ہوگا

یونہی بنتی رہیں صحراؤں میں جو بستیاں ہردم

تو پھر مجھ خانماں برباد دیوانے کا کیا ہوگا

نہ پائی ابتدا اہلِ جنوں نے آج تک جس کی

خدا معلوم انجام ایسے افسانے کا کیا ہوگا

لہو دے کر ہی رکھ لی آبروئے گل، نہیں سوچا

بہار آئی گلستاں میں تو کاشانے کا کیا ہوگا

یہ آنا کوئی آنا ہے، یہ جانا کوئی جانا ہے

خوشی آنے کی کیا ہوگی، الم جانے کا کیا ہوگا

دُلہن بن کر سجی بیٹھی ہے بزمِ شب، ضیا دیکھیں

فریبِ شمعِ سوزاں کھا کے پروانے کا کیا ہوگا

بمبئی — ۱۹٦۹

زندگی بھی شراب ہے پیارے

تلخیِ بے حساب ہے پیارے

جس کا تھا انتظار مدّت سے

یہ وہی انقلاب ہے پیارے

ہم جو ناکام ہیں، تو کیا غم ہے

امتحاں کامیاب ہے پیارے

شب کی تاریکیوں کا ذکر نہ چھیڑ

آمدِ آفتاب ہے پیارے

آج تک میرے لب پر آ نہ سکی

جو دعا مستجاب ہے پیارے

حُسن، تکمیلِ آرزوئے نظر

عشق، رازِ شباب ہے پیارے

تیرا دیوانہ یعنی تیرا ضیا

کتنا خانہ خراب ہے پیارے

کیا لئے پھرتا ہے صحرا میں جنوں

کیوں نہ اب دیوار سے سر پھوڑ لوں

نا شناسائی کا کیا اُن سے گلہ

میں تو خود نا آشنا اپنے سے ہوں

برف زاروں میں رہو یخ بستہ تم

میں بھی تپتی دھوپ میں جلتا رہوں

مقصدِ ہستی یہی ہے روز و شب

تُو مجھے اور میں تجھے دیکھا کروں

اے مِری منزل، ذرا آگے تو بڑھ

اور کتنی دُور میں تنہا چلوں

دیکھ تُو کھڑکی سے باہر جھانک کر

کب سے تیرے در پہ ہوں میں سر نگوں

صبح کے آثار پیدا ہیں ضیا

ٹوُٹنے کو اب ہے راتوں کا فسوں

بمبئی — ۱۹٦۹

ہم کو تم سے، تم کو ہم سے کام ہے

کارِ دُنیا تو برائے نام ہے

یہ جو پیہم گردشِ ایام ہے

اک مسلسل کوششِ نا کام ہے

پر شکستہ طائروں کی بے ہِسی

خوفِ زنداں ہے، نہ فکرِ دام ہے

خاص ہے گو دستِ ساقی کا کرم

چشمِ ساقی کی عنایت عام ہے

ظلمتِ شب، روزِ روشن کی دلیل

صبح کے آنگن میں رقصِ جام ہے

جانے کیوں وہ رنگِ میخانہ نہیں

رند ہے، ساقی ہے، مے ہے، جام ہے

یہ ضیا، یہ بندۂ صدق و صفا

بد نہیں، لیکن بہت بدنام ہے

نئی دہلی –

۱۹۶۶

چاکِ گریباں، چاکِ گریباں

صبحِ بہاراں، صبحِ بہاراں

تیرہ و تاباں، تیرہ و تاباں

پیکرِ انساں، پیکرِ انساں

دل کی دھڑکن، دل کی دھڑکن

درد کا ساماں، درد کا ساماں

ناؤ کھویا، ناؤ کھویا

موجۂ طوفاں، موجۂ طوفاں

جھوٹی تسّلی، جھوٹی تسّلی

وعدہ و پیماں، ویدہ و پیماں

حُسن کی آمد، حُسن کی آمد

عشق غزلخواں، عشق غزلخواں

روشن روشن، مدّھم مدّھم

شمعِ شبستاں، شمعِ شبستاں

گلشن گلشن، محشر محشر

حسن خراماں، حسن خراماں

حُسن و محبّت، حُسن و محبّت

دست و گریباں، دست و گریباں

جادہ جادہ، منزل منزل

شوقِ فراواں، شوقِ فراواں

مست و غزلخواں جانِ ضیا بھی

جانِ ضیا بھی مست و غزلخواں

مدراس ــ ۱۹۵۸

کیا بہار آئی چمن میں کھُل گئیں

لالہ و گل کی نِرالی کِھڑکِیاں

ماہ وانجم دیکھ کر یاد آ گیا

خواب میں دیکھی تھیں ایسی کِھڑکِیاں

کون کھولے گا گرہ جذبات کی

بند ہیں جب تک دِلوں کی کِھڑکِیاں

بن سنور کر بیٹھی ہیں، دیکھے کوئی

گرتی دیواروں میں بوُڑھی کِھڑکِیاں

ڈبڈباتے ہیں ستارے اس طرح

جیسے کھُلتی، بند ہوتی کِھڑکِیاں

وہ مجاہد ہوں کہ دیواروں کے ساتھ

توڑ کر رکھ دی ہیں ساری کِھڑکِیاں

یوں تو مشکل ہے، وہیں چل کر گِنیں

آسمانوں میں ہیں کِتنی کِھڑکِیاں

آج وہ بازار میں ہے، جس کی کل

کر رہی تھیں پردہ داری کِھڑکِیاں

جو نہ دروازوں کے لب پر آ سکی

کہہ رہی ہیں وہ کہانی کِھڑکِیاں

اُن سے اب آتی ہے لاشوں کی سڑاند

بند کر دو یہ پُرانی کِھڑکِیاں

مدّتوں کا ساتھ ہے پھر بھی ضیا

لگتی ہیں کچھ اجنبی سی کِھڑکِیاں

بمبئی ــ ١٩٦٧

بیٹھا ہے پانو توڑ کے کنجِ مزار میں

اب زندگی کہاں ہے دلِ داغدار میں

یہ زلزلے، یہ برق، یہ طوفاں، یہ آندھیاں

کیا اور کچھ نہیں ہے تِرے اختیار میں

حیرت سے دیکھتا ہے کِسے آئینہ یہاں

کون اجنبی ہے میرے سِوا اِس دیار میں

محرومِ فیضِ ابرِ بہاراں ہیں کس لئے

جو امتیاز کرتے ہیں گل اور خار میں

اپنی بھی آدمی کو نہیں اب کوئی خبر

اُلجھا ہوا ہے فکر و غمِ روزگار میں

یہ اور بات ہے کہ ہوں ممنونِ دست و پا

شامل تو ہیں دعائیں بھی تکمیلِ کار میں

اُس لالہ رخ نے رخ سے اُلٹ دی ضیا نقاب

اب کیوں نہ ہو ضیا ہی ضیا لالہ زار میں

نئی دہلی — ۱۹۷۷

یا رب، شبِ حیات کی کیا ہے سحر کہیں

میں تھک گیا ہوں، ختم بھی ہو اب سفر کہیں

پائے اگر جگہ، تو ملے دل کو کچھ سکون

آغوشِ گل میں بلبلِ شوریدہ سر کہیں

شکوہ سرائے پیچ و خمِ رہ، خبر بھی ہے

منزل کہیں ہے، ڈھُونڈ رہی ہے نظر کہیں

یہ ہوش و آگہی کی گھُٹن، دم نکل نہ جائے

لے چل ہوائے موسمِ دیوانہ گر کہیں

کیا دوں دلِ حزیں کو تسّلی، ہُوا بھی ہے

اے چارہ ساز، چارۂ دردِ جگر کہیں

دھڑکن بھی دل کی بند ہوئی، اشک بھی رُکے

لیکن تھمی نہ گردشِ شام و سحر کہیں

آغاز و انتہا کی ہے بات اور، اے ضیا

ہے داستاں طویل کہیں، مختصر کہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

دُشوار کارِ زیست تھا، آساں نہ ہو سکا

شایانِ شانِ محفلِ امکاں نہ ہو سکا

بھر دیتا میرے جام میں زہرابِ زندگی

تجھ سے تو یہ بھی ساقیِ دوراں نہ ہو سکا

تنہائیِ قفس کو اُسی کی تلاش ہے

جو مُرغ شاخِ گل پہ غزلخواں نہ ہو سکا

اللہ رے یہ وسعتِ آغوشِ غم کہ دل

شکوہ گزار تنگیِ داماں نہ ہو سکا

تجھ کو جفا پسند تھی، مجھ کو وفا عزیز

جو تیرا دین تھا، مِرا ایماں نہ ہو سکا

اب آدمی کی پستیِ کردار کچھ نہ پوچھ

انسان بن گیا مگر انساں نہ ہو سکا

ارماں بغیر مل نہ سکا دل کا کچھ سُراغ

پیدا بغیرِ دل کوئی ارماں نہ ہو سکا

پگھلی نہ برف یادوں کی جس دل میں اے ضیا

وہ موج موج ہی رہا، طوفاں نہ ہو سکا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

اپنا دستِ دعا کھینچ لوں دوستو

بُت بھرم کا نہ کیوں توڑ دوں دوستو

کچھ سمجھ سوچ کر ہی تو نکلا تھا میں

مفت جنّت بھی دیں تو نہ لوں دوستو

آج آمادۂ سرکشی ہے وہی

تھا جو دیوانہ کل سر نگوں دوستو

چاہتے ہیں وہ میں اُن کا ہو کر رہوں

میری خواہش کہ اپنا بنوں دوستو

موت کے بعد اگر مل گیا بھی تو کیا

جیتے جی جب نہ پایا سکوں دوستو

جیسے ہوں اجنبی اپنے ہی شہر میں

مجھ سے ملتے ہیں لوگ آج یوں دوستو

آ رہی ہے سحر، رات کے ساز پر

کیا ضیا کی غزل چھیڑ دوں دوستو

بمبئی — ۱۹٦۸

تنہائیوں کے درد سے دل کیوں نڈھال ہے

اب کیا جواب دوں کہ یہ ٹیڈھا سوال ہے

اللہ رے یہ کشمکشِ مرگ و زندگی

جینا نہیں ہے سہل تو مرنا محال ہے

میں ہوں نیازمند، یہ میرا کمالِ شوق

تُو بے نیاز، یہ تِرا حُسنِ کمال ہے

اُبھریں گے اُس سے تازہ مہ و مہر ایک دن

میری جبیں پہ جو عرقِ انفعال ہے

جلتے ہیں داغ، دل کے مقابل ہے آئینہ

اے سادگیِ شوق ! تِرا کیا خیال ہے

دل کو سکوں ملا، نہ ملے گا کبھی ضیا !

گردش میں روز و شب فلکِ پیر سال ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۳

نگاہ شوق، رُسوائی کا ڈر ہے

چمن کا غُنچہ غُنچہ خود نگر ہے

ہُنر کی عیب جوئی، اللہ اللہ

عجب کوتاہیِ اہلِ نظر ہے

میں تم سے دوُر ہی کتنا ہوں، دیکھو

وہ اُن پیڑوں کے پیچھے میرا گھر ہے

گلی کے موڑ پر ملتا ہے اکثر

وہ دیوانہ جو اپنی راہ پر ہے

اُفق سے تا اُفق روُداد میری

مگر یہ قصّہ کتنا مختصر ہے

اُجالی ہیں کئی راتیں اسی نے

ضیائے خستہ اب شمع سحر ہے

نئی دہلی — ۱۹۷٦

ایک دو گھُونٹ مے جو پی میں نے

ساری مستی سمیٹ لی میں نے

تیری دُنیا سنوارنے کے لئے

اپنی دُنیا اُجاڑ دی میں نے

بگڑے بیٹھے ہیں، مانتے ہی نہیں

بات ایسی بھی کیا کہی میں نے

خود ہی آواز موت کو دی ہے

مانگ کر تجھ سے زندگی میں نے

بھیک غم کی جو تیرے در سے ملی

اہلِ دل میں وہ بانٹ دی میں نے

کیا کہوں، کس نظر سے دیکھی ہے

شام سے راہ صبح کی میں نے

پھر بھی پایا نہ اپنے گھر کا پتہ

چھان ماری گلی گلی میں نے

جان میں کیا رکھا تھا غم کے سِوا

جان دے دی خوشی خوشی میں نے

غیر مانوس سی لگی مجھ کو

اپنی آواز جب سُنی میں نے

سانس لینے کو رُک گیا دم بھر

پائی کھڑکی کوئی کھُلی میں نے

کی اندھیروں میں اے ضیا اکثر

دل جلا کر ہی روشنی میں نے

بمبئی — ۱۹٦۹

دُنیا مجھے ہر دوَر میں دُہراتی رہی ہے

میری ہی کہانی ہے جو تاریخ بنی ہے

کیا ہستیِ فانی سے کروں ترکِ تعلق

موہوم سی اُمیدِ حیاتِ ابدی ہے

جس شاخ پہ اُمید کے گل میں نے کِھلائے

وہ شاخِ شجر ٹوُٹ کے دھرتی پہ گِری ہے

سُنسان سے ماحول میں سر گوشیاں کیسی

میں چُپ ہوں مگر میری انا بول رہی ہے

اس قلعۂ ہستی سے نکل جانا ہے مشکل

دیوار کے پیچھے بھی تو دیوار کھڑی ہے

اب کھول دو کھڑکی کہ تپش دل کی ہو مدّھم

نمناک ہوا ہے، کہیں برسات ہوئی ہے

کھائی ہے جہاں راہِ وفا میں کوئی ٹھوکر

آواز مجھے میرے ہی ماحول نے دی ہے

تم نے بھی تو بدلی نہیں خو اپنی ابھی تک

میں بھی ہوں وہی، دل بھی وہی، غم بھی وہی ہے

ممنونِ کرم کیوں نہ ہوں احباب کا، مجھ پر

احسان نہیں کوئی بھی، احسان یہی ہے

احساس ہے تنہائیوں کا بھیڑ میں مجھ کو

خوش ہوں کہ ضیا رونے کو اِک عمر پڑی ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

رگِ احساس مضرابِ جنوں نے چھیڑ دی ہوگی

ہوا ہوگا لہو دل، تو غزل میں نے کہی ہوگی

وہ لمحہ جب شناسائی غمِ دل سے ہوئی ہوگی

بڑی حیرت سے دُنیا میری صورت تک رہی ہوگی

نہ جانے برہمی پینے پلانے پر ہے کیا ساقی

جو مے تُونے پلائی تھی، وہی تو میں نے پی ہوگی

اکٹھا کر رہا ہوں ٹوُٹے دل کے بکھرے ٹکڑوں کو

یہی ہے ابتدا تو انتہا کیا ضبط کی ہوگی

بھروسہ تھا تِری رحمت کا، ورنہ جانتا تھا میں

گنہ جتنا بڑا ہوگا، سزا اُتنی کڑی ہوگی

ابھی تک شہر کی گلیوں میں پھرتا ہوں میں آوارہ

وہ کوئی اور ہی ہوگا، جسے ٹھوکر لگی ہوگی

شجر بے برگ، گُل بیرنگ، مے بے کیف، غم بیدل

یقیناً وقت کی تُند اور تیز آندھی چلی ہوگی

بہارِ حُسنِ گلشن دوُر ہی سے دیکھنے تک ہے

نزاکت کی کلی تو چھُوتے ہی مُرجھا گئی ہوگی

اُٹھا کر دیکھتا کیوں اے ضیا معلوم اگر ہوتا

جو آئینہ دکھائے گا وہ صورت میری ہی ہوگی

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

دیتا اگر فلک نہ غمِ نا گہاں مجھے

آتا نہ راس عشق بغیر امتحاں مجھے

اس ریگ زارِ غم میں تو دیوار ہے نہ در

پھینکا ہے لا کے وحشتِ دل نے کہاں مجھے

اب درمیاں حجابِ بہار و خزاں نہیں

اب کیا ہو امتیازِ بہار و خزاں مجھے

گرتے اگر فلک سے ستارے نہ ٹُوٹ کر

ارزاں متاعِ زیست نہ ہوتی گراں مجھے

اک بے ارادہ لغزشِ پا کے قصور میں

منزل سے دُور چھوڑ گیا کارواں مجھے

جس وقت ہوگی کوئی کنواری کرن طلوع

صحنِ چمن میں پاؤگے تم نغمہ خواں مجھے

شہرِ اجل کی گلیوں میں حرکت نہ روشنی

کھو کر حیات ڈھونڈ رہی ہے کہاں مجھے

اب تشنگی دکھاتی رہی ہے تمام رات

قطرے میں رقصِ موجۂ آبِ رواں مجھے

یہ جانتا تو کہتا نہ دُنیا سے حالِ دل

سُننی پڑے گی اُن سے مِری داستاں مجھے

سیماب کی نگاہ کا یہ فیض ہے ضیا

کب ورنہ کچھ سمجھتے تھے اہلِ زباں مجھے

نئی دہلی – ۱۹۷۳

دل وہی شادکام ہوتا ہے

کام جس کا تمام ہوتا ہے

تیری نفرت، مِری محبّت کا

کہیں قصّہ تمام ہوتا ہے

لغزش آئے نہ پائے ہمّت میں

وقت تو تیزگام ہوتا ہے

اُس کو اُتنا مقام دیتے ہیں

جس کا جتنا مقام ہوتا ہے

خونِ دل پی کے کامراں آخر

جذبۂ انتقام ہوتا ہے

جس کی آنکھوں میں ہوتی ہے مستی

اُس کے ہونٹوں پہ جام ہوتا ہے

وہی زندہ ہے بعدِ مرگ ضیا

کام سے جس کا نام ہوتا ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۳

شبِ غم موت اگر نہیں آتی

کیوں نویدِ سحر نہیں آتی

تیری نظروں نے کیا پلا دی ہے

ہوش کی بات کر نہیں آتی

چاند کی وہ کرن جو خواب بنی

جاگتے میں نظر نہیں آتی

کھڑکیاں دل کی کھول رکھی ہیں

اب ہوا ہی ادھر نہیں آتی

غم تو یہ ہے کہ میرے غم کی دوا

تجھے اے چارہ گر نہیں آتی

دل کے صحرا میں یاد کی آندھی

کیا سمجھ سوچ کر نہیں آتی

ناخدا کس کنارے اب اُتروں

موجِ طوفاں کدھر نہیں آتی

اے ضیا اس زمینِ غالب میں

بات بنتی نظر نہیں آتی

نئی دہلی – ۱۹۷۳

حریصِ لذّتِ مبہم دکھائی دیتا ہے

زوالِ حضرتِ آدم دکھائی دیتا ہے

فروغِ دیدۂ پُرنم دکھائی دیتا ہے

چراغِ بادہ بھی مدّھم دکھائی دیتا ہے

یہ زخم زخم دلِ تار تار پیراہن

فریب خوردۂ مرہم دکھائی دیتا ہے

وہ ایک بار جو اُترا تھا دل میں آنکھوں سے

خیال و خواب میں پیہم دکھائی دیتا ہے

ہمیں تو لگتا ہے اپنے ہی دل کا غم وہ بھی

کسی کے سینے میں جو غم دکھائی دیتا ہے

مثالِ برق وہی گرتا ہے نشیمن پر

جو گل پہ قطرۂ شبنم دکھائی دیتا ہے

ہو کیا اُمید قرار و سکوں ، کہ پیرِ فلک

خرابِ گردشِ پیہم دکھائی دیتا ہے

وہ اور ہوں گے جو راتوں میں دیکھ لیتے ہیں

ہمیں تو دن میں بھی کم کم دکھائی دیتا ہے

جو کل ہوا میں اُڑاتے تھے آنچل، آج ضیا

اُنہی کے ہاتھوں میں پرچم دکھائی دیتا ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

ہوں پا شکستہ جادۂ ہموار دیکھ کر

جلتی ہے دھوپ، سایۂ دیوار دیکھ کر

گزری شعاعِ مہر پہ جو صبحدم نہ پوچھ

شبنم کو بوئے گُل کی خریدار دیکھ کر

یہ شہرِ آرزو ہے، یہاں رکھتے ہیں قدم

دل داد گانِ لذّتِ آزار دیکھ کر

شاید نگاہِ جلوہ طلب کو خبر نہیں

بڑھتی ہے اور حسرتِ دیدار، دیکھ کر

آئےگا کس کو میری نظر پر اب اعتبار

تیری نظر میں وقعتِ اغیار دیکھ کر

اچھا ہوا کہ ختم ہوئیں دل کی دھڑکنیں

عشق و ہوس کو بر سرِ پیکار دیکھ کر

رحمت کی بے پناہی پہ آتا نہ کیوں یقیں

جو پارسا تھے، اُن کو گنہگار دیکھ کر

ہیں خار و گُل بھی، شعلہ و شبنم بھی اے ضیا

کھولے گی آنکھ نرگسِ بیمار دیکھ کر

نئی دہلی — ۱۹۷۶

موت سچّائی ہے، سچّائی کو جھُٹلاتا ہوں میں

زندگی دھوکا ہے، دھوکا جان کر کھاتا ہوں میں

میں ہوں پا مالِ جفا اور دل ہے مجبورِ وفا

مجھ کو سمجھاتا ہے دل، اور دل کو سمجھاتا ہوں میں

فیصلہ اِس بات کا بھی ایک دن ہو جائے گا

ظلم سہتا ہوں کہ خود پر ظلم فرماتا ہوں میں

کجکلاہوں کی تغافل پیشگی کا شکریہ

اپنی آغوشِ توجہ میں سکوں پاتا ہوں میں

ساقیا اب ہے تِری دریا دِلی کا امتحاں

ابرِ میخانہ کی صورت جھُومتا آتا ہوں میں

حاملِ حُسنِ قدامت ہے مِرا رنگِ غزل

داستانیں شمع و پروانہ کی دُہراتا ہوں میں

پیاس کا صحرا ہوں، ان کالی گھٹاؤں کی قسم

قطرے قطرے کے لئے دریا کو ترساتا ہوں میں

جس قدر کھنچتا ہوں اُن سے، جانے کیوں اُتنا ضیا

خود بخود اُنکی طرف کھنچتا چلا جاتا ہوں میں

نئی دہلی — ١٩٧٤

یوں حسرتوں کی گرد میں تھا دل اٹا ہوا

جیسے درخت سے کوئی پتّہ گرا ہوا

کس طرح مجھ کو ملتا مِرے سائے کا سُراغ

ہر سمت ظلمتوں کا تھا جنگل اُگا ہوا

کل رات خواب میں جو مقابل تھا آئینہ

میرا ہی قد مجھے نظر آیا بڑھا ہوا

جانے بھی دو، وہ ہو ہی نہیں سکتا میرا چاند

پامالِ آدمی جو ہوا، چاند کیا ہوا

باہر کے شور و غُل ہی سے شاید وہ بول اُٹھے

بیٹھا ہے کب سے چُپ کوئی اندر چُھپا ہوا

ناحق کُریدتے ہو مِرے دل کی راکھ اب

ایسا نہ ہو بھڑک اُٹھے شعلہ دبا ہوا

اِس انتظار میں ہوں کہ اُترے تو کچھ کہوں

جذبات و حسّیات کا دریا چڑھا ہوا

پہچانے کون خود کو کہ آئینہ خانے میں

ہر چہرے پر ہے دوسرا چہرا لگا ہوا

پنچھی اُڑا تو ختم بھی ہو جائےگا ضیا

سانسوں کے آنے جانے کا تانتا بندھا ہوا

نئی دہلی ــ ۱۹۷٦

رنگ و نور

ضیا فتح آبادی کی ۱۵٦ غزلیں

انتخاب و ترتیب : جگدیش بھٹناگر حیات

نا شر : بزمِ سیماب

سنِ اشاعت ۱۹۸۰

شاعری کسی بھی زبان میں کی جائے وہ گہرے انسانی جذبات کی ترجمانی بن جاتی ہے اُس میں فکر و نظر بھی شامل ہو جاتے ہیں تو اُس کی اہمیت آفاقی ہو جاتی ہے- ضیا فتح آبادی لگ بھگ عرصہ پچاس سال سے انہی انسانی جذبات اور دانشورانہ فکر و نظر کے تجربات میں سے گزر رہے ہیں- مجھے اُن کی شاعری میں ایک ایسی گہرائی اور وسعت محسوس ہوتی ہے جو صرف سمندروں اور آسمانوں میں ہی مل سکتی ہے-

رام لعل

لب پہ آئی غزل برائے غزل

ہم سخن کون ہے سوائے غزل

ذرّہ ذرّہ دکھائے جلوۂ طور

غنچہ غنچہ مجھے سُنائے غزل

کہہ رہا ہوں جو آج، کل شاید

اُن کی محفل میں بار پائے غزل

سازِ دل چھیڑ دو کہ ماہ تمام

رقص میں آئے اور گائے غزل

روزِ روشن میں گرمیاں بھر دے

اور شب میں دِئے جلائے غزل

رُکتی، چھُپتی، لجاتی، جیسے دُلہن

خلوتِ ذہن میں در آئے غزل

اے ضیا، دل کو دے پیامِ درد

حُسن کو آئینہ دکھائے غزل

بمبئی — ۱۹٦۷

مجھ پہ جب ہوگی تِری چشمِ کرم جانِ غزل

دیکھ لوُں گا صُورت تکمیلِ سامانِ غزل

اہلِ دل کو کیوں نہ کر لے دامِ گیسو کا اسیر

لعبتِ اردو کہ ہے خود صیدِ پیکانِ غزل

چاکِ دامانِ غزل سے پھوٹی سورج کی کرن

اور اب کیا چاہیے تجھ کو شناخوانِ غزل

جب بنا لے برق شاخِ گل پہ اپنا آشیاں

چھیڑ دے اُس وقت کوئی سازِ عرفانِ غزل

یہ فسونِ کیف و مستی، یہ طلسمِ حُسن و عشق

یہ نمودِ رنگ و نکہت زیرِ دامانِ غزل

میرو سودا، ذوق و غالب، مومن و داغ و امیر

محسنِ اردو ہیں سب، اُن پر ہے احسانِ غزل

دیکھنے کی شے بنی پھر گرمئی بازارِ شعر

طبح ہو کر آ گیا ہے کس کا دیوانِ غزل

نظم نے پھیلا دیے دامِ افادیت مگر

اے ضیا، ہے روز افزوں آج بھی شانِ غزل

نئی دہلی — ۱۹۷۹

آشاؤں کا سُورج نکلا، خوابیدہ انساں جاگے گا

عزم و عمل کے بُت خانوں سے عفریتِ ظلمت بھاگے گا

ظلم کی زنجیریں ٹوٹیں گی، جشن منائے گی آزادی

عشق و وفا کا پاک و نازک جذبہ پھر دل میں جاگے گا

ایسے موڑ پہ آ پہنچا ہے چلتے چلتے آج مسافر

پیار کی جوت جگا کر دل میں نفرت کی اگنی تیاگے گا

رات کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں صبح کھڑی کچھ سوچ رہی ہے

کھا کر طوفانوں کے تھپیڑے کب مظلوم انساں جاگے گا

آدم کو معلوم تو ہوگا اُس کا پیارا بیٹا اک دن

جنّت کی موہوم اُمیدیں اپنا کر دُنیا تیاگے گا

منزل تو ہے تیز رووں کی، ٹھوکر کھانے سے کیا ڈرنا

محکم عزم مسافر ہی تو گِر کے اُٹھے گا اور بھاگے گا

تاریکی سے ضیا یہ کہہ دو، خون سے شمعیں روشن ہونگی

دل نے گھر میں آگ لگائی، آگ سے ڈر کر کیا بھاگے گا

اجنبی دُنیا میں تیرا آشنا میں ہی تو تھا

دی سزا تُونے جسے، وہ بے خطا میں ہی تو تھا

میں جو ٹوُٹا، ہو گیا ہنگامۂ محشر بپا

تارِ سازِ بے صدا و بینوا میں ہی تو تھا

نا خدا و موجِ طوفاں کی شکایات کیا کروں

جس نے خود کشتی ڈبو دی اے خدا میں ہی تو تھا

اُس کو باہر لا کے رُسوا کر دیا بازار میں

جو مجھے اندر سے دیتا تھا صدا میں ہی تو تھا

ہو گیا مسرور بت اپنی انا کا توڑ کر

درمیانِ ما و تو اک فاصلا میں ہی تو تھا

تا ابد کرنا پڑے گا صبح نو کا انتظار

منتظر روزِ ازل سے شام کا میں ہی تو تھا

تھا ضیا احساسِ تنہائی بھری محفل میں بھی

مجھ میں رہ کر بھی جُدا جو تھا، مِرا میں ہی تو تھا

نئی دہلی — ۱۹۷۹

اشک پلکوں پہ پھر سجاؤں کیا ؟

پھر محبّت کے گیت گاؤں کیا ؟

دل ہی جب بُجھ گیا تو اے شبِ غم

آندھیوں میں دیئے جلاؤں کیا ؟

آفتیں ہیں تو زندگی بھی ہے

آفتوں سے نجات پاؤں کیا ؟

رازدارِ الم، شریکِ غم

در و دیوار کو بناؤں کیا ؟

تیرہ و تار ہے مِری دُنیا

مہر و مہ کا فریب کھاؤں کیا ؟

لاکھ پردے، ہزار چہرے ہیں-

آپ کو اپنے سے چھُپاؤں کیا ؟

یہی نقطہ ہے نکتۂ ہستی

اے ضیا، اب نظر ہٹاؤں کیا ؟

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

اے دلِ ناداں شور و شغب کیا

مجھ کو نہیں ہے پاسِ ادب کیا

بگڑی ہوئی ہے میری ہی قسمت

سویا ہوا ہے میرا ہی رب کیا

دُور ہے منزل، راہ بھی مشکل

سہل پسندی، پائے طلب کیا

نغمہ سرا کیا بادِ بہاری

گوشۂ زنداں نالہ بلب کیا

ساقئ دوراں، مردہ دلوں کو

نوُرِ سحر کیا، ظلمتِ شب کیا

چاند ستارے ہیں گردش میں

کس کو خبر ہے، ہو جائے کب کیا

حُسن سے عاری، کیف سے خالی

شعر ضیا ہو، داد طلب کیا

نئی دہلی — ۱۹۶۲

پھر مرے لب پہ تِرا نام آیا

پھر مِرا دردِ جگر کام آیا

ہائے وہ رند جو میخانے سے

تشنۂ بادۂ گلفام آیا

اُسے عقبیٰ سے ہے اُمیدِ سکوں

جسے دُنیا میں نہ آرام آیا

ترکِ سجدہ کا نتیجہ معلوم

میں تِرے در سے تو ناکام آیا

بات جب اُن کے تغافل کی چلی

دل کے افسانے کا انجام آیا

حُسن سے کون ملاتا آنکھیں

میرے سر عشق کا الزام آیا

اے ضیا بزمِ طرب میں کوئی

خوُگرِ حسرت و آلام آیا

تقدیر کو تُو تدبیر بنا، تدبیر سے تُو تقدیر بنا

تعبیر پہ رکھ خوابوں کی بنا، ہر خواب کو اک تعبیر بنا

بدنام محبّت ہوتی ہے، کیوں حُسن کو رُسوا کرتا ہے

یا حرفِ شکایات لب پہ نہ لا، یا آہ کو پُر تاشیر بنا

یہ باتیں تو ہیں فرشتوں کی، جائے نہ کوئی ان باتوں پر

وہ انساں، انساں کیا ہوگا جو انساں بے تقصیر بنا

گیت آزادی کے گاتا ہے، پرچم بن کر لہراتا ہے

وہ دل جسے زندانی سمجھے، وہ گیسو جو زنجیر بنا

صد چاک جگر ہوتا ہے تو ہو، ہنسنے سے گلوں کو مطلب ہے

رونے کا تو حاصل کچھ بھی نہیں، شبنم سے نہ تُو تقدیر بنا

یہ راز محبّت کا ہے ضیا، کھُلتے کھُلتے ہی کھُلتا ہے

وہ درد ہے خود اپنا درماں، رانجھا کے جو دل کا ہیر بنا

بمبئی – ۱۹۶۷

تیرے سودائی نے کیا زخمِ جگر دیکھ لیا

محورِ گردشِ خورشید و قمر دیکھ لیا

ختم ہوتے ہی شبِ غم ہوئی تُو بھی خاموش

ساتھ چلنا تِرا اے شمعِ سحر دیکھ لیا

جادۂ منزلِ مقصود کی سازش توبہ

پاؤں اُٹھا تھا کہ انجامِ سفر دیکھ لیا

تابِ دیدار کا اب دعویٰ کروں یا نہ کروں

تیرے جلووں نے مِرا حُسنِ نظر دیکھ لیا

دیکھتے دیکھتے کھُل جائے گی تقدیرِ جمال

اُس نے سوتے میں اگر جانبِ در دیکھ لیا

ہم نے آئینہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا خود کو

دیکھنے والوں نے دُنیا کو مگر دیکھ لیا

اے ضیا یوں بھی ہوا، ہم نے اُٹھا کر اخبار

اپنا افسانہ بہ عنوان دِگر دیکھ لیا

نئی دہلی – ۱۹۷۷

چارہ گر کیا مِرے زخموں کا مداوا ہوگا

درد اپنا جو نہ ہوگا تو پرایا ہوگا

آپ اور مجھ پہ ترس کھائیں، یہ کیا بات ہوئی

سچ کہا میں نے کوئی خواب ہی دیکھا ہوگا

پردہ اٹھا تو مِری تابِ تماشا بھی گئی

لب کشائی کا مجھے حوصلہ اب کیا ہوگا

لے کے آیا تھا تِری بزم میں دل کی سوغات

کیا خبر تھی کہ یہاں غم کا تماشا ہوگا

شب گزیدوں کو ڈراتی ہے یہ کہہ کر دُنیا

صبح ہوگی تو اُجالا ہی اُجالا ہوگا

حُسن بازار میں آ پہنچا ہے اب تو اے دل

کوئی پردہ نہ رہے گا یہی پردہ ہوگا

دل کی دھڑکن بھی سُنائی نہیں دیتی ہے ضیا

سبھی خاموش ہیں، یہ شہرِ صدا کیا ہوگا

نئی دہلی — ۱۹۷۸

چاہا جسے، اُسی نے نظر سے گرا دیا

دُنیا نے خوب میری وفا کا صلا دیا

ظلمت کی آندھیوں میں جلایا تھا جو چراغ

اے بادِ صبح، توُنے اُسے بھی بُجھا دیا

آ ہی گیا ہے بخت کی کوتاہیوں کا ذکر

اب کیا بتاؤں مجھ کو ستاروں نے کیا دیا

جانِ بہار ہے وہی غنچہ جو باغ میں

دو دِن کے واسطے ہی سہی، مُسکرا دیا

فرہاد اب کہاں ہے کہ پتھّر کو کاٹ کر

آئی جو موج، شیر کا دریا بہا دیا

غم ہائے روزگار کی تھی دھوپ کتنی تیز

سائے نے تیری یاد کا جب آسرا دیا

منزل سے کیوں عزیز نہ رکھوں اسے ضیا

دشوار رہگزر نے مجھے حوصلہ دیا

بمبئی — ۱۹٦٦

حسرتوں کو گلے لگاؤں کیا ؟

دل ہے رُوٹھا ہوا مناؤں کیا ؟

اپنے در کو نہ آزماؤں کیا ؟

تیرے در پر جبیں جھُکاؤں کیا ؟

پوُچھتا ہے بہار سے غنچہ

ایک دو پل کو مُسکراؤں کیا ؟

توُ سراپا غزل ہے جانِ غزل

تجھے اپنی غزل سُناؤں کیا ؟

آنکھ میں آنکھ ڈال کر جو توُ

زہر بھی دے تو پی نہ جاؤں کیا ؟

رہوں مدہوش عشق میں، تجھ کو

ہوش میں آؤں یا نہ آؤں کیا ؟

دل نے چاہا تو تھا ضیا لیکن

بارِ غم ہے گراں، اُٹھاؤں کیا ؟

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

خلوص و وفا کا صلا پائیے گا

ہجومِ تمنّا میں کھو جائیے گا

دیئے جائے گا غم کب تک زمانہ

کہاں تک زمانے کا غم کھائیے گا

جسے دیجئے گا سبق ڈُوبنے کا

اُسے قطرے قطرے کو ترسا یئے گا

اندھیروں سے دامن چھُڑایا ہے لیکن

اُجالوں سے بچ کر کہاں جا یئے گا

بڑھائے چلا جا رہا ہوں پتنگیں

نہ کب تک مِرے ہاتھ آپ آ یئے گا

اُدھر حور و کوشر، اِدھر جام و ساقی

کسے کھو یئے گا، کسے پا یئے گا

سحر نے ربابِ رگِ غنچہ چھیڑا

ضیا کی غزل اب کوئی گا یئے گا

نئی دہلی ــ ۱۹٦۹

خود شوق محبّت کو ہے شوریدہ سری کا

الزام مگر حُسن پہ ہے عشوہ گری کا

کیا سوچ کے دامن کو عنادل نے کیا چاک

پھُولوں میں تو دستور ہی تھا جامہ دری کا

دیکھا تجھے، غش کھاکے گِرا ہوش میں آیا

کیا ہوگا ثبوت اور مِری دیدہ وری کا

اے دل لبِ گویا سے تو ممکن ہی نہیں تھا

جو کام نگاہوں نے کِیا نامہ بری کا

یہ نشۂ عرفاں ہے، نہیں نشۂ بادہ

کچھ اور ہی عالم ہے مِری بیخبری کا

رکھتا ہوں نشیمن میں بھی آدابِ قفس یاد

شکوہ نہیں صیّاد سے بے بال پری کا

دہلیز پہ وہ چھوڑ گیا ہے کئی منظر

آیا تھا ضیا جھونکا نسیمِ سحری کا

خوگرِ درد کو آمادۂ فریاد کیا

تُونے کیا کارِ نمایاں ستم ایجاد کیا

غمِ جاناں کو دعا دیتا ہوں جس نے مجھ کو

شورش و کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

شیر کی نہر مِلی، حسرتِ شیریں نہ گئی

کوہ کاٹا بھی تو کیا تیشۂ فرہاد کیا ؟

بھُول جانا تھا ہمیں، بھُول گئے تم ہم کو

یاد کرنا تھا تمہیں، ہم نے تمہیں یاد کیا

گل کِھلا کر تو بہت خوش ہیں بہاریں لیکن

کسی اُجڑی ہوئی بستی کو بھی آباد کیا ؟

یہ وہی دھرتی ہے، کرتی ہے جو ہم کو برباد

یہ وہی دھرتی ہے، ہم نے جسے آباد کیا

میں اندھیروں میں بہر طور ضیا بن کے رہا

اپنے سائے کو نہ خود سے کبھی آزاد کیا

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

خوئے بلبل کو نغمہ جوُ دیکھا

گل کو محرومِ رنگ و بوُ دیکھا

ایک میرا ہی جام کیوں ہے تہی

بادہ بادہ، سبوُ سبوُ دیکھا

اپنے سجدوں کو، تیرے جلووں کو

در بدر دیکھا، کوُ بہ کوُ دیکھا

موڑ کر روشنی سے منہ اپنا

اپنے سائے کو رُوبرُو دیکھا

اِک خموشی کا پُر سکوں عالم

پسِ دیوارِ ہاؤ ہوُ دیکھا

یہ بھی تھا اپنی ہی نظر کا فریب

دوست کے بھیس میں عدوُ دیکھا

کہیں اپنا پتا ملا نہ ضیا

دیکھنے کو تو چار سوُ دیکھا

نئی دہلی — ۱۹۸۰

دل جل رہا تھا جیسے کسی قبر کا دیا

آندھی نے حادثات کی آ کر بُجھا دیا

زحمت نہ دی زباں کو مگر واہ رے جنوں

چُپ رہ کے میں نے حالِ دل اُن کو سُنا دیا

موجود اور بھی تھے تِری بزمِ ناز میں

لیکن مجھی کو تُونے غمِ بے دوا دیا

کیوں چھین لی نہ تابِ نظر بھی نگاہ سے

دل کو تو بے نیازِ تمنّا بنا دیا

دستک درِ حیات پہ دی کس نے صبحدم

تھا محوِ خوابِ ناز، مجھے کیوں جگا دیا

اس باغ میں تو پھُولنا پھلنا محال ہے

جس شاخ پہ پھل آیا اُسی کو جھُکا دیا

دستورِ زندگی ہے ازل سے یہی ضیا

مُرجھا گیا تو ٹہنی سے پتّہ گِرا دیا

نئی دہلی — ۱۹۷۳

دل میں جو نشتر تھا، وہ میں ہی تو تھا

اشک پلکوں پر تھا، وہ میں ہی تو تھا

لعل تھا، پتھّر تھا، وہ میں ہی تو تھا

رہگزر تھا، گھر تھا، وہ میں ہی تو تھا

رات کی آغوش میں مسلا ہوا

پُر شِکن بِستر تھا، وہ میں ہی تو تھا

کارزارِ زندگی، جس کے لئے

عرصۂ محشر تھا، وہ میں ہی تو تھا

کہتے ہیں، اک غم گزیدہ آدمی

درد کا خوگر تھا، وہ میں ہی تو تھا

خود کو خود میں کھو کر آخر پا لیا

جو مِرا دلبر تھا، وہ میں ہی تو تھا

اب مجھے کچھ بھی کہے دُنیا ضیا

رہزن و رہبر تھا ، وہ میں ہی تو تھا

نئی دہلی ـــ ۱۹۷۹

دھوپ کے پنجے سے مشکل ہے نکلنا اپنا

سایہ سایہ کیا کرتا ہے وہ پیچھا اپنا

پی نگاہوں سے کہ ہاتھوں سے نہیں کچھ معلوم

جہاں ساقی تھا، وہاں ہوش کسے تھا اپنا

جستجو اپنی ہی تھی روزِ ازل سے ہم کو

بستی بستی لئے پھرتا رہا سودا اپنا

بس گیا چُپکے سے آکر مِرے دل میں کل شب

وہ پرایا جسے ہر شخص نے سمجھا اپنا

پڑ گیا عکس کسی پیکرِ نادیدہ کا

آئینہ دیکھ کے حیراں ہے سراپا اپنا

فصلِ گل آئی تو گلشن میں بِکھر جائیں گے

ہمیں معلوم ہے انجام جو ہوگا اپنا

وہ قدامت ہو، ترقّی ہو کہ جدّت، کچھ ہو

لہجہ ہر شعرِ غزل میں ہے ضیا کا اپنا

نئی دہلی — ۱۹۸۰

رنگ ہستی میں بھرا میں نے مئے گلفام کا

کیوں نہ ہو چرچا دو عالم میں مِرے پیغام کا

کیا کرے ماتم کوئی مرگِ دلِ ناکام کا

زندگی تو اِک نتیجہ ہے خیالِ خام کا

جمگھٹا کالی گھٹاؤں کا فلک پر دیکھ کر

پھر گیا آنکھوں میں منظر میکدے کی شام کا

پردہ در پردہ تِرا جلوہ ہے، میں کب تک یونہی

جال پھیلائے ہوئے بیٹھا رہوں اوہام کا

دیکھنے کو مِل تو جاتی ہے تِری صُورت مگر

جو نہ پہچانے مجھے وہ آئینہ کس کام کا

کون کر سکتا تھا راون کے سوا سیتا ہرن

لے لیا بن باس، کتنا حوصلہ تھا رام کا

جس قدر عیش و طرب کا زندگی میں ہے ضیا

اُس سے کچھ بڑھ چڑھ کے حصّہ ہے غم و آلام کا

نئی دہلی — ۱۹۷۹

زمانے کے ستم کیا اور کرم کیا ؟

دلِ ناداں، یہ فکرِ بیش و کم کیا ؟

خم و پیچِ رہِ ہستی سلامت

کسی زلفِ سیہ کے پیچ و خم کیا ؟

شبِ غم کے اندھیرے حد سے گزرے

کوئی سورج نہ لےگا اب جنم کیا ؟

برس کر ہو گئیں رخصت گھٹائیں

نہیں اب غم تو پھر احساسِ غم کیا ؟

کیا مصلوب، سولی پر چڑھا یا

چلا تھا راہِ حق میں دو قدم کیا ؟

پلا دے ساقیا، چاہے جو مجھ کو

نہیں معلوم کیا وہسکی ہے رم کیا ؟

قدامت اور جدّت، شرف و مغرب

ضیا ہوں گے کبھی دو نوں بہم کیا ؟

نئی دہلی — ۱۹٦٤

زندگی کے لئے موت سے ڈر گیا

نامُراد آدمی جیتے جی مر گیا

اے غمِ دوش کیسے مناؤں اُسے

وہ زمانہ جو مجھ سے بگڑ کر گیا

ابر برسے گا کیا اُس دلِ مردہ پر

جو محبّت کے انجام سے ڈر گیا

تھی کرامت کسی کے درِ ناز کی

سرگراں بھی تو ہو کے سبک سر گیا

رات کی بات اُس کے سوا کچھ نہیں

ہوش آیا ہمیں، وہ فسوں گر گیا

راس ظلمت شبِ غم کی آئی اُسے

جس کے دل میں تِرا جلوہ گھر کر گیا

سر فرازی اُسی کو ملی اے ضیا

ہو کے جو سرنگوں اُن کے در پر گیا

مدراس ــ ۱۹۵۵

طور ٹھنڈا ہو گیا، کعبہ صنم خانہ ہوا

کون اپنا تھا، کسے سمجھیں کہ بیگانہ ہوا

ذرّے ذرّے میں تجلّی تھی کسی کی بے حجاب

جِتنا فرزانہ تھا کوئی، اُتنا دیوانہ ہوا

یہ تماشا رات میخانے میں دیکھا ساقیا

توبہ ٹوٹی تھی کہ ٹکڑے ٹکڑے پیمانہ ہوا

راکھ ہونے کا نہیں غم، سوچتا ہوں اب کہ کیوں

راستے میں برق کے میرا ہی کاشانہ ہوا

اک نیا چہرہ لگا رکھا ہے چہرے پر مگر

جانتا ہوں تجھ کو، تُو ہے میرا پہچانا ہوا

ہو نہ ہو کچھ ظلمتِ شب سے بھی نسبت تھی اِسے

صبح سے پہلے جو جل کر راکھ پروانہ ہوا

ڈھونڈ تے پھرتے ہیں خود کو جنگلوں، صحراؤں میں

اے ضیا اپنا بھی کس ظالم سے یارانہ ہوا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

غمِ زیست سے دل مِرا بُجھ گیا

جو تم اُٹھ گئے تو دیا بُجھ گیا

گھُس آئیں دبے پاؤں پھر ظلمتیں

جلاتے ہی گھر کا دیا بُجھ گیا

بڑا زور اندھی ہواؤں کا تھا

نگاہوں کا جلتا دیا بُجھ گیا

ہوئیں ختم ماچِس کی سب تیلیاں

جلے گا وہ کیا جو دیا بُجھ گیا

جلایا تھا دے کر جسے خونِ دل

چلیں آندھیاں، وہ دیا بُجھ گیا

سہاروں پہ جیتا ہے کب تک کوئی

ہوا تیل ختم اور دیا بُجھ گیا

قریبِ سحر ہی سہی اے ضیا

اندھیروں کو مژدہ دیا بُجھ گیا

نئی دہلی – ۱۹۸۰

کالے بازار کا اِک سگہ تھا کھوٹا کوّا

ہنس کی چال چلا کالا کلوُٹا کوّا

دو قدم آگے ہے شاہیں سے بھی مکّاری میں

دیکھنے میں ہے مگر چیل سے چھوٹا کوّا

ایک بھی بوُند ٹھہر پائی نہیں پانی کی

کچھ نہ پوچھو کہ ہے بے پیندے کا لوٹا کوّا

صبح دیکھا تو وہی کوّا تھا دُبلا پتلا

رات آیا تھا نظر خواب میں موٹا کوّا

کائیں کائیں سے تو پگھلی نہ کوئی بھی دیوار

چونچ میں اپنی لئے پھرتا ہے سوٹا کوّا

آج آیا نہیں مہمان تو کل آئے گا

اپنا جی کرتا ہے کس واسطے چھوٹا کوّا

اے ضیا رُستم و سُہراب بھی ڈر کر بھاگے

باندھ کر اُترا جو میداں میں لنگوٹا کوّا

نئی دہلی — ۱۹۷٤

کسی کو سود بغیرِ زیاں نہیں ملتا

جلے نہ برق اگر آشیاں نہیں ملتا

ہجومِ یاس، شبِ تیرہ، دردِ تنہائی

سکوں کُجا، مجھے دل کا نشاں نہیں ملتا

عمارتیں ہیں سر افراز، سر نگوں انساں

یہ وہ زمیں ہے جہاں آسماں نہیں ملتا

سمجھ سکے گی نہ دُنیا دلِ خراب کی بات

خموش ہوں کہ مِرا ہمزباں نہیں ملتا

فریب و مکر کی دُنیا میں حُسن و عشق کہاں

کوئی خلوص کا بندہ یہاں نہیں ملتا

تِرے جمال کا پرتو، مِرے خیال کا اوج

جگہ نہیں کوئی ایسی جہاں نہیں ملتا

ضیا یہ خانہ بدواشوں سی زندگی کب تک

کہاں چھُپاؤں سر اپنا مکاں نہیں ملتا

بمبئی ــ ١٩٦٦

کیف کی شمعیں جلیں، بیدار میخانہ ہوا

شام آئی، رُوح جھُومی، مست پیمانہ ہوا

بات آئی تھی زباں پر، لے اُڑی بادِ صبا

مشتہر سارے چمن میں دل کا افسانہ ہوا

آج بھی ہوتی ہے شب بھر شمع و پروانہ کی بحث

کس نے دیوانہ بنایا، کون دیوانہ ہوا

اِن اندھیروں سے نپٹنا، کون ایسے وقت میں

برق اُدھر چمکی، اِدھر خاشاک کاشانہ ہوا

اِک مقام ایسا بھی راہِ شوق میں آیا کہ دل

درد کا خوُگر بنا، درماں سے بیگانہ ہوا

کام سے ہے کام، کچھ مطلب نہیں انجام سے

رازِ ہستی جس نے یہ جانا وہ فرزانہ ہوا

جب اُترآئی ہماری دُشمنی پر بوُئے گل

اے ضیا اُس وقت اپنا دوست پیمانہ ہوا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

گرتا پڑتا ہی کسی دِن تو سنبھل جاؤں گا

چاند تاروں سے بہت دُور نکل جاؤں گا

مطمئن ہیں وہ مجھے دے کے اُمیدوں کے چراغ

طفلِ مکتب ہوں، کِھلونوں سے بہل جاؤں گا

میں اِک انساں ہوں کوئی موم کی گڑیا تو نہیں

کہ مجھے ڈھالو گے جن سانچوں میں ڈھل جاؤں گا

اس بھری بزم میں ہے کون جسے اپنا کہوں

مشتعل آگ میں تنہائی کی جل جاؤں گا

عقل کے نقشِ قدم پر تو چلا جاتا ہوں

دل مِرا چاہے گا جس وقت پِھسل جاؤں گا

کوئی دیوانہ کرے گا نہ اُدھر کا پھر رُخ

جب تِرے شہر کی گلیوں سے نکل جاؤں گا

محفلِ شوق میں آیا ہوں ضیا مُہر بلب

گنگناتا ہوا پُر سوز غزل جاؤں گا

گل بغیرِ رنگ و بوُ یوں جس طرح کانٹا رہا

رُوح رُخصت ہو گئی تو جسم میں پھر کیا رہا

منحصر تھا دل کی دھڑکن پر یہ ربطِ جسم و جاں

خون رگ رگ میں پیامِ زندگی دیتا رہا

اُس کے قدموں پر نہ کیوں منزل جبیں سائی کرے

رہنما جس قافلے کا تیرا نقشِ پا رہا

دوستوں کی بے وفائی کی شکایت کیا کروں

تھا مِری قسمت میں رونا، عمر بھر روتا رہا

آج تک مرہونِ منّت، اُن شہیدوں کا ہے خون

جن کو مقتل پر بھی دھوکا تیری محفل کا رہا

دیکھ کر بھی دیکھنے کی طرح کب دیکھا اُنھیں

سامنے آئے وہ لیکن درمیاں پردہ رہا

کس لئے مرگِ ضیا پر آہ و زاری شور و غل

کیا بُرا ہے مر گیا زندوں سے تو اچھّا رہا

مجھے کوئی ہُنر نہیں آتا

اور ہو تو نظر نہیں آتا

آمدِ صبح کا یقیں تو بجا

چین کیوں رات بھر نہیں آتا

یاد آتا ہے تُو مجھے بھی کیوں

میں تجھے یاد گر نہیں آتا

کیا بُرائی ہے اب زمانے میں

کوئی اچھّا نظر نہیں آتا

چاند خود چاندنی کے زینے سے

کیوں زمیں پر اُتر نہیں آتا

رگِ احساس میں سمایا ہے

آنکھ سے جو نظر نہیں آتا

گمرہی میں ہے ایک لطف ضیا

جاؤ میں راہ پر نہیں آتا

امرتسر ـــ ۱۹۳۳

مقام اے غمِ زیست پہچان اپنا

نہیں اب تو مرنا بھی آسان اپنا

یہ ساحل پسندی کی محرومیاں ہیں

نہ اپنا سفینہ، نہ طوفان اپنا

ستاروں پہ ڈالی ہیں کیا کیا کمندیں

مقدّر بدلتا ہے انسان اپنا

نہ ہو جائے دھڑکن کی رفتار مدّھم

نکل جائے دل سے نہ ارمان اپنا

جنہیں بات رکھنی بھی ہے بارِ خاطر

وہ کب یاد رکھتے ہیں پیمان اپنا

گزرنا ہے کانٹوں کے رستے سے جن کو

بچائیں وہ کب تک گریبان اپنا

ضیا جو اُفق سے نمُودار ہوگی

اُسی صبح پے لاؤ ایمان اپنا

دہلی ــ ۱۹٤۸

میرا دامن بھی بھگویا ہوتا

مجھ کو اشکوں میں ڈبویا ہوتا

کس طرح کوئی جگاتا اُس کو

کھُلی آنکھوں سے جو سویا ہوتا

ڈھونڈنے والے نے منزل کا نشاں

پا کے خود کو کبھی کھویا ہوتا

آبلہ پائی کی لذّت توبہ

کوئی کانٹا ہی چبھویا ہوتا

بدگمانی کی بھی حد ہوتی ہے

کاش کہ آئینہ گویا ہوتا

فصل کیوں کاٹتے زخموں کی اگر

بیج نفرت کا نہ بویا ہوتا

اے ضیا مشقِ سخن میں تُونے

قیمتی وقت نہ کھویا ہوتا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۷

میرا وجود ٹوُٹ کے سانچے میں ڈھل گیا

گرمی سے حادشات کی شیشہ پِگھل گیا

کانٹا کسی کے تلوے میں چُبھنے کی دیر تھی

شہتیر آنکھ کا نظر آیا، نکل گیا

وہ دھوپ کیا جو سائے میں دُبکی پڑی رہی

سُورج وہ کیا، جو آگ میں اپنی ہی جل گیا

آئی نہ ہاتھ گردشِ ایّام آج تک

انساں ہزار وقت کے سانچے میں ڈھل گیا

شامل تھا ترکِ مے میں بھی احساسِ تشنگی

بدلی کو دیکھتے ہی ارادہ بدل گیا

جنّت کا ہے خیال نہ دوزخ کی فکر ہے

جادو غمِ حیات کا کیا دل پہ چل گیا

منزل نے آپ بڑھ کے اُسی کے قدم لئے

جو راہِ پا شکن میں ضیا سر کے بل گیا

نئی دہلی – ۱۹۷۹

نالہ و فریاد سے ہوتا ہے کیا

آبرو اُمید کی کھوتا ہے کیا

سر پہ سُورج آگیا، آنکھیں تو کھول

اب بھی چادر تان کر سوتا ہے کیا

خون کا قطرہ بھی آنکھوں میں نہیں

دل میں تُخمِ آرزو بوتا ہے کیا

کشمکش میں زندگی و موت کی

آدمی پاتا ہے کیا، کھوتا ہے کیا

خونِ ناحق یوں کبھی دُھلتا نہیں

آنسوؤں سے آستیں دھوتا ہے کیا

بجلیاں جس پر بنا لیں آشیاں

وہ شجر بھی با شمر ہوتا ہے کیا

اے ضیا مدّت ہوئی دل مر چکا

اب دوا کر یا دعا، ہوتا ہے کیا

وہ وقت، جب یہ نظامِ کہن نہیں رہتا

قدم زمیں پہ، سروں پہ گگن نہیں رہتا

جہاں جہاں نہیں ہوتا تِرا کرم مجھ پر

وہاں وہاں میرا دیوانہ پن نہیں رہتا

جو میرا میں مجھے مل جائے تو کہوں اُس سے

بدن بھی دَھن ہے، ہمیشہ یہ دَھن نہیں رہتا

نہ چھیڑ بادِ بہاری، نہ اور مجھ کو ستا

کہ وہ نہ ہوں تو چمن بھی چمن نہیں رہتا

خوشی نشاط کی کیا ہے، الم کا غم کیوں ہے

بدلتے وقت کا یکساں چلن نہیں رہتا

نظر سے دیر و حرم کے جب اُٹھتے ہیں پردے

تو کوئی شیخ کوئی برہمن نہیں رہتا

غرض نہیں کہ وہ کھوٹا ہے یا کھرا ہے ضیا

کسی بھی سکّے کا پیہم چلن نہیں رہتا

ہمیں غم بھی دُنیا کا چھلتا رہے گا

نگاہوں کا جادُو بھی چلتا رہے گا

اُسے وقت کیا کھوئے گا جو ہمیشہ

مِلا کر قدم ساتھ چلتا رہے گا

زمانہ تو کروٹ بدلتا رہا ہے

زمانہ تو کروٹ بدلتا رہے گا

رہِ عشق میں ہر قدم پر ہے ٹھوکر

جو گِرتا رہے گا سنبھلتا رہے گا

دیے جاؤ اُس کو اُمیدیں، دِلاسے

کِھلونوں سے ہی دل بہلتا رہے گا

اِسی طرح چُھپتے رہیں گے ستارے

اِسی طرح سُورج نکلتا رہے گا

ضیا، دل مِرا طور سامانیوں میں

مچلتا رہا ہے، مچلتا رہے گا

نئی دہلی – ۱۹۷۷

ہوئے وہ دُشمنِ جور و جوا کیا

وفا سے اے دلِ ناداں، ملا کیا

تِری ویدہ خلافی کا گِلا کیا

کیا میں نے کوئی ویدہ وفا کیا ؟

خدا پر چھوڑ دوں کیا دل کی کشتی

اُٹھا دوں اعتبارِ ناخدا کیا

ہتھیلی کی لکیریں کہہ رہی ہیں

مِری تقدیر میں لکھا ہے کیا کیا

بہ عنوانِ دگر دُہرائے جاؤں

وہی قصّہ کلیم و طور کا کیا

یہ بستی ہے زبوں حالوں کی بستی

تلاشِ سایۂ بالِ ہُما کیا

غزل کہنا اِسے آیا نہ، خود کو

خدا جانے سمجھتا ہے ضیا کیا

بول کڑوا ہی بولئے صاحب

لبِ گفتار کھولئے صاحب

ڈال دی ہے جو بدگمانی نے

وہ گِرہ دل کی کھولئے صاحب

ہمہ تن گوش ہیں در و دیوار

ذرا آہستہ بولئے صاحب

یوں تو کوئی بڑا نہیں ہوتا

کیوں بڑا بول بولئے صاحب

پلٹ آئے ہیں، اجنبی تو نہیں

گھر کا دروازہ کھولئے صاحب

ہم پہ دھرتے ہیں تہمتِ اُلفت

اپنا دل تو ٹٹولئے صاحب

آج ہر سمت ہے ضیا ہی ضیا

اپنی آنکھیں تو کھولئے صاحب

نئی دہلی — ۱۹۸۰

ضربِ تیشہ لگا رہی ہے دھوپ

بوڑھی دیوار ڈھا رہی ہے دھوپ

آسماں سے اُتر کے دھرتی پر

سوئے فِتنے جگا رہی ہے دھوپ

گردِشِ خوں کو تیز تر کر کے

تپِشِ دل بڑھا رہی ہے دھوپ

شب گزیدوں کو کیا خبر اس کی

آ رہی ہے کہ جا رہی ہے دھوپ

کیوں نہیں پھُونک دیتی پاس آ کر

دوُر سے کیا جلا رہی ہے دھوپ

سائے سے بے نیاز و بے پروا

دشت میں گھر بنا رہی ہے دھوپ

سنئے، شاید ضیا کی تازہ غزل

زیرِ لب گنگنا رہی ہے دھوپ

نئی دہلی – ۱۹۷۳

چار سُو دوشِ ہوا پر اُڑتے میخانے بہت

لب سلامت چُوم لیں گے بڑھ کے پیمانے بہت

ہے یقیناً دل کی بربادی میں شامل غم کا ہاتھ

پھر بھی کیوں ہیں غم سے اُمیدیں خدا جانے بہت

کوئی ایسا بھی تو ہو، اپنا جسے ہم کہہ سکیں

لوگ مل جاتے ہیں یوں تو جانے پہچانے بہت

نوحہ خواں مرگِ محبّت پر ہے کیا مُرغِ اسیر

اشکِ خوں پلکوں پہ آئے دل کو سمجھانے بہت

ناقۂ لیلیٰ کا پایا قیس نے تنہا سُراغ

صحرا صحرا پھرتے تھے آوارہ دیوانے بہت

شور و شر کے دام میں آخر سمٹ کر رہ گئے

بستیوں سے بھاگتے تھے دُور ویرانے بہت

ایک پل سونے نہ پایا، اے ضیا روتا رہا

دل کو رکھا مضطرب شب بھر تمنّا نے بہت

نئی دہلی – ۱۹۷۷

ذِکرِ سم صلیب نہ دار و رسن کی بات

کرتے ہیں لوگ حرص و ہوس مکر و فن کی بات

اب اور کیا بہار گلستاں میں آئے گی

آئی زبانِ خار پہ گُلِ پیرہن کی بات

ہمدم نہیں، رفیق نہیں، آشنا نہیں

اب کیا کہوں کسی سے دلِ پُر محن کی بات

کچھ بات ہے کہ آئی ہوا کھُل گئے کِواڑ

اہلِ قفس بھی کرتے ہیں صحنِ چمن کی بات

لُٹتا ہے یا پہنچتا ہے منزل پہ کارواں

رہبر کی بات بنتی ہے یا راہ زن کی بات

اے شمع توُ پگھلتی ہے آتش بجاں ہوں میں

جو بات میرے من کی وہی تیرے من کی بات

کانٹوں کو نسبتیں تھیں خزاں سے مگر ضیا

رکھ لی بہار نے گُل و سر و سمن کی بات

ہے وہ اب شام کی صورت نہ سحر کی صورت

بدلی بدلی سی ہے خورشید و قمر کی صورت

پا شکن پیچ و خم، جادۂ ہستی ہیں تو کیا

نکل آتی ہے بہر گام سفر کی صورت

تُو پریشان ہے کیوں، بہرِ سکونِ خاطر

میں نے پیدا کوئی پہلو میں اگر کی صورت

اجنبیت کا یہ احساس، یہ تنہائی کا غم

کل جو تھی دشت کی ہے آج وہ گھر کی صورت

ننگے سُورج نے کیا دشت میں وہ رقصِ شرر

کھو گئی دھُوپ کے سائے میں شجر کی صورت

اب کہاں ڈھونڈ نے جاؤں کہ تِرا جلوۂ نَو

بس گیا ہے مِری آنکھوں میں نظر کی صورت

عشق میں کون کرے فکرِ کم و بیش ضیا

سُود کی شکل سے مِلتی ہے ضرر کی صورت

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

ہے آگ میں اپنی ہی جلتا سُورج

اک روز یہ ہو جائے گا ٹھنڈا سُورج

اُٹھا، تو مِٹا سلسلۂ ظلمت و نوُر

تھا روئے شبِ تار کا پردا سُورج

ذرّوں کی تب وتاب سے دھرتی چمکی

اندیشۂ انجام سے کانپا سُورج

کیوں حال نہ روشن ہو مِری دُنیا کا

ماضی ہے اگر چاند تو فردا سُورج

دیکھا نہ اسیروں نے کبھی کھول کے آنکھ

دیوار سے زنداں کی اُترتا سُورج

کمرے میں ابھی تک وہ اندھیرا ہے جو تھا

کیا صحن میں کرتا ہے اُجالا سُورج

پُوجے گئے بڑھتے ہوئے انوار ضیا

سجدوں سے نوازا گیا چڑھتا سورج

بمبئی — ۱۹٦۸

کلیم کو نہ ملا اذنِ دید طور کے بعد

وہ جلوہ ہو گیا غائب کہاں ظہور کے بعد

تجھے میں ساقیا قاتل کہوں تو کس منہ سے

دیا ہے زہر مگر بادۂ طہور کے بعد

میں نامہ بر سے نہ کرتا سوال پر یہ سوال

وہ اپنا نام بھی لکھ دیتے جو سطور کے بعد

یہی دورنگیِ دُنیا ہے محورِ ہستی

کہ شامِ تیرگی آتی ہے صبحِ نوُر کے بعد

ہر ایک ذرّۂ دشتِ جنوں تھا جام بدست

میں دل شناس ہوا عقل کے فتور کے بعد

دل و دماغ پہ طاری ہے طرفہ کیفیت

شعور اپنا کسے ہے تِرے شعور کے بعد

چلے ہو مانگنے جنّت تو اے ضیا، پہلے

یہ سوچ لو کہ وہاں کیا ملے گا حوُر کے بعد

نئی دہلی — ۱۹۸۰

اک ایسا بھی آتا ہے وقت آدمی پر

بگڑتا ہے اپنے ہی جذبِ دلی پر

فلک رو رہا ہے زمیں ہنس رہی ہے

تِری دُشمنی پر، مِری دوستی پر

کبھی زندگی آدمی پہ تھی قرباں

نثار آج ہے آدمی زندگی پر

تعجّب ہے بجلی گری تو چمن میں

مِرے آشیاں کو بچا کر کلی پر

یقیں آئے کیا تجھ پہ بندوں کو اب تو

صحیفہ نہیں ہوتا نازل کسی پر

وہ پردہ اُلٹ کر شبستاں میں آئے

گماں روشنی کا ہوا تیرگی پر

ضیا کی غزل بھی وہ سُن لیں جنہیں ہے

بڑا ناز اپنی نئی شاعری پر

کیلئے گھر کو پھونک کر منتر

دُور کرتا ہے بد نظر منتر

تجربہ کر کے دیکھ لوں میں بھی

رکھتا ہے کچھ نہ کچھ اشر منتر

آتے ہیں وہ نہ صبح ہوتی ہے

پڑھتا رہتا ہوں رات بھر منتر

پتھروں کے دِلوں میں ہلچل ہے

آگیا کیا زبان پر منتر

آسماں کا طلسم ٹوُٹے گا

یونہی پڑھتے رہے اگر منتر

کر ہی دے کامیاب منزلِ شوق

ایک دِن ہم کو، کیا خبر منتر

بال و پر جن کے کٹ چُکے ہیں ضیا

اُن کو دیتا ہے بال و پر منتر

مدراس – ۱۹۸۰

لہر سی دل میں اُٹھی موجۂ طوفاں ہو کر

رگِ جاں ڈُوب گئی سازِ غزلخواں ہو کر

روز و شب کچھ بھی دھڑکنے کے سِوا کام نہیں

یہ صِلا خوب ملا دل کو نمایاں ہو کر

دل شکستہ ہوں، کہیں ٹوُٹ نہ جائے، ڈر ہے

یہ مِرا عہدِ وفا بھی تِرا پیماں ہو کر

کر چُکا ترکِ تعلق مگر اب بھی اکثر

ذہن میں یاد اُبھرتی ہے غزلخواں ہو کر

اجنبی اپنے وطن میں کوئی دُشمن بھی نہ ہو

آئینہ دیکھ رہا ہے مجھے حیراں ہو کر

جام ٹوُٹے ہوئے اُترا ہوا چہرہ مے کا

شامِ غم آئی ہے کیا صبحِ درخشاں ہو کر

اے ضیا بحرِمحبّت کا کنارا معلوم

دل میں آیا غمِ انساں غمِ جاناں ہو کر

بمبئی ۔ ۱۹٦۲

مستی شراب کی ہے شرابِ کہن سے دوُر

میں اپنے ہی وطن میں ہوں اپنے وطن سے دوُر

وہ خانما خراب ہوُں جاتا ہوُں جب اُدھر

بھاگے ہے دشت بھی مِرے دیوانہ پن سے دوُر

کھا کر ترس سمیٹ لیا میں نے ہی اُسے

بکھری پڑی تھی روُح حصارِ بدن سے دوُر

آوارگی درست مگر واہ رے جنوں

پھینکا ہے لا کے مجھ کو کہاں انجمن سے دوُر

یہ سوچ کے ہوں گوشۂ زنداں میں مطمئین

کیا کام رنگ و نکہتِ گُل کا چمن سے دوُر

دانشورانِ عصر نے جدّت کے نام پر

رکھی اساسِ قصرِ سخن شہرِ فن سے دوُر

منزل کا آج بھی ہے ضیا مطمحِ نظر

وہ جادہ آشنا جو نہیں راہزن سے دوُر

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

اک نظر دیکھ نہ لیتے وہ اگر دل کی طرف

ہاتھ کون اپنے بڑھاتا مہِ کامل کی طرف

مجلسِ زیست میں روز افزوں ہے دل کی دھڑکن

کون دے کان یہاں شورِ سلاسل کی طرف

بھیک انصاف کی پاؤں بھی تو کس کے در سے

ساری دُنیا ہے سف آرا مِرے قاتل کی طرف

موجِ طوفاں کوئی ایسی بھی تو اُٹھتی یا رب !

موڑ دیتی رُخِ کشتی کو جو ساحل کی طرف

یہ وہ آئینہ ہے ٹوُٹا تو بکھر جائے گا

پھینکئے سنگِ ملامت نہ مِرے دل کی طرف

اُف وہ پروانے جو شعلوں سے گلے مل نہ سکے

دیکھتے رہ گئے شمعِ سرِ محفل کی طرف

اے ضیا ! قافلۂ اشک رواں تھا جب تک

اُنگلیاں لوگ اُٹھاتے ہی رہے دل کی طرف

نئی دہلی – ۱۹۸۰

اوجِ پستی ہے محبّت کا اشر ہونے تک

ہوش رہتا ہے کسے اپنی خبر ہونے تک

جانے پھر دل میں ہو کب جذبۂ وحشت بیدار

کیوں نہ سر پھوڑ لیں دیوار کے در ہونے تک

آنکھ کھُلتے ہی کھُلا رازِ وجودِ گِل و آب

جلوے در پردہ تھے توفیقِ نظر ہونے تک

خاک اُڑتی ہے کہ دریائے وفا خشک ہوا

آنکھ روتی ہے لہو دل کا ضرر ہونے تک

کوئی وحشی تِرے کوچے میں در آیا ہے مگر

چاہیے وقت کسی سنگ کے سر ہونے تک

خاکِ پروانہ پہ تھی رات کی دزدانہ نظر

شمع جلتی رہی تخلیقِ سحر ہونے تک

کس قدر حشر بپا ہوں گے ضیا دُنیا میں

موم، فریاد سے پتھّر کا جِگر ہونے تک

احمدآباد ــ ۱۹٦۷

آس جینے کی زندگی کی اُمنگ

اب کرے کون فکرِ نام و ننگ

مرگِ بلبل کی دی خبر کس نے

اُڑ گیا اَدھ کِھلی کلی کا رنگ

پستیٔ فطرتِ بشر، توبہ

صلح جوئی بھی بر بنائے جنگ

پھر درِ دل پہ سر بہ سجدہ ہوں

عقل کی اُلجھنوں سے آکر تنگ

ہآئے کب باغ میں بہار آئی

سر میں سودا ہے اب نہ دل میں اُمنگ

عزمِ پرواز پر بُریدہ ہے

وسعتِ کائنات ہے دلتنگ

ہو گیا دل کے آر پار ضیا

تھا کسی خود نگر نظر کا خدنگ

باد و ابر و بہار و نکہت و رنگ

کون کہتا ہے کائنات ہے تنگ

ڈھیل دیتا ہوں چھوڑ تا ہوں ڈور

چونچ سُورج کی لے اُڑی ہے پتنگ

کائنات اور اِس قدر محدود

آدمی اور اِس قدر دل تنگ

باغ بھی ریگ زار ہے کوئی

عندلیبیں خموش گل بے رنگ

کس دو راہے پہ یاس نے گھیرا

گھر سے نکلا تھا دل میں لے کے اُمنگ

دار پر امن کو چڑھاتے ہیں

کھیل بچّوں کا ہے بڑوں کی جنگ

اے ضیا پارسائی کیا جانے

کس کو کہتے ہیں فکرِ نام و ننگ

نئی دہلی — ۱۹۷۰

تن بدن میں لگی ہے آگ ہی آگ

میں نہ کہتا تھا روشنی سے بھاگ

شورشوں میں سکوں کے خواب نہ دیکھ

آ گیا سر پہ سوُرج اب تو جاگ

اب خیال اُن کا دل میں آتا ہے

جیسے پھونکارتا ہوا کوئی ناگ

الاماں سرد مہریِ دُنیا

مطربہ چھیڑ کوئی دیپک راگ

رات کی گود ہو گئی سُونی

جنگلوں میں لگائی کس نے آگ

کارگاہِ حیات کے دو رُخ

عقل کا شعبہ اور دل کا وبھاگ

لی ضیا درد نے پھر انگڑائی

ہوئے بیدار دل کے سوئے بھاگ

آنکھیں آنکھیں، چنچل چنچل

روشن روشن جھیلوں میں کنول

کیا رُوپ ہیں حُسن و جوانی کے

شوخی چنچلتا اور چھل بل

وہ رند نہیں وہ جام نہیں

دُنیا بدلی تُو بھی تو بدل

خوابوں میں کسی کی یادوں کے

میں نے بھی بنائے تاج محل

یہ انگ ہیں چڑھتی جوانی کے

ننّھے ننّھے کومل کومل

وہ حُسن کو کہتے ہیں اچھّا

دیتا ہوں محبّت پر میں بل

کرتی ہے اشاروں میں باتیں

کہتے ہیں ضیا ہم جس کو غزل

دُنیا ہے اک جنگل

جنگل میں ہے منگل

دل کی سجدہ گاہیں

صحرا، وادی، جنگل

دو بے چین دلوں کا

پیار انوکھا دنگل

جس کے سر میں سودا

اُس کے پاوں میں سنگل

انسانوں کی قسمت

سورج، چاند اور منگل

اچھے فلم کی پہچان

گانا ناچ اور دنگل

دل میں ضیا اُگ آئے

پھر یادوں کے جنگل

بمبئی – ۱۹٦۸

جلووں سے معمُور ہیں ہم

پردوں میں مستوُر ہیں ہم

ذوقِ عمل پر شرمندہ

سعیِ نا مشکوُر ہیں ہم

کالے سوُرج سے کہہ دو

شمعِ شبِ دیجوُر ہیں ہم

کچھ مرنے کا خوف اور کچھ

جینے پر مجبوُر ہیں ہم

اٹھ کر رشکِ قوسِ قزح

گِر کر چکناچوُر ہیں ہم

ہم سے اُتنے پاس ہو تم

تم سے جتنے دوُر ہیں ہم

بزم میں نظاروں کی ضیا

ناظر اور منظوُر ہیں ہم

نئی دہلی – ۱۹۷۹

شغلِ سبُو و جام کئے جا رہے ہیں ہم

کیا کیا نہ اپنے دل پہ ستم ڈھا رہے ہیں ہم

خود کو کریں تلاش کہاں بزمِ شوق میں

کھوئے ہوئے ہیں یوں کہ اُنھیں پا رہے ہیں ہم

رہبر کی کچھ خبر ہے نہ منزل کا کچھ پتہ

تو بھی رہِ وفا میں بڑھے جا رہے ہیں ہم

کب تک یہ بے حِسی کا بھرم مُسکرا بھی دو

اے زندگی، فریب تِرے کھا رہے ہیں ہم

اپنا وجود اس کے سوا اور کچھ نہیں

تم دیکھ لو اگر تو نظر آ رہے ہیں ہم

انکار جس کی خارا شگافی سے کفرِ غم

اشکوں میں ڈُوب کر وہ غزل گا رہے ہیں ہم

زخموں کی شکل میں ہی سہی کچھ تو اے ضیا

اُس بے وفا سے دادِ وفا پا رہے ہیں ہم

نئی دہلی — ۱۹۷۳

آریوں، کولوں اور بھیلوں میں

آدمی بٹ گیا قبیلوں میں

چھوڑتا جا رہا ہے وقت کھنڈر

کوئی بستی نہیں ہے میلوں میں

شورشِ کاینات روز افزوں

زندگی زندگی کے حیلوں میں

یوں خیالوں میں جلوہ گر ہے کوئی

عکسِ مہتاب جیسے جھیلوں میں

ریگزاروں میں عشق آوارہ

حُسن پابند ہے فصیلوں میں

گھر میں ہے جمگھٹا بلاؤں کا

کچھ اثر ہی نہیں ہے کیلوں میں

ظلم سہتا ہوں کچھ نہیں کہتا

میں بھی ہُوں اے ضیا ہٹیلوں میں

نئی دہلی ــ ۱۹٦۵

بے نیازِ ہوش دُنیا سے ہوں بیگانہ کہاں

مجھ کو ساقی نے دیا ہے بھر کے پیمانہ کہاں

بند بابِ میکدہ ہے، وا درِ کعبہ نہیں

چھوڑ کر کوچہ تِرا پھر جائے دیوانہ کہاں

دل لگی کی بات ہے کچھ اور، ورنہ شامِ غم

شمع کے جلنے سے جل جاتا ہے پروانہ کہاں

پائے ایماں لڑ کھڑائے، دولتِ دیں لُٹ گئی

آ گیا یہ جادۂ کعبہ میں خمخانہ کہاں

چاکِ دامن میں مِرے جھانکو، نہ پوچھو مجھ سے تم

قیس ایسا ہے کوئی دُنیا میں دیوانہ کہاں

جن پہ بُنیادِ غزل رکھی تھی اہلِ ذوق نے

اب وہ آئینہ کہاں ، وہ گیسو و شانہ کہاں

اے ضیا مقطع پہ آ پہنچی غزل لیکن ہنوز

اُن سے کہہ پایا ہوں اپنے دل کا افسانہ کہاں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

جاتی ہے آسماں سے بھی آگے نظر کہاں

اُن کی خبر مِلی تو پھر اپنی خبر کہاں

سیلابِ گریہ، رقصِ شرر، نالۂ سکوُت

ہوتی ہے اِس طرح شبِ غم مختصر کہاں

یہ پردہ دارِ حُسن، وہ غمّاز رازِ عشق

آنچل تِرا کہاں، مِرا دامانِ تر کہاں

طاری دل و دماغ پہ ہے بے خودیِ شوق

رندوں کو فکرِ گردشِ شمس و قمر کہاں

سجدہ طلب ہے اب بھی تِرا سنگِ در، مگر

تھا جس کو شوقِ سجدہ وہ شوریدہ سر کہاں

گلہائے نو شگفتہ کی نکہت لئے ہوئے

زنداں میں آ گئی ہے نسیمِ سحر کہاں

اب یہ نہ پوچھ میرا دلِ ناتواں ضیا

زخموں میں ڈھُونڈتا ہے دوا کا اثر کہاں

بمبئی — ۱۹٦٦

جسمِ کون و مکاں ہے تیرا بدن

پیکرِ دو جہاں ہے تیرا بدن

مُڑتی، لہراتی، گاتی، بل کھاتی

موجِ آبِ رواں ہے تیرا بدن

لوچ، نرمی، سرُور، جاں بخشی

نغمگی کا سماں ہے تیرا بدن

دل میں خوشبو کہاں سے آتی ہے

آنکھ سے جب نہاں ہے تیرا بدن

اِک مُجّسِم غزل کہوں تجھ کو

شاعری کی زباں ہے تیرا بدن

چھوتے ہی اُنگلیاں جُھلس جائیں

کوئی برقِ تپاں ہے تیرا بدن

اس غزل پر ضیا کا یہ دعویٰ

میرا حُسن بیاں ہے تیرا بدن

احمدآباد ــ ١٩٦٦

حالِ دل کہنے میں تو عار نہیں

جانتا ہوں کہ تجھ کو پیار نہیں

دے کے دل ہُوں اُمیدوارِ نظر

نقد سودا ہے یہ اُدھار نہیں

رُوٹھی بیٹھی ہے موت بھی مجھ سے

زندگی بھی تو سازگار نہیں

یہ پلٹ کر کبھی نہیں آتا

وقت کا کوئی اعتبار نہیں

تُو زمیں پر مِری اُتر بھی آ

آسماں سے مجھے پُکار نہیں

زندگی سے نہیں ہے پیار جسے

زندگی کو بھی اُس سے پیار نہیں

کوئی اس دَورِ کجکلا ہی میں

اے ضیا تجھ سا وضعدار نہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

حُسن کی فتنہ سازیاں نہ گئیں

عشق کی غم نوازیاں نہ گئیں

لاکھ روکا، جتن کئے لیکن

درد کی سر فرازیاں نہ گئیں

آدمی مطمئین ہوا نہ کبھی

دل کی شکوہ طرازیاں نہ گئیں

نہ ہوئی درد میں کمی نہ ہوئی

نہ گئیں چارہ سازیاں نہ گئیں

ہم ہوئے منحرف مگر آقا

تیری بندہ نوازیاں نہ گئیں

نہ ہوئی ختم زندگی جب تک

موت کی حیلہ سازیاں نہ گئیں

آشیاں اُجڑا، مُرغِ بسمل کی

اے ضیا نغمہ سازیاں نہ گئیں

لاہور ــ ۱۹۳۳

خرد کا مداوا کیا چاہتا ہُوں

درِ دل پہ سجدہ کیا چاہتا ہُوں

بصد نا مُرادی بصد تشنہ کامی

میں ترکِ تمنّا کیا چاہتا ہُوں

گھر اپنا جلا کر جہاں تک ہے ظلمت

وہاں تک اُجالا کیا چاہتا ہُوں

خجل ہے وفا گریہ سامانیوں سے

محبّت کو رُسوا کیا چاہتا ہُوں

جسے ظلمتِ دوش کہتی ہے دُنیا

اُسے صبحِ فردا کیا چاہتا ہُوں

اندھیرے سے ہوتا ہے جو نُور پیدا

اُسی کا تماشا کیا چاہتا ہُوں

ضیا اپنے اشعار سے زندگی میں

نیا حُسن پیدا کیا چاہتا ہُوں

بمبئی — ۱۹٦٦

دیتا ہے جلوہ آنکھ کو دعوت ہی اب کہاں

آتی ہے لب پہ دل کی حکایت ہی اب کہاں

یہ غلغلہ، یہ شور، یہ ہنگامہ، شامِ غم

ہے انتظارِ صبحِ قیامت ہی اب کہاں

کانٹے وہی ہیں پھول وہی بلبلیں وہی

لیکن عجوبہ کاریِ وحشت ہی اب کہاں

کیا آنکھ کھولیئے یہاں پہچانئے کسے

آئینہ خانے میں کوئی صُورت ہی اب کہاں

اس کاروبارِ زیست کی مصرُوفیت نہ پوُچھ

انسان کو ہے مرنے کی فُرصت ہی اب کہاں

دل کے نہاں کدے میں کوئی جلوہ بار ہے

پردے کی رہ گئی ہے ضرُورت ہی اب کہاں

کہنے کو تو غزل ہے مگر اِس میں اے ضیا

شوخی ہی اب کہاں ہے شرارت ہی اب کہاں

نئی دہلی — ۱۹۸۰

دیا ہو تُونے سہارا کبھی ہوا بھی نہیں

تُو اپنی آنکھ سے لیکن مجھے گِرا بھی نہیں

یہ دو دھڑکتے ہوئے دل ملیں تو کیسے ملیں

جو فیصلہ ہے مِرا تیرا فیصلہ بھی نہیں

عجیب بات ہے جن سے ملا ہے درد مجھے

اُنہیں کے پاس مِرے درد کی دوا بھی نہیں

بیانِ حُسن میں کھُلتی نہیں زبانِ غزل

مقابل آج تِرے رُخ کے آئینہ بھی نہیں

مِرے سفینہ کو آتا ہے ڈوُب جانا بھی

اُمیدِ ساحلِ مقصود اگر ذرا بھی نہیں

تمہارے شہر میں آکر ہوا مجھے معلوم

میں اجنبی ہوں کوئی میرا آشنا بھی نہیں

میں سانس لوں تو ضیا کیا دیارِ اُلفت میں

گھُٹی گھُٹی سی فضا ہے کھُلی ہوا بھی نہیں

نئی دہلی – ۱۹۷۳

رسمِ اُلفت نبھائے جاتے ہیں

بھُول کر یاد آئے جاتے ہیں

شاخِ گل ہے نہ آشیاں کا پتہ

بجلیاں کیا گِرائے جاتے ہیں

اے خوشا آمدِ نویدِ سحر

شب کے پُر ہول سائے جاتے ہیں

وہ تِری بزمِ ناز تھی ورنہ

ہم کہیں بِن بُلائے جاتے ہیں

خواب کیا دیکھ آئے دیوانے

تاج محلوں کو ڈھائے جاتے ہیں

دل جلوں سے کوئی تو یہ پوُچھے

کس لئے دل جلائے جاتے ہیں

ہم ضیا اِس زمینِ سادہ میں

شعرِ رنگیں اُگائے جاتے ہیں

نئی دہلی ـــ ۱۹۸۰

روشن اشکوں سے چراغِ شبِ غم کرتے ہیں

غمِ ہستی میں کہاں فکرِ عدم کرتے ہیں

بھاگ کر دوُر کہاں جائےگی اب منزلِ شوق

کام رہبر کا مِرے نقشِ قدم کرتے ہیں

سُرخرُو ہوتے ہیں عشقِ چمنستاں میں وہی

خونِ دل سے جو رقم قصّۂ غم کرتے ہیں

بارور ہونے سے پہلے یہ ہوا کے جھونکے

ٹوُٹ جاتی ہے جو ٹہنی اُسے خم کرتے ہیں

حق تو یہ ہے کہ ہمیں بندگیِ حق ہے عزیز

شوق سے اپنا سرِ شوق قلم کرتے ہیں

یہ سمجھ کر ہی تو لب بستہ ہیں شہرِ دل میں

بیش کرتے ہیں ستم لطف تو کم کرتے ہیں

ایسے فرزانوں کو کہتے ہیں ضیا دیوانے

آگ پانی کو جو خوابوں میں بہم کرتے ہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

سُنا بھی تُونے نہیں میں نے کچھ کہا بھی نہیں

خموش ہوں کہ شکایت کا حوصلہ بھی نہیں

یہ انتہائے جنوں یہ کمالِ حُسن و جمال

ابھی تو عہدِ محبّت کی اِبتدا بھی نہیں

بڑے مزے میں ہیں کنجِ قفس میں اہلِ چمن

کہ آشیاں بھی نہیں خوف برق کا بھی نہیں

کلی کا اُترا ہوا چہرہ کس نے دیکھا ہے

صبا کے ہاتھ میں سورج کا آئینہ بھی نہیں

جُھلستی دھُوپ میں جلتے ہیں کس طرح پیاسے

کنویں میں رہتا ہے جو اُس کو یہ پتا بھی نہیں

نہ جانے کس لئے پھر جاگنے سے ڈرتا ہُوں

مجھے خبر ہے کہ عالم یہ خواب کا بھی نہیں

نہ جلوۂ گل و لالہ نہ رقصِ نکہت و رنگ

غزل سرا چمنِ شعر میں ضیا بھی نہیں

صحرا کی تپتی دھُوپ سے اُمید کیا کریں

سایہ مِلے شجر کا تو پتّے ہوا کریں

سوُلی پہ چڑھ کے جن کو مِلیں سر فرازیاں

وہ بے گماں نمازِ محبّت ادا کریں

مایوس کیوں ہیں چارہ گرانِ غمِ حیات

حاصل ہوا دوا سے نہ کچھ تو دعا کریں

یہ وقت ہے کہ کنجِ قفس کے سکوت کو

شور آشنائے حلقۂ زنجیرِ پا کریں

جلووں کی بھیک مانگ کے اوسان کھو چُکا

اب دعوتِ نگاہ بغیر التجا کریں

جنّت سے تو نکالے گئے ہیں بفیضِ دل

تم بھی ہمیں نظر سے گِرا دو تو کیا کریں

خوئے نیاز اپنی نہ چھوڑیں گے اے ضیا

ہم سے وہ بے نیاز اگر ہیں ہوا کریں

نئی دہلی – ۱۹۷۷

کراں سے بے کراں تک آ گئے ہیں

مکاں سے لامکاں تک آ گئے ہیں

نگاہِ حُسن بیں سے جو چلے تھے

نگاہِ نکتہ داں تک آ گئے ہیں

چلے تھے ہم کہاں سے کون جانے

خبر کس کو کہاں تک آ گئے ہیں

ترِی مست انکھڑیوں کی آرزو میں

شرابِ ارغواں تک آ گئے ہیں

نجوم و ماہ بن کر کیوں نہ چمکیں

جو ذرّے آسماں تک آ گئے ہیں

وہی طوفاں جو تھے منجھدھار کا حق

لبِ جوئے رواں تک آ گئے ہیں

درِ زنداں ضیا اب کھول بھی دو

گل اُڑکے آشیاں تک آ گئے ہیں

نئی دہلی – ۱۹۷۹

کشمکش میں ہستی کی کب سے مبتلا ہُوں میں

دل کی آرزوؤں کا خون کر رہا ہُوں میں

غم نے اس قدر میرے دل پہ پالیا قابُو

اپنی ہر تمنّا کو ترک کر چُکا ہُوں میں

ڈُوبنا ہی جب ٹھہرا کیا خدا کو دوُں تکلیف

اپنے دل کی کشتی کا خود ہی نہ خدا ہُوں میں

حُسن میری نظروں میں ایک فریبِ رنگیں ہے

فطرتِ محبّت سے خُوب آشنا ہُوں میں

دیکھنا ہے توُ مجھ کو تا بہ کے نہیں مِلتا

اپنے آپ کو کھو کر تجھ کو ڈھوُنڈتا ہُوں میں

میرے چارہ سازوں سے کاش کوئی یہ کہہ دے

آپ زخم ہوں اپنا آپ ہی دوا ہُوں میں

کام کیا ضیا مجھ کو فکرِ بزمِ امکاں سے

سرحدِ تمنّا سے آگے بڑھ گیا ہُوں میں

کہیں یہ درد ہی اے دل تِری دوا تو نہیں

مِری وفا کا تقاضہ کوئی جفا تو نہیں

پیوں گا اور پیوں گا ڈروں تو کس سے ڈروں

یہ میکدہ ہے کوئی خانۂ خدا تو نہیں

نمک چھڑکتے ہیں کیوں لوگ میرے زخموں پر

یہی علاج مِرے دل کے درد کا تو نہیں

جفا سے تجھ کو لگاؤ وفا کا پاس مجھے

جو مُدّعا ہے تِرا میرا مُدّعا تو نہیں

کسی پہ چشمِ عنایت کسی پہ مشقِ ستم

بجا ہے تم جو کہو ورنہ یہ بجا تو نہیں

یہ کشمکش یہ تلاطم یہ دشمنی یہ فساد

حیات کہتا ہوں جس کو وہی قضا تو نہیں

ضیا اِک آگ سی دل میں سُلگتی رہتی ہے

یہ ابتدا ہے محبّت کی انتہا تو نہیں

دلّی ــ ١٩٦٦

گو دُور سہی اُن سے منسُوب کنارے ہیں

ملّاحوں نے جو بیڑے طوفاں میں اُتارے ہیں

ناصح تِری باتوں پر کر لیں تو یقیں لیکن

ہمدرد بھی ہے کوئی ؟ ہم درد کے مارے ہیں

اے مطربۂ ہستی اس بربطِ شادی میں

کچھ گیت ہیں ایسے بھی اب تک جو کنوارے ہیں

کچھ بھی تو نہیں میرا، دوں بھی تو اُسے کیا دوں

دُنیا نے مِرے آگے کیوں ہاتھ پسارے ہیں

زخموں پہ چھڑکتے ہی رہتے ہیں نمک پیہم

اے دوست کچھ ایسے بھی غمخوار ہمارے ہیں

کیا نام ہمیں دے کر اب یاد کرے دُنیا

بازی میں محبّت کی جیتے ہیں نہ ہارے ہیں

کرتے ہیں ضیا دل کو جو مائلِ مے نوشی

وہ کالی گھٹاؤں کے پُر نُور اِشارے ہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

لالہ و گل پہ اب نکھار کہاں ؟

شوخیِ ابرِ نو بہار کہاں ؟

زندگی ہے یہی تو جیتے جی

کشمکش سے رہِ فرار کہاں ؟

ہیں دلوں میں کدوُرتیں ورنہ

آئینہ خانوں میں غُبار کہاں ؟

شعلۂ طور جلوہ فرما ہو

فرصتِ دید بار بار کہاں ؟

بند ہونٹوں سے خُشک آنکھوں سے

دل کا غم ہوگا آشکار کہاں ؟

شک نہ ہونے کا ہے ابھی مجھ کو

میرے ہونے کا اعتبار کہاں ؟

دامنِ ضبط چھوڑ کر جائیں

اے ضیا ہم وفا شعار کہاں ؟

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

مجھے وہ سمجھتے ہیں جو میں نہیں

نہ سمجھیں اگر کچھ بھی تو میں نہیں

قفس میں نہیں گو قفس ہی میں ہُوں

ہوں صحنِ گلستاں میں گو میں نہیں

نشاں میرا پاؤ گے کیا راہ میں

سنبھل کر نہ تم جو چلو میں نہیں

تعاقب سرابوں کا کرتا رہا

مجھے غور سے دیکھ لو میں نہیں

وہ جو جُھک گیا وقت کے سامنے

خدارا مجھے بخش دو میں نہیں

دو گانے کا یہ آخری سین ہے

مِرے ساتھ مِل کر کہو میں نہیں

پتا کیا مِرا چاند دے گا تمہیں

ضیا تو ہوں مانگے کی ضو میں نہیں

نئی دہلی — ۱۹۸۰

میری نگاہ بھی مجھے پہچانتی نہیں

حالانکہ تیرے شہر میں میں اجنبی نہیں

رنجُور دھُوپ سے ہوں نہ میں چاندنی سے خوش

دائم جہاں میں دھُوپ نہیں چاندنی نہیں

شادابیِ چمن کی نشانی یہی تو ہے

وہ شاخِ خشک جو کبھی ہوتی حری نہیں

دھرتی ہِلے ہوائیں چلیں بِجلیاں گِریں

اِک شاخ ہے درخت کو جو چھوڑتی نہیں

کِھڑکی سے جھانک کر ذرا باہر تو دیکھ لوں

کیا وقت کا بھروسہ ابھی ہے ابھی نہیں

دُنیا سے اب نِبھے گی کہاں تک نہ پوُچھئے

میں ڈھُونڈتا ہوں وہ تو مجھے ڈھُونڈتی نہیں

اُن سے اُمیدِ دادِ غزل کس لئے ضیا

یہ شاعری ہے آج کی نا شعری نہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

نشانِ منزلِ مقصود اور کیا دیکھیں

جبیں جُھکائیں جہاں اُنکا نقشِ پا دیکھیں

نہ ذوق و شوق سکندر نہ موجِ آبِ حیات

جنابِ خضر بھی اب اپنا راستا دیکھیں

حرم سے دیر سے مایوس ہونے والوں کو

ہے ازنِ عام اِدھر آئیں میکدا دیکھیں

نہ پُوچھیں یاد میں کاٹی ہے کس طرح شبِ غم

کتاب کھول کے اشکوں کا ماجرا دیکھیں

ہوا نہ جانے اسے کب کہاں اُڑا لے جائے

کدھر سے آئی ہے گاتی ہوئی گھٹا دیکھیں

گلوں کی پتّیاں جھڑ کر بنی ہیں فرشِ نظر

کہاں تک اب تجھے اے موجۂ صبا دیکھیں

نظر بھی اُن کی ہے بنائی بھی اُنہیں کی ضیا

بتوں کی شکل میں جو صورتِ خدا دیکھیں

نئی دہلی — ۱۹۸۰

نہ ساقی ہے نہ مینا ہے نہ بادہ ہے نہ پیالے ہیں

تو پھر اے زندگی ہم اہلِ غم کس کے حوالے ہیں

اُٹھاتا ہے اُٹھا دے شوق سے یہ سوچ لے لیکن

ہم ایسے اور کتنے تیری محفل میں جیالے ہیں

تِری دُنیا مِری دُنیا ہے لیکن واہ ری قسمت

تِری دُنیا میں نغمے ہیں مِری دُنیا میں نالے ہیں

اندھیرے ہی اندھیرے ہیں مِری خلوت کے گوشے ہیں

تِرے جلووں کی محفل میں اُجالے ہی اُجالے ہیں

ٹِھٹھک جاتے ہیں چلتے چلتے ہم ہر موڑ پر ورنہ

یہ رستے تو وہی ہیں جو ہمارے دیکھے بھالے ہیں

شکایت کیا گلہ کیا شکوہ کیا اہلِ محبّت نے

یہ نخلِ آرزو تو خونِ دل دے کر ہی پالے ہیں

نہیں معلوم شِو کب آکے اُن کا زہر پی لے جائے

ضیا ہم نے جو اپنی آستیں میں سانپ پالے ہیں

نئی دہلی — ۱۹۷۷

ہاتھ آئے تو ہواؤں میں اُڑائیں دامن

تار تار ایسا کہ کِیا اُن کو دکھائیں دامن

ہم نے چاہا تھا کہ لب رکھ کے لبِ ساغر پر

غم و اندوہِ زمانہ سے چُھڑائیں دامن

ہوشمندانہ کریں رقصِ بہار اہلِ چمن

چھیڑیں پھوُلوں کو تو کانٹوں سے بچائیں دامن

توڑ سکتے نہیں زنجیر تو اہلِ زنداں

سرخ اشکوں ہی سے گلرنگ بنائیں دامن

ہوس و حرص کے جنگل میں یہ کیسی ہے کشش

کھینچتی رہتی ہیں ہر وقت ہوائیں دامن

برقِ سوزاں کو انہیں شاخوں سے نسبت کیوں ہو

اپنی ہی آگ میں جو اپنا جلائیں دامن

اے ضیا چُھٹ نہ سکے گی کبھی بیرنگیِ دل

کہکشاں سے بھی اگر چھین کے لائیں دامن

ہے کوئی آزاد کاٹے پاوں کی زنجیر کون

ہیں سبھی گھائل نکالے دل سے نوکِ تیر کون

اِک نہ اِک دِن تجھ سے کہنا ہی پڑے گا حالِ دل

چارہ گر تیرے سِوا ہے اے بُتِ بے پیر کون

آ بلہ پائی کو روتا ہے مگر اے دل بتا

گر نہ ہوتا خار ہوتا اُس کا دامن گیر کون

دھُوپ جس کو چاندنی ہو زہر ہو آبِ حیات

تیرے دیوانوں میں ہے وہ صاحبِ تقدیر کون

کارواں بھی میں ہی میرِ کارواں بھی میں ہی تھا

فائزِ منزل ہوا میرے سِوا رہگیر کون

یہ زمانہ امن کا ہے جنگجوئی کو سلام

ہو مقابل شاخِ گُل کے ہوتی ہے شمشیر کون

بے نیاز انجام سے ہو کر کرے کب تک ضیا

کارزارِ زندگی میں سعیِ بے تدبیر کون

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

یاد آئے نہ کہیں آج کا دِن

خوں رلائے نہ کہیں آج کا دِن

ہنستا آیا ہے خدا خیر کرے

روتا جائے نہ کہیں آج کا دِن

کل کے خوابوں کی حسیں جھیلوں میں

ڈوُب جائے نہ کہیں آج کا دِن

کل پہ زندہ ہوُں مگر ڈرتا ہوں

ظلم ڈھائے نہ کہیں آج کا دِن

دل کے ویرانے میں کھوئی ہوئی یاد

ڈھُونڈ لائے نہ کہیں آج کا دِن

بزمِ ماضی میں بہ ایں حُسن و جمال

بار پائے نہ کہیں آج کا دِن

رات سہمی ہوئی بیٹھی ہے ضیا

گنگنائے نہ کہیں آج کا دِن

بمبئی ــ ۱۹۷۷

یوں تو ہیں مجھ میں کئی ہُنر عیب کم نہیں

وہ وقت کیا کہ شام و سحر جب بہم نہیں

دستک یہ کون دیتا ہے در کھولوں کس طرح

عالم یہ نزع کا ہے مِرے دم میں دم نہیں

جس دل میں تیری یاد ہے تیرا خیال ہے

اُس کو خوشی خوشی کی نہیں غم کا غم نہیں

کر دیں جلا کے راکھ اُسے اب تو بجلیاں

کیا کام آشیاں کا جو گلشن میں ہم نہیں

لکھ لکھ کے کاٹ دیتا ہُوں سر لفظ لفظ کا

شمشیر میرے ہاتھ میں ہے یہ قلم نہیں

تیرا یقیں تو وہم سے آگے نہ بڑھ سکا

میرا گمان عینِ یقیں ہے بھرم نہیں

کیا سوچتا ہے اُٹھ کے اُٹھا پی بھی جا ضیا

امرت بھرا ہے تیرے پیالے میں سم نہیں

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

ابر پارہ ہُوں سرِ عرش اُچھالو مجھ کو

میں سمندر تو نہیں ہُوں کہ کھنگالو مجھ کو

شمعیں داغوں کی جلا رکھی ہیں میں نے دل میں

شام کا وقت ہے کیوں صبح پہ ٹالو مجھ کو

جاگتے رہتے ہیں جو سوئی ہوئی آنکھوں میں

گمُ اُنہیں خوابوں میں پاؤ گے خیالو مجھ کو

کونپلیں پھُوٹیں ہنسے پھُول مہک پھیل گئی

سالِ نو آیا نئے سانچوں میں ڈھالو مجھ کو

انتظار آج بھی ہے چشمِ شریّا کو مِرا

میں ہوں اک گیند خلاؤں میں اُچھالو مجھ کو

عالمِ ہوش میں ہر گام پہ ہے لغزشِ نو

اب کوئی جام پلا کر ہی سنبھالو مجھ کو

ہُوں ضیا بزمِ سخن میں نہ پھر آؤنگا نظر

دیکھ لو غور سے اب دیکھنے والو مجھ کو

نئی دہلی — ۱۹۸۰

بہار آئی چمن میں تم بھی مثلِ گل ہنسو یارو

سُنو کچھ بلبلوں کی اور کچھ اپنی کہو یارو

کہیں یوں بھی کٹی ہیں ہجر کی گھڑیاں زمانے کی

کہا تھا تم سے کِسنے رات بھر تارے گِنو یارو

سمٹ آئیں گے اِک مرکز پہ خورشید و مہ و انجم

محبّت کا وہ جذبہ دل میں پیدا تو کرو یارو

خطا میرے سِوا اس میں کسی کی ہو نہیں سکتی

سمجھ کر بھی نہ سمجھو تم جو میری بات کو یارو

سفر میں بیٹھ جانا تھک کے توہینِ مسافت ہے

نہ آئے پاؤں میں لغزش چلو تو یوں چلو یارو

زمانے کی ہوائیں پھر زمانے کی ہوائیں ہیں

زمانے کی ہواؤں میں نہ تم اتنا اُڑو یارو

ضیا کا قول رکھنا یاد رہ کر سر بلندوں میں

جنہیں آتا ہے جُھکنا اُن کے آگے ہی جُھکو یارو

نئی دہلی ۱۹۸۰

دل کے ہر گوشے میں ہر سُو

پھیلی ہے یادوں کی خوشبُو

عشق کی رُسوائی کا باعش

ٹھنڈی آہیں جلتے آنسُو

آموں کے اک پیڑ پہ بیٹھی

کوئل کرتی کوُ کوُ کوُ کوُ

گردشِ مہر و ماہ نہ بدلی

کیا بدلے گی میری بھی خُو

آؤ مِل کر ختم ہی کردیں

روز کی یہ سب میں میں تُو تُو

گردشِ روز و شب کا حاصل

صبحِ جبیں اور شامِ گیسُو

کون ضیا سے ملنے جائے

کم آمیزی ہے اُس کی خُو

بمبئی – ۱۹٦۸

دوزخ میں ڈال دوں نہیں ممکن بہشت کو

دیتا ہے کون خوب پہ ترجیح زشت کو

دوزخ کی آگ بڑھتی ہی آتی ہے دمبدم

رکھ دو اُٹھا کے طاق میں کوئی بہشت کو

سر بچ گیا ہے سایۂ دیوارِ دوست میں

الزام دے رہا ہوں میں کیا سنگ و خشت کو

طوفانِ برق و باد اُٹھے آئے زلزلے

بدلا نہ پھر بھی وقت نے اپنی سرشت کو

مستی میں عشق و حُسن کی ڈُوبا ہوا ہے دل

میزانِ عقل تولا کرے خوب و زشت کو

جب تک نہ مُسکراہٹیں برسیں گھٹاؤں سے

دیتا رہوں گا خونِ جگر غم کی کشت کو

ہے اپنے دست و پا پہ بھروسہ ہمیں ضیا

پیشِ نگاہ کون رکھے سرنوشت کو

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

وا مِرا دیدۂ بینا ہے تو

میں نے دُنیا تجھے دیکھا ہے تو

اِک نئی کا ہکشاں کا منظر

میں نے پلکوں پہ سجایا ہے تو

آئینہ دیکھ کے معلوم ہوا

کوئی دیوانہ بھی مجھ سا ہے تو

پا بجولاں رہے قطرہ قطرہ

لمحے لمحے کا تقاضا ہے تو

کئی صدیوں سے جُڑا ہوں اب تک

میرا میں ٹوُٹ کے بِکھرا ہے تو

عکس ہی عکس ہے لیکن ہر عکس

آئینہ خانے میں تنہا ہے تو

اے ضیا توُ بھی کسی کا ہو جا

کوئی دُنیا میں کسی کا ہے تو

نئی دہلی — ۱۹۷۹

یہ بزمِ مے ہے یہاں بے خودی کی بات کرو

بنامِ لغزشِ پا گمرہی کی بات کرو

جلاؤ شمع تگ و دو مِٹاؤ ظلمتِ شب

اجل کا نام نہ لو زندگی کی بات کرو

اُداس اُداس زمیں ہے دُھواں دُھواں ہے فلک

کہا تھا کس نے مِری بے کسی کی بات کرو

پرائے آگ میں جلنا بھی کوئی جلنا ہے

لگی ہے آگ جو دل میں اُسی کی بات کرو

بہار آ تو گئی ہے خزاں بدوش سہی

بہا چُکے بہت آنسو ہنسی کی بات کرو

سحر کے چہرے پہ ڈالو نہ پردہ ظلمت کا

ہے کیا ضرور کہ تم رات ہی کی بات کرو

جو کم نظر ہے دکھائے چراغ سُورج کو

ضیا کے سامنے کیوں تیرگی کی بات کرو

نئی دہلی ــ ۱۹٦۸

چلی وہ نسیمِ سحر مُسکرا دو

ستاروں کے بُجھتے دئیوں کو بُجھا دو

نہ ہم آسرا دیں نہ تم آسرا دو

کہاں تلخیاں غم کی جائیں بتا دو

دھُواں بھی نہ خاکسترِ دل سے اُٹھے

فُغاں کی صدا قہقہوں میں دبا دو

متھا تو ہے مجھ کو سمندر سمجھ کر

کوئی زہر بھی آنسوؤں میں ملا دو

کسی روز منزل مجھے پا ہی لے گی

جو چلتے رہے تم مِرے ساتھ جا دو

لگانی تو مشکل نہیں بات جب سے

کہ تم میرے دل کی لگی کو بُجھا دو

نبرد آزما ہے اندھیروں سے دُنیا

ضیا کی غزل ہی کوئی اب سُنا دو

بمبئی ــ ۱۹٦٦

بھیجا پیام موسمِ گُل نے صبا کے ہاتھ

میں نے بھی دل کو سونپ دیا مدّعا کے ہاتھ

اُس بات کو نہ کوئی بھی سمجھے خدا کرے

آنکھوں سے کہہ گئے جو وہ میرا دبا کے ہاتھ

مُرجھا کے پھُول شاخوں سے ٹوُٹے بِکھر گئے

جب توُ وداع مجھ سے ہوا تھا ملا کے ہاتھ

کچھ تو کمی خلوص و وفا میں ہے ورنہ کیوں

پچھتا رہے ہیں اُن کی طرف ہم بڑھا کے ہاتھ

بجلی چمک کے کالی گھٹاؤں میں کھو گئی

انگڑائی لینی چاہی تھی اُس نے اُٹھا کے ہاتھ

بے تیغ و موت مارے گئے کچھ نہ پوچھیئے

دل دے کے ہم تو ایک بُتِ بے وفا کے ہاتھ

آخر تجھے سزائے گنہ مِل گئی ضیا

کہتے نہ تھے کہ ہوتے ہیں لمبے خدا کے ہاتھ

نئی دہلی — ۱۹۸۰

دُکھ درد سہہ

چُپ پھر بھی رہ

ساحل سے ڈر

موجوں میں بہہ

سُن لیں جسے

وہ بات کہہ

اُلفت نِبھا

ہر ظلم سہہ

میری بھی سُن

اپنی بھی کہہ

سب چور ہیں

ہُشیار رہ

اب اے ضیا

کچھ بھی نہ کہہ

بمبئی ــ ١٩٦٨

ڈھُونڈے نہ مِرا دل کسی غمخوار کا سایہ

مل جائے اگر آپ کی دیوار کا سایہ

اس اندھے کونیں سے تو نکل کر کوئی دیکھے

آتا ہے نظر دھُوپ میں اشجار کا سایہ

زرخیز ہے مٹی اُسی شاداب زمیں کی

جس پر ہے کسی ابرِ گہر بار کا سایہ

آتا ہوں میں کر دو شبِ تیرہ کو خبردار

سینے میں چُھپائے ہوئے انوار کا سایہ

لوُٹا نہ مزہ حُسنِ نظر کا کبھی اُس نے

اُترا نہ کبھی نرگسِ بیمار کا سایہ

ڈرتا ہوں کہ سُن کر مِرے اشعارِ دل افگار

پڑ جائے نہ اُس پر غم و افکار کا سایہ

جینا بھی ہے مشکل کہ ضیا رہتا ہے سر پر

ہر لحظہ لٹکتی ہوئی تلوار کا سایہ

نئی دہلی — ۱۹۸۰

آندھی خزاں کی باغ میں جب تک چلی نہ تھی

مُرجھا کے شاخ سے کوئی پتّی گِری نہ تھی

چلتی رہیں ہزاروں حوادش کی آندھیاں

جلتی رہی وہ شمع جو اب تک بُجھی نہ تھی

وہ آ گئے تو رات گئی صبح ہو گئی

قسمت مِری بگڑ کے کبھی یوں بنی نہ تھی

اِک تُو کہ جس نے پاسِ وفا کی نہ دی تھی داد

اِک میں کہ جس نے ظلم کی فریاد کی نہ تھی

صد حیف دوستوں نے بھی سمجھا مجھے غلط

تھی دوستی کسی سے مِری دشمنی نہ تھی

کیا آئینہ دکھاتا میں اسرارِ زیست کو

تھی آگہی کہ مجھ کو کوئی آگہی نہ تھی

جو رات بے مُحابا مِرے لب پہ آ گئی

میں نے ضیا وہ بات کسی سے کہی نہ تھی

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

اب اپنے آپ سے بھی محبّت نہیں رہی

مرنا پڑا کہ جینے کی صورت نہیں رہی

احسانِ چارہ گر نہ اُٹھاؤں تو کیا کروں

دستِ دعا اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی

پائے بتاں پہ رکھ کے جبیں دل کو ہے گلہ

غم ہائے روزگار سے فرصت نہیں رہی

حق بات کہہ کے دار کا حق دار بن گیا

اب جُھوٹ کے نگر میں صداقت نہیں رہی

اُس بلبلِ اسیر پے خندہ ہائے گل

پرواز کی بھی جس کو اجازت نہیں رہی

خم ہے سرِ نیاز درِ ناز پر ہنوز

گو شہرِ دل میں شورشِ وحشت نہیں رہی

اس بھیڑ میں کسی کی بھی مجھ پر اب اے ضیا

کیا قہر ہے کہ چشمِ عنایت نہیں رہی

نئی دہلی – ۱۹۷۳

اب نہ وہ رُت ہے نہ وہ جامہ دری ہے کہ جو تھی

کیا ستم ہے کہ وہی بخیہ گری ہے کہ جو تھی

ہوئی مدّت کہ بیابانوں میں تھا جشنِ جنوں

آج بھی دعوتِ شوریدہ سری ہے کہ جو تھی

گل یگانے ہیں تو کانٹے بھی نہیں بیگانے

مگر انساں کی وہی کج نظری ہے کہ جو تھی

خُوں چُکاں دیدۂ دیدار طلب ہے کہ جو تھا

گلفشاں آج بھی بادِ سحری ہے کہ جو تھی

نہ ہوا اب بھی غلط غم تو کسے دیں الزام

رسمِ مے خانہ وہی بیخبری ہے کہ جو تھی

حضرتِ شیخ سے اب کون کرے مُفت کی بحث

سببِ تشنہ لبی کم نظری ہے کہ جو تھی

اے ضیا موت کی زردی تو مسلّم ہے مگر

زندگی آج بھی اِک سبز پری ہے کہ جو تھی

نئی دہلی- ۱۹۶۶

بادِ بہار اب نہ مجھے چھیڑ مان بھی

دل دے کے اُن کو پڑ گئی مُشکل میں جان بھی

جلوے ہزاروں دستکیں دیتے ہیں در بدر

اس شہرِ دل میں ہے کوئی خالی مکان بھی ؟

وہ آدمی نہیں ہے جو ڈر جائے موت سے

خنجر بڑھا ہے جُھوم کے اب سینہ تان بھی

دیکھے وہی جو رکھتا ہو آنکھوں میں تابِ دید

جلوہ تِرا وِشال بھی ہے اور مہان بھی

آب و ہوا پہ دسترسِ عزم و حوصلہ

دھرتی بھی اپنے قبضے میں ہے آسمان بھی

مندر میں آ کے اُترا ہے مسجد کا کارواں

پہلو بہ پہلو بیٹھے ہے لالہ بھی خان بھی

سیتا کے دل کا حال کہوں تجھ سے کیا ضیا

ہے رام کی کمان بھی راون کا بان بھی

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

پرچھائیں عیب کی تو ہنر پر پڑی نہ تھی

جب تک نہ داد تھی کوئی بیداد بھی نہ تھی

حرفِ غلط کی طرح مِٹی لوحِ باغ سے

کاٹی گئی وہ شاخِ شجر جو ہری نہ تھی

پھرتا رہا میں شہر کی گلیوں میں رات بھر

تختی کسی بھی در پہ مِرے نام کی نہ تھی

میں کیوں بِکھر کے ہو گیا شایانِ کائنات

آواز مجھ کو میری انا نے تو دی نہ تھی

چُھوتے ہی جانے دوڑ گئی کیوں رگوں میں آگ

وہ ایک شاخِ گل تھی کوئی پھُلجھڑی نہ تھی

جلتے اگر نہ پاؤں تو کیا ہوتے سرخرو

پھیلی ہوئی تھی دھوپ وہاں چاندنی نہ تھی

کیا خاک قدر وقت کی ہوتی مجھے ضیا

باندھی ہوئی کلائی پہ میں نے گھڑی نہ تھی

نئی دہلی — ۱۹٦۹

دلِ پُر خوں کی وفا یاد آئی

آہ کی تھی کہ دعا یاد آئی

کس نے چِھڑکا مِرے زخموں پہ نمک

درد اُٹھتے ہی دوا یاد آئی

غم کا عرفان ہوا پھر دل کو

پھر مئے ہوشرُبا یاد آئی

توبہ کرتا تھا گناہوں سے مگر

بے گناہی کی سزا یاد آئی

حُسن کو دیکھ کے مصرُوفِ خرام

موجۂ بادِ صبا یاد آئی

اُن کی آمد سے ہوا تھا مسرُور

اُن کے جاتے ہی قضا یاد آئی

موت کے بعد ضیا اُن کو مِری

یاد آئی بھی تو کیا یاد آئی

بمبئی — ۱۹٦۹

دل کی دھڑکن کو مِلی درد کی سوغار نئی

کِھنچ گئی ذہن میں تصویرِ خیالات نئی

پھر شبِ وعدہ کے قدموں کی صدا آتی ہے

دل میں پیدا ہوئی پھر شورشِ جذبات نئی

آج ہی پُرسِش احوال کو وہ آئے ہیں

آج ہی کہنے کو کوئی بھی نہیں بات نئی

میکدہ چھوڑ کے مسجد میں چلا آیا ہوں

شاید آ جائے نظر صوُرتِ حالات نئی

روز آئنے میں آتا ہے نظر چہرۂ نَو

روز کر لیتا ہوں میں خود سے ملاقات نئی

زندگی کرنے کی یہ بھی تو ہے اِک رسمِ قدیم

دل پہ لگتی ہی رہے ضربتِ صدمات نئی

اے ضیا ترکِ روایت تو ہے جدّت لیکن

کشتِ جدّت میں اُگ آتی ہیں روایات نئی

نئی دہلی — ۱۹۷۸

رات کہتی تھی دل سے آنسو پی

یونہی اُمید میں سحر کی جی

جگمگائے چراغ ذرّوں کے

پڑ گئیں ماند شمعیں تاروں کی

گلِ نرگس ہے محوِ آئینہ

واہ رے عالمِ دروں بینی

وہ تو میں ہی تھا بارہا جس نے

زندہ رہنے کو خودکشی کر لی

کسے احساس تھا اسیری کا

بند کھڑکی اگر نہیں کھُلتی

جل بُجھا جو پتنگا اُس کی خبر

آگ کی طرح شہر میں پھیلی

شعر کہتے رہو ضیا صاحب

خدمتِ اردو اور کیا ہوگی

بمبئی – ۱۹٦۷

شوخ و گستاخ اس قدر مکھّی

اُڑ کے آ بیٹھی گال پر مکھّی

ہائے اُن کی یہ شانِ استغنا

بیٹھنے دیں نہ ناک پر مکھّی

چارہ گر سے گلہ نہیں لیکن

کس نے نِگلی ہے دیکھ کر مکھّی

موسمِ بر شگال ہی میں کیوں

بھنبھناتی ہے بیشتر مکھّی

دیکھتی رہ گئی لبِ شیریں

اُڑتی پھرتی تھی در بدر مکھّی

گھر ہے حلوائی کی دُکاں تو نہیں

جانے کیوں آ گئی اِدھر مکھّی

کون تقلید اے ضیا کرتا

مارتا کون مکھّی پر مکھّی

نئی دہلی – ۱۹۷٤

صبح ہوئی یا شام ہُوئی

پامالِ انجام ہُوئی

عقبیٰ کی کیا فکر کروں

دُنیا میرے نام ہُوئی

ایک اُمیدِ ہوش جو تھی

وہ بھی نذرِ جام ہُوئی

پھنس نہ سکی نکہت ہی تو تھی

گل کی رگ رگ دام ہُوئی

تھا ساقی کا خاص کرم

دعوتِ مستی عام ہُوئی

چلتے چلتے رستے میں

بیٹھ گئے تو شام ہُوئی

میری سعیِ حال ضیا

فردا کا پیغام ہُوئی

نی دہلی ـ ١٩٦٥

عشق کی خُو وفا نِبھانے کی

حُسن کو ضِد ہے آزمانے کی

ابتدا ہی نہ ہو دلِ ناداں

انتہا درد کے فسانے کی

کھو رہا ہوں کہ اِس طرح بھی کبھی

نکل آتی ہے راہ پانے کی

سمٹ آئی ہے تیری آنکھوں میں

ساری مستی شراب خانے کی

سرد سرد آہ گرم گرم آنسو

یہ سزا غم سے دل لگانے کی

آئینہ مانگتا ہوں کس منہ سے

کوئی صورت بھی ہو دکھانے کی

اے ضیا کیوں قفس نہ جل جاتا

آگ تھی میرے آشیانے کی

نئی دہلی — ۱۹۷۷

کب سے آس لگائے بیٹھا دیکھ رہا ہوں راہ کسی کی

شب جتنی گھٹتی ہے اُتنی ہی بڑھتی ہے چاہ کسی کی

چھُوٹ گئیں بیمار کی نبضیں بند ہوئی دل کی دھڑکن

ہائے کس دشمن نے اُڑادی آمد کی افواہ کسی کی

کیوں چُپ ہُوں اُس بُت سے کہوں کیا ناداں ہے کب سمجھے گا

لوہا بھی پگھلا دیتی ہے دل سے نکلی آہ کسی کی

دیکھا تو ہر خاک کا ذرّہ اِک سُورج بن کر روشن تھا

پگلا دل کہتا تھا مجھ سے کا ہکشاں ہے راہ کسی کی

وقت کا رستہ تکنے والے تکتے ہی رہ جاتے ہیں

میت ہوئی ہے اور نہ ہوگی گردشِ مہر و ماہ کسی کی

صبح کی منزل تک آتے آتے ہمّت بھی چُھوٹ گئی

جیسے میری رات کٹی ہے یوں نہ کٹے اللہ کسی کی

دیکھو ضیا صاحب کل کوئی اُٹھ کے گیا تھا لیکن آج

یوں لگتا ہے جیسے عمریں بیتیں تکتے راہ کسی کی

بمبئی — ۱۹٦۷

گلشن کی فضا مہکی جنّت کی ہوا آئی

نغموں کی ہوئی بارش پھر کالی گھٹا آئی

پیغامِ سحر لے کر شب خانۂ دوراں میں

ہر ذرّے کو چمکاتی پھر بادِ صبا آئی

پھر شاخ پہ انگڑائی لی سوسن و لالہ نے

پھر دستِ طلب اُٹھا پھر لب پہ دعا آئی

پھر پائے خرد لرزا پھر شوقِ جنوں بہکا

پھر سینے میں دل دھڑکا پھر غم کی دوا آئی

پھر جلوت و خلوت میں پھیلی مِری پرچھائیں

گردوں سے پلٹ کر پھر میری ہی صدا آئی

پھر میں ہی سزاوارِ رعنائیِ گل ٹھہرا

کام آئی تو گلشن میں میری ہی خطا آئی

اے طبعِ ضیا تو بھی اس موسم رنگیں میں

دیکھوں تو کہاں آئی پھر میں نے سُنا آئی

نئی دہلی – ۱۹۷٤

گل کِھلے کھول بھی دو اب درِ زنداں کوئی

دل میں رہ جائے مِرے دل کا نہ ارماں کوئی

یاد کی داد کہ رکھ دیتا ہے لا کر شبِ غم

خلوتِ دل میں مِری شمعِ فروزاں کوئی

در بدر سجدے کئے جاتا ہوں شاید کر دے

جادۂ منزلِ مقصود نمایاں کوئی

شمع کا کام ہے جلنے سے اُسے کیا معلوم

اس بھری بزم میں ہے خود سے گریزاں کوئی

توڑ دے جو سرِ منزل کا طلسمِ پندار

نظر آتا ہی نہیں تا حدِ امکاں کوئی

چُھپتے سُورج سے یہ بڑھتے ہوئے سائوں کی چھیڑ

شام سے رہتا ہے نالاں و پریشاں کوئی

اے ضیا اہلِ نظر کو ہیں برابر دونوں

گلِ خنداں ہو کہ ہو خارِ مغیلاں کوئی

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

لائی ہوا پیامِ سحر رات ہو چُکی

جس بات کی تھی فکر وہی بات ہو چُکی

پھرتے ہیں اپنے ساتھ وہ سایہ مِرا لئے

اب اُن سے رہ گزر میں ملاقات ہو چُکی

اب تجزیہ کریں بھی تو کیا اس سے فایدہ

چلنے نہ پائے چال مگر مات ہو چُکی

جو جانتے ہیں وہ بھی تو پہچانتے نہیں

کس درجہ مسخ صورتِ حالات ہو چُکی

ذرّوں کے لب پہ اب بھی ہے احساسِ تشنگی

ہالانکہ ریگزار میں برسات ہو چُکی

دن ہو کہ رات دل کو دھڑکنے سے کام ہے

دُنیا میں اس طرح بسراوقات ہو چُکی

اُس کی نظر نہ مجھ پہ پڑے جب تک اے ضیا

تکمیلِ شوقِ طوفِ خرابات ہو چکی

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

وسعت میں وہ خلاؤں کی آخر بِکھر گئی

جو بات احتیاط کی حد سے گزر گئی

تھا ناز اپنے دیدۂ بینا پہ کس قدر

اُٹھی ہی تھی نقاب کہ تابِ نظر گئی

پایا نہ دیر میں نہ حرم میں کہیں سُراغ

اپنی تلاش لے کے مجھے در بدر گئی

جب تک تھا بے شعور نہ تھی عیب پر نظر

آیا شعور عزّتِ اہلِ ہُنر گئی

منزل اگر ملے تو کروں اُس سے یہ سوال

کیوں میں اُدھر گیا نہ جِدھر رہگزر گئی

احساس تشنگی کا کناروں کو کیا ہوا

برسات میں چڑھی تھی جو ندّی اُتر گئی

مجبورِ زندگی نہ ہو مجھ سا بھی اے ضیا

کیا جانے آتے آتے کہاں موت مر گئی

نئی دہلی – ۱۹۷۸

اپنے در سے نہ بھیک جو پائے

وہ گدا مانگنے کہاں جائے

پی گیا زہر جان کر امریت

جس کے شانوں پہ سانپ لہرائے

اس طرف دشت اُس طرف جنگل

دھُوپ ہی دھُوپ سائے ہی سائے

دے رہا ہوں لہو کہ کھیت مِرا

اپنی شادابیوں پہ مُسکائے

اجنبیت نے رکھ لیا پردہ

دل میں آنکھوں سے وہ اُتر آئے

میں نے بادل سے پھُول مانگے تھے

مجھ پہ آندھی نے سنگ برسائے

اے ضیا روشنی کا پروانہ

تیرگی کا جواز کیا پائے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

اک بات پتے کی یہ مجنوں نے بتا دی ہے

ہر ذرّۂ صحرا نے تعلیمِ وفا دی ہے

انصاف کی رکھ دی ہے دُنیا نے بِنا اُس پر

نا کردہ گناہوں کی ہم کو جو سزا دی ہے

سوئی ہوئی راتوں کے جاگے ہوئے خوابوں میں

اپنی ہی صدا ہم نے سُولی پہ چڑھا دی ہے

تاج اور ایلورا کی دھرتی میں نہیں کیا کچھ

کہسارِ ہمالہ ہے کشمیر کی وادی ہے

ماضی سے جُڑا ہے کیوں فردا مِرا میں نے تو

بیتے ہوئے وقتوں کی ہر بات بُھلا دی ہے

تابانیِ مہر و مہ سب پھیکی پڑی جس سے

گردوں سے ٹپک کر وہ تاروں نے ضیا دی ہے

اُس موجِ حوادش کو کیا کہئے ضیا جس نے

دیوار اُٹھائی تھی ساحل پہ جو ڈھائی ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

انتظارِ صبحِ نَو ہے شام سے

رات کٹ جائے کہیں آرام سے

جل اُٹھے دل میں اُمیدوں کے چراغ

دی مجھے آواز کس نے بام سے

کاروبارِ زندگی چلتا رہا

اِک مسلسل کوششِ ناکام سے

اور کتنی دوُر ہے منزل ابھی

پُوچھتا ہوں لغزشِ ہر گام سے

کوُ بہ کوُ صحرا بہ صحرا در بدر

ہم رہے آوارہ و بدنام سے

عشرتِ آغاز کا اندازہ کر

اے دلِ مضطر غمِ انجام سے

توڑ ہی دی ہم نے توبہ اے ضیا

تنگ آکر گردشِ ایّام سے

بمبئی ــ ١٩٦٨

ایک مندر جو دل کے اندر ہے

کسی نٹ کھٹ کا غالباً گھر ہے

موت کا خوف تھا کبھی دل میں

رات دن زندگی کا اب ڈر ہے

حرفِ مطلب کو دُشمنی لب سے

کوئی تو زخم میرے دل پر ہے

پیٹتا ہے ڈِھنڈورا جو اپنا

وہی اِس دَور کا پیمبرہے

خار و گل میں تمیز کیا کیجے

دلشکن بھی ہے وہ جو دلبر ہے

وقت کے ہاتھوں اُجڑی بستی میں

گِرتی دیوار ٹوُٹتا در ہے

اے ضیا سر پھروں سے کون کہے

آدمی آدمی برابر ہے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

بادِ خزاں نہ جانے کیا راز کھولتی ہے

پھولوں کی پتیوں کو مٹی میں رولتی ہے

بے چارہ مر چُکا ہے ہستی کے غمکدے میں

اب یادِ یار ناحق دل کو ٹٹولتی ہے

اے فطرتِ گلستاں تیری ستم ظریفی

کلیوں کی مُسکراہٹ کانٹوں میں تولتی ہے

تکمیلِ عشق اے دل کہتے ہیں کیا اِسی کو

خاموش ہم ہیں اُن کی تصویر بولتی ہے

اے میری چشمِ گریاں آنسو ہیں تیری دولت

نا یاب گوہروں کو مٹی میں رولتی ہے

بلبل کے دل سے پوُچھو وہ عالمِ تباہی

نورس کلی چمن میں جب آنکھ کھولتی ہے

دیوانگی پہ قابوُ پا ہی لیا ضیا نے

ہر جُنبِش اُس کے لب کی اب راز کھولتی ہے

بقدرِ عزم عمل کا جو حوصلہ کرتے

تو اہتمام کسی انقلاب کا کرتے

ذرا بھی تابِ تماشائے حُسن تھی نہ جنِہیں

وہ خاک جرأتِ اظہار مدّعا کرتے

نقوشِ پا پہ نہ کرتے صنم کدے تعمیر

تو ہم نمازِ محبّت کہاں ادا کرتے

ہمارا عالمِ ہستی کچھ اور ہی ہوتا

نہ کہتے اپنی اگر آپ کا کہا کرتے

لہو سے لکھتے رہے داستانِ آزادی

بقیدِ ہوش اسیرانِ شوق کیا کرتے

مسافرانِ عدم کا تھا حوصلہ ورنہ

بس ایک جست میں طے اتنا فاصلا کرتے

شعاعِ مہر صبوحی میں خود اُتر آئی

ضیا کا نام اگر شاملِ دعا کرتے

نئی دہلی – ۱۹۷۷

بہارِ گلشن شباب پر ہے شباب فصلِ بہار سا ہے

روش روش رقصِ رنگ و نکہت کلی کلی پر نکھار سا ہے

فلک پہ تارے کہاں چُھپے ہیں زمیں کی شمعیں کہاں بُجھی ہیں

وہی مِرے دل کی دھڑکنیں ہیں وہی تیرا انتظار سا ہے

گناہ ٹھہری تھی بیگناہی مگر ابھی تک ہے میرے دل میں

تِرے غضب پر گمانِ رحمت گمان جو اعتبار سا ہے

کروڑوں نغمے سے گونج اُٹھے ہزاروں کلیاں سی کِھل گئیں پھر

تم آ گئے ہو تو باغِ دل میں خزاں کا موسم بہار سا ہے

خموش دریا ہے باغ بھی چُپ بتائے اب کون کس سے پوُچھوں

وہ موج کیا ہے جو تیغ سی ہے وہ پھُول کیا ہے جو خار سا ہے

نہ جانے شکوہ سرائے ہستی ہوں کس لئے صبح و شام پھر بھی

تِری توجّہ کی کیا کمی ہے تِرا تغافل بھی پیار سا ہے

نہ جاؤ گستاخیوں پر اس کی کرو نہ اس کا حسابِ عصیاں

ضیائے جرعہ کشِ محبّت سے بڑھ کے بھی کوئی پارسا ہے

نئی دہلی — ۱۹۷۷

یاد بیتے ہوئے لمحوں کی دلاتا ہے مجھے

رات کے پچھلے پہر کون جگاتا ہے مجھے

محفلِ شوق میں جانباز پتنگوں کے لئے

شمع کا جلنا سرِ شام جلاتا ہے مجھے

جانے وہ دامنِ دل پر مِرے کب ٹپکے گا

اشکِ خوں جو تِری پلکوں پہ بٹھاتا ہے مجھے

چاندنی ہے مِرے آنگن میں کبھی دھوپ کبھی

جانے کیوں سایہ مِرا پھر بھی ڈراتا ہے مجھے

آنکھ سُورج سے ملا لوں تو غنیمت جانوں

میرا مقصودِ نظر کب نظر آتا ہے مجھے

اُس پہ پڑ جاتا ہے پردہ جو میں ہوتا ہوں عیاں

اور ہوتا ہے وہ ظاہر تو چھُپاتا ہے مجھے

خود نمائی کا تقاضا ہے ضیا جی ورنہ

آئینہ میرا ہی کیوں عکس دکھاتا ہے مجھے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

بے نیازانہ گزر جائیں گل و گلزار سے

ربط اِتنا آبلہ پائی کو نوکِ خار سے ؟

کیا ہوئی وہ شورشِ ہنگامۂ محشر نژاد

کیوں ٹپکتی ہے اُداسی سی در و دیوار سے

کر رہا ہوں اپنے خونِ دل کے قطروں کا شمار

سُرخیاں دو چار لے کر آج کے اخبار سے

جھانکتی ہے صبحِ نو چاکِ گریباں سے مِرے

آشیاں کرتا ہوں روشن برقِ شعلہ بار سے

آج بھی حق بات کہنے پر ہے پابندی وہی

آج بھی ہم کو تعلق ہے صلیب و دار سے

ہو کے ظاہر کر گیا بے گانۂ ہوش و حواس

حُسن کیا پردوں میں چھُپتا طالبِ دیدار سے

اے ضیا بڑھتا ہی جاتا ہے شبِ غم کا ہراس

مانگ کر سایہ خجل ہوں سر بلند اشجار سے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

پردہ چہرے سے اُٹھا رکھا ہے

کھُلی آنکھوں پہ گِرا رکھا ہے

وہ دلوں میں ہے نہ بازاروں میں

نام جس شے کا وفا رکھا ہے

میری آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈالو

آئینہ خانے میں کیا رکھا ہے

آمدِ حُسن ہے کیا آنگن میں

شور کووں نے مچا رکھا ہے

جھُوٹ کے شہر کی خوش فہمی نے

سچ کو سُولی پہ چڑھا رکھا ہے

کون پہچانے کسے سب نے یہاں

چہرہ چہرے پہ لگا رکھا ہے

اِن دھڑکتے ہوئے شعروں میں ضیا

اور کیا دل کے سِوا رکھا ہے

لکھنؤ ــ ۱۹۸۰

پنچھی بیٹھا ہے پر تولے

کوئی آکر پنجرا کھولے

جینا ہی ٹھہرا تو اے دل

صبح نہیں تو شب کا ہولے

کس کو فُرصت ہے دُنیا کے

سر بستہ رازوں کو کھولے

امرت میں بِس گھول رہے ہیں

کوئی بِس میں امرت گھولے

سُورج بھی چُندھیا جائے گا

ذرّہ اپنی آنکھ تو کھولے

پیاس بُجھاؤں پی کر آنسو

بھُوک مِٹاؤں کھا کر چھولے

آتی رہےگی موت ضیا تُو

ہستی کے رستے پر ہولے

بمبئی ـــ ١٩٦٧

پھیلا جو قطرہ موجۂ طوفاں ہوا تو ہے

جوشِ نمو سے ذرّہ بیاباں ہوا تو ہے

پھر بال و پر کو ہمّتِ پرواز مِل گئی

پھر سازگار عالمِ امکاں ہوا تو ہے

پھر ہدّ احتیاط سے دستِ طلب بڑھا

پھر تار تار دل کا گریباں ہوا تو ہے

اب بھی اگر نہ آؤ تو میں تم سے کیا کہوں

روشن چراغِ خوں سرِ مژگاں ہوا تو ہے

بازارِ زندگی میں ہے جنسِ وفا گراں

انسان کا لہو مگر ارزاں ہوا تو ہے

اے میرے ناخدا مجھے دریا میں ڈُوب کر

اندازۂ تلاطم و طوفاں ہوا تو ہے

گل کِھل کے ایک پل کے لئے ہی سہی ضیا

غمخانۂ حیات میں شاداں ہوا تو ہے

نئی دہلی — ۱۹۷۹

تڑپ سے دل کی ہے عاری جو زندگی کیا ہے

نہ ہو خلوص و محبّت تو آدمی کیا ہے

ذرا نگاہِ قیامت اثر اُٹھا دیکھو

ضرورت آپ کو خنجر کی تیغ کی کیا ہے

کسی کو تیرا تجسّس کسی کو اپنی تلاش

بتائے کون خودی کیا ہے بیخودی کیا ہے

حیاتِ نو دلِ مُردہ کو بخشنے والا

دراصل دستِ مسیحا ہے درد بھی کیا ہے

کھنکتے جاموں میں سُنتا ہوں دھڑکنیں دل کی

نظر نظر کا تصادم ہے نغمگی کیا ہے

ہر ایک شعر کسی دُکھتی رگ کا ہے نبّاز

ہے دل سے نکلی ہوئی آہ شاعری کیا ہے

ضیا کے پاس ضیا کی تلاش لائی تھی

مگر یہاں بھی اندھیرے کی لٹ کھُلی کیا ہے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

تصویر کا ہر رنگ نمایاں نہ کریں گے

ہم شوق کی رُسوائی کا ساماں نہ کریں گے

لائے تو ہیں بازار میں دل بیچنے والے

یہ جنسِ گراں ہے اِسے ارزاں نہ کریں گے

تم بھی نہ کرو وسعتِ صحرا کا مداوا

ہم بھی گلۂ تنگیِ داماں نہ کریں گے

بربادیِ گلشن سے کہاں جائیں گے بچ کر

آباد اگر گوشۂ زنداں نہ کریں گے

رہ جائیں گے محروم وہ ساحل کے سکوں سے

جو پرورشِ شورشِ طوفاں نہ کریں گے

کیوں زخمِ حوادش کو یہی ضد ہے ابھی تک

ظلمت کدۂ دل میں چراغاں نہ کریں گے

ہیں متفق اب اس پہ ضیا اپنے پرائے

ہمدرد کبھی درد کا درماں نہ کریں گے

نئی دہلی — ۱۹۷۹

تنہائی کا سکوت صدا آشنا تو ہے

ظاہر نہیں مگر کوئی مجھ میں چُھپا تو ہے

حیراں ہوں پھر بھی تیری دوا کارگر نہیں

اے چارہ ساز میرے لبوں پر دعا تو ہے

اب راکھ رہ گئی ہے دلیلِ اُمیدِ صبح

اِس انجمن میں شب کی مِرا دل جلا تو ہے

دو ساحلوں کے بیچ میں اے بعدِ مستقل

دریا لہو کا صدیوں سے بہتا رہا تو ہے

کر لے خراجِ سجدہ جبینوں سے جو وصول

میرے صنم کدے کا وہی بُت خدا تو ہے

میں بھی شبِ حیات کے گیسو سنوار لوں

سُورج کے دستِ شوق میں اب آئینا تو ہے

جشنِ غزل سرائی میں تعوفیق کس لئے

کوئی نہیں ہے بزمِ سخن میں ضیا تو ہے

نئی دہلی - ۱۹۷۹

تھپیڑے ہم امواج کے سہتے سہتے

کنارے پہنچ جائیں گے بہتے بہتے

چلو اب نئی دُنیا آباد کر لیں

کہ جی بھر گیا ہے یہاں رہتے رہتے

فریبِ تلاشِ نشاطِ سکوں میں

کٹی عمر رنج و الم سہتے سہتے

کسی روز دُنیا سے اُٹھ جائیں گے ہم

فسانہ غمِ عشق کا کہتے کہتے

مسرّت کا احساس بھی اب نہیں ہے

ہوا حال دل کا یہ غم سہتے سہتے

ہمیں آخرِ کار نیند آ چلی تھی

وہ کیوں رُک گئے داستاں کہتے کہتے

ترستی ہیں اب قطرۂ خوں کو آنکھیں

ضیا خُشک دریا ہوا بہتے بہتے

دلّی ــ ۱۹٤٦

جلوہ آباد جب آغوشِ نظر ہوتی ہے

دیکھنے والے کو کب اپنی خبر ہوتی ہے

سلسلہ طولِ شبِ غم کا کہیں ختم بھی ہو

ورنہ ہونے کو تو ہر روز سحر ہوتی ہے

کون جانے کہ پسِ پردۂ قتلِ خورشید

شورشِ زیست بعنوانِ دگر ہوتی ہے

نظر آتا نہیں در کوئی تِرے در کے سِوا

تُو جدھر ہوتا ہے دُنیا ہی اُدھر ہوتی ہے

شمع جلتی ہے بھری بزم میں شب بھر لیکن

تہمتِ عشق تو پروانے کے سر ہوتی ہے

انتہا غم کی ہے آغازِ نشاطِ مستی

حد سے بڑھ جاتی ہے جب رات سحر ہوتی ہے

اے ضیا حُسنِ توجّہ کی قسم ہونے دو

دل کی رُسوائی زمانے میں اگر ہوتی ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۳

جنوں بھی ہے جمال بھی جبیں بھی آستاں بھی ہے

کہاں ہے اشتیاقِ سجدہ ؟ اُس کا کچھ نشاں بھی ہے ؟

دیارِ حُسن و نُور میں تلاشِ عشق ہے مجھے

کہ زلف و رُخ کی داستاں ہی دل کی داستاں بھی ہے

جہاں ہے پھُول کی ہنسی وہیں ہے خار کی چُبھن

دلوں کے کاروبار میں تو سُود بھی زیاں بھی ہے

چلیں قدم سے اب قدم ملا کے راہِ شوق میں

یہ میرا امتحاں نہیں یہ اُن کا امتحاں بھی ہے

کرن کرن اُمید و شوق سایہ سایہ یاس و غم

دلِ جنوں نواز کو یقیں بھی ہے گماں بھی ہے

رہِ فرار ہے کِدھر کہاں چُھپاؤں اپنا سر

زمیں کو بیر ہے اگر تو دُشمن آسماں بھی ہے

ضیا وہ عیب جوُ نہیں یہ راز جس نے پا لیا

کہ حُسن ہے وہاں وہاں نگہ جہاں جہاں بھی ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

جو سمجھنا تھا ہمیں وہ ہم کہاں سمجھا کئے

راہزن کو ہی امیرِ کارواں سمجھا کئے

خُشک آنکھیں ہو گئیں رو رو کے جن کی رات بھر

وہ ہر اِک قطرے کو بحرِ بیکراں سمجھا کئے

گردشِ ایّام سمجھاتی رہی رازِ حیات

ہم سمجھنے کی طرح لیکن کہاں سمجھا کئے

تھا ہمیں پاسِ وفا کرتے بھی اُن سے کیا گلہ

درد کو باعثِ آرامِ جاں سمجھا کئے

جام آتے ہی رہے گردش میں روزو شب مگر

تشنہ لب ہی کچھ غمِ تشنہ لباں سمجھا کئے

ہم میں تم میں ربطِ باہم تھا ازل سے اِس لئے

حُسن کو تم عشق کو ہم جاوداں سمجھا کئے

یہ ہماری سادہ لوہی تھی کہ کج فہمی ضیا

خار زارِ زندگی کو گلستاں سمجھا کئے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

چاکِ دامن کا بھرم رکھ لیا رُسوائی نے

اوڑھ لی غم کی ردا درد کے شیدائی نے

شوق کے جادۂ پُر پیچ کو اے پائے جنوں

کِیا ہموار تِری حوصلہ افزائی نے

شبنمی قطروں کا یہ رقص حرے پتّوں پر

دل کے زخموں کو نہ بھرنے دیا پُروائی نے

دم بدم بڑھتی ہوئی بھیڑ میں رہنے نہ دیا

غمِ تنہائی کا احساس بھی تنہائی نے

ہائے کب کھولے ہیں یادوں کے دریچے دل میں

اجنبی گاؤں کی بجتی ہوئی شہنائی نے

سِلوٹیں بِسترِ راحت کی بنیں نشترِ غم

دیا پیغامِ سحر رات کی انگڑائی نے

آڑے آئی ہے تِری مشقِ سخن ورنہ ضیا

کہلوائی ہے غزل قافیہ پیمائی نے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

حاداشوں کی دین ہے یہ آگہیِ دل مجھے

میں ہی تھا خود اپنی منزل مِل گئی منزل مجھے

وہ شناور ہوں کہ سُن کر ڈوُب جانا ہی پڑا

موجِ طوفاں کی زباں سے نالۂ ساحل مجھے

کل جو طعنِ گمرہی دیتے تھے وہ دیکھیں کہ آج

ہر قدم پر دوڑ کر لیتی ہے خود منزل مجھے

چُپ رہا میں بھی کہ بِن مانگے ہی جھولی بھر گئی

خوش رہا وہ بھی کہ بخشی کائناتِ دل مجھے

میں سنواروں گیسوئے ہستی مگر اے دل بتا

تیری وحشت نے کہاں رکھا کسی قابل مجھے

یہ ہجومِ یاس و غم یہ عالمِ بیم و رضا

اے خدا پتّھر دیا ہوتا بجائے دل مجھے

میری شوریدہ سری کو کون سمجھےگا ضیا

بہرِ سجدہ مِل گیا ہے آستانِ دل مجھے

بمبئی – ١٩٦٧

حُسن کی بارگاہ میں آگ بھی ہے دُھواں بھی ہے

عشق کے کاروبار میں سُود بھی ہے زیاں بھی ہے

بیم بھی ہے رجا بھی ہے وہم بھی ہے گماں بھی ہے

درد و الم کی بھیڑ میں دل کا کہیں نشاں بھی ہے ؟

کون سُنے گا دھڑکنیں تیری دیارِ غیر میں

اے دلِ درد آشنا حوصلۂ بیاں بھی ہے ؟

درد اساسِ کائنات درد بنائے زندگی

درد دل و جگر میں ہے درد یہاں وہاں بھی ہے

ڈھُونڈ رہے تھے ہم جسے رام وہ مِل گیا مگر

تیر کا کچھ پتہ نہیں ٹوُٹی ہوئی کماں بھی ہے

میرے وجود پر زمیں رقص کناں و نغمہ خواں

میرا وجود باعشِ گردشِ آسماں بھی ہے

چل کے اُسی سے کہہ نہ دوں حالِ دل اپنا اے ضیا

وہ مِرا ہمنوا بھی ہے وہ مِرا ہمزباں بھی ہے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

خود پرستی شباب کی سی ہے

کیف و مستی شراب کی سی ہے

موت کا انتظار شام و سحر

فکرِ ہستی عذاب کی سی ہے

میری تقدیر کی کتابت بھی

کسی سستی کِتاب کی سی ہے

دھُول آنکھوں کی آنکھ کا کاجل

دل کی بستی سراب کی سی ہے

شہرِ نغمہ کا زیر و بم توبہ

اوج و پستی رباب کی سی ہے

زیر دستوں کی یہ زبُوں حالی

چہرہ دستی عتاب کی سی ہے

پار اُترنا ہے ڈوُب کر ہی ضیا

رودِ ہستی چناب کی سی ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

دستک یہ کون دیتا ہے دروازہ کھولئے

جھونکا نسیمِ صبح کا ہے آنے دیجئے

اپنی خبر ہی ہم کو بھری بزم میں نہیں

تنہایوں کا ذکر ہے کیوں یہ نہ پوچھئے

کچھ تھا مِری انا کا تقاضہ کچھ اُن کی ضِد

کرتا رہا گناہ وہ جب تک گِنا کئے

بُجھتی نہیں ہے آگ پتنگوں کی تا ابد

جلتی ہے شمعِ بزم بس اک رات کے لئے

کرتا ہے وقت شب کے اندھیروں میں دم بدم

بُجھتے ہوئے چراغوں سے روشن نئے دیئے

دُنیا سے بیر دین سے نفرت خدا کا خوف

جینا ہی ہے تو اس طرح کب تک کوئی جئے

اب مانگنے پہ موت بھی آتی نہیں ضیا

کیوں زندگی مِلی تھی بغیر التجا کئے

بمبئی — ۱۹٦۸

دل حادثاتِ دہر کا شکوہ گزار ہے

نا آشنائے گردشِ دلیل و نہار ہے

غنچے چٹک رہے ہیں عنادل ہیں نغمہ خواں

آمد کسی کی آمدِ فصلِ بہار ہے

بجلی چمک کے چُھپ بھی گئی غارِ ابر میں

اے چشمِ شوق کس کا تجھے انتظار ہے

ڈر ہے کہ ہو نہ تیشۂ فرہاد سر نگوں

ہر سمت ایک سلسلۂ کوہسار ہے

بدلی برس چُکے گی تو چمکے گی تیز دھُوپ

کیا غم اگر خزاں بھی شریکِ بہار ہے

مِلتا ہے پھل اُسی کو جو خود بڑھ کے توڑ لے

یہ کائنات اک شجرِ سایہ دار ہے

کر داغہائے دل کا شمار اے ضیا نہ پوچھ

باقی ہنوز کتنی شبِ انتظار ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۳

دل کے آنگن میں عجب شور مچا رکھا ہے

آسماں سر پہ ہواؤں نے اُٹھا رکھا ہے

گِھر کے آئی ہے گھٹا توبہ شکن ہے موسم

اِک نئی پیاس نے دیوانہ بنا رکھا ہے

حشر بن کر ہی تم آجاؤ کسی روز اِدھر

ہم نے دروازۂ دل کب سے کھلا رکھا ہے

گھر مِرا بھُول نہ جائے کہیں طوفانی ہوا

اِس لئے در پہ دِیا میں نے جلا رکھا ہے

دیکھتا ہوں کوئی پتّھر تو سمجھ لیتا ہوں

میرا ہی حوصلۂ لغزشِ پا رکھا ہے

اپنا چہرہ کبھی دیکھوں تو وہ آ جائے نظر

عکس جو آئینۂ دل میں چُھپا رکھا ہے

تم ضیا کہہ کے پُکارو کہ مجھے مہر کہو

ایک ہی بات ہے اب ناموں میں کیا رکھا ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

دل کے ہر داغ کو بے عیب ہنر جانا ہے

سُود کو اہلِ محبّت نے ضرر جانا ہے

سالہا سال کِیا دل کی تمنّاؤں کا خوُن

جب کہیں ہم نے تجھے دیدۂ تر جانا ہے

سادگی دیکھ محبّت کی دلِ زار نہ پوچھ

نظرِ حُسن کو کیوں حُسنِ نظر جانا ہے

فائزِ منزلِ مقصود وہی ہے جس نے

کہکشاں کو بھی تِری راہگزر جانا ہے

بجلیاں جس پر گِریں رات کی تاریکی میں

اُسے دل سوختہ نے اپنا ہی گھر جانا ہے

دیکھ لیں یا نہ اُسے دیکھیں بہر حال ہمیں

منزرستانِ چمن سے تو گزر جانا ہے

اے ضیا آگ کے دریا سے گزرنا ہوگا

شام کو شام سحر کو جو سحر جانا ہے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

رقص میں ساغرِ شراب آئے

آئے پھر موسمِ بہار آئے

پھر نہ ہو انقلاب کی اُمید

کوئی ایسا بھی انقلاب آئے

تا درِ شوق سجدے کرتا ہوا

پھر دلِ خانماں خراب آئے

کیا ہو مشرق سے آفتاب طلوع

بام پر جب وہ ماہتاب آئے

چاک دامان و خانماں برباد

وہ سوالی جو لاجواب آئے

فصلِ گل دوَرِ جام عہدِ شباب

بے حجابی کو کیا حجاب آئے

رات بیدار ہے ضیا کوئی

صبح بردوش مستِ خواب آئے

نئی دہلی — ۱۹۷۵

زمانے کو جیتا تو ہم خود سے ہارے

کھڑے ہیں سرِ راہ کپڑے اُتارے

یہ بے نام انجانے چہرے ہی چہرے

اب اس بھیڑ میں کوئی کس کو پکارے ؟

جگاتا رہوں غم کے جذبات کب تک

اُگاتا رہوں اپنی پلکوں پہ تارے

وہ ٹپکا ہوا قطرۂ اشک جس کو

بہانے چلے وقت کے تیز دھارے

دورنگی میں بھی شانِ یکرنگی ایسی

وہی سنگریزے وہی ماہ پارے

بڑھی پا شکن عشق کی رہگزر تھی

کوئی ساتھ چلتا بھی کب تک ہمارے ؟

ضیا اب کوئی موج ایسی بھی اُٹھے

مِلا دے جو دریا کے دو نوں کِنارے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

عشق پھر اپنا ہی جویا ہے خدا خیر کرے

دل تِرے کوچے میں کھویا ہے خدا خیر کرے

کون اب میرے سفینے کا لگائے گا سُراغ

نا خداؤں نے ڈبویا ہے خدا خیر کرے

یہ اُسی کی ہے خلش خار جو اُن پلکوں نے

دل کے پہلو میں چُبھویا ہے خدا خیر کرے

کٹ گئی آنکھوں ہی آنکھوں میں شبِ غم جس کی

وہ سحر ہونے پہ سویا ہے خدا خیر کرے

بانجھ دھرتی میں تِری اے دلِ مُردہ ہم نے

بیج اُمید کا بویا ہے خدا خیر کرے

قیس و فرہاد کہاں تازہ حوس کاروں نے

عشق کا نام ڈبویا ہے خدا خیر کرے

پھر بہار آئی ہے پھر شعلہ و شبنم کو ضیا

ایک رِشتے میں پِرویا ہے خدا خیر کرے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

قطرے قطرے میں چھلکتے ہیں سمندر کتنے

ذرّے ذرّے میں چھلکتے ہیں سمن بر کتنے

منتظر پردہ کشائی کے ہیں دیدار طلب

بھیگی پلکوں پہ سجائے ہوئے منظر کتنے

میں نے پہچان لیا ہاتھ سے جانے نہ دیا

وقت آیا ہی کیا بھیس بدل کر کتنے

طرح میخانہ بھی رکھ دونگا یہ معلوم تو ہو

مسجدیں کتنی ہے اِس شہر میں بُت گھر کتنے

دل جلی شاخ پہ جس پر نہ نشیمن ہے نہ گل

دم بخود بیٹھے ہیں لب بستہ نواگر کتنے

دُشمنوں کا ہو بھلا یہ بھی نہ پوُچھا اب تک

زخم اپنوں نے دیئے اے دلِ مضطر کتنے

شب پہ الزام جو دھرتے ہیں بتائیں تو ضیا

پُر شکن پائے گئے صبح کو بستر کتنے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

کام کرنے کو جو آئے ہیں وہ کر جانا ہے

جینے والوں کو کسی روز تو مر جانا ہے

راہِ خورشید وہ کیا دیکھ رہا ہے جس کو

دھُوپ میں اپنی ہی پرچھائیں سے ڈر جانا ہے

سجدے کرتے چلے جاتے ہیں رہِ اُلفت میں

ہم نے ہر نقشِ قدم کو تِرا در جانا ہے

سر میں سودائے صداقت لئے اے پائے جنوں

منزلِ دار پہ بے خوف و خطر جانا ہے

اُس مسافر کو نہ منزل کا نہ رہبر کا پتہ

جس نے آغاز کو انجامِ سفر جانا ہے

روکتی ہے ہمیں دھرتی تو بُلاتا ہے فلک

جی نہیں چاہتا جانے کو مگر جانا ہے

میرا جینا بھی ہے کس کام کا میں نے تو ضیا

شجرِ زیست کو بے برگ و شمر جانا ہے

نئی دہلی – ۱۹۸۰

کاوشِ رہبراں سے ٹکرائے

ہمقدم کہکشاں سے ٹکرائے

میں وہ آئینہ ہوں کہ عکس مِرا

جلوۂ مہ و شاں سے ٹکرائے

ہوشمندی یہی تو ہے کہ بشر

مستیِ جاوداں سے ٹکرائے

جلوہ بینی بہ قدرِ ذوقِ نظر

پردۂ درمیاں سے ٹکرائے

کہاں طوفاں جو سر اُٹھا کر اب

موجِ آبِ رواں سے ٹکرائے

جس کی انجام پر نظر ہو وہی

فکرِ سود و زیاں سے ٹکرائے

پرِ پرواز اے ضیا ! کب تک

کوششِ رائگاں سے ٹکرائے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

کشتی کی شکستہ حالی پر ملاّحوں کے دل بیٹھ گئے

بڑھتے طوفاں کے رستے میں حائل تھے جو ساحل بیٹھ گئے

کچھ کام نہ آیا عزمِ جواں ہمّت کا بھی دامن چھُوٹ گیا

یارانِ سفر چلتے چلتے تھک کر سرِ منزل بیٹھ گئے

سُونا میخانہ چُپ مینا پیمانہ تہی توبہ توبہ

آنکھیں کیا پھیریں ساقی نے لب خشک ہوئے دل بیٹھ گئے

بازو کی قوت نے ٹکڑے ٹکڑے دھرتی کے کر ڈالے

کچھ لوگ اُٹھے، اپنی اپنی لے کر حدِ فاصِل بیٹھ گئے

ہنگامۂ ہستی ساحل پر دھڑکن سے بپا کر ہی دیں گے

وہ دل جو ڈبو کر کشتی کو طوفاں کے مقابل بیٹھ گئے

تاریکیِ شب کافور ہوئی انوارِ سحر پھیلے ہر سُو

اِک چشمِ تماشا کیا اُٹھی سب پردۂ حائل بیٹھ گئے

جاتے تو کہاں جاتے وہ ضیا مارے مارے پھرتے کب تک

وابستہ اُمیدیں تھیں جس سے اُس در پر سائل بیٹھ گئے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

کہتے ہیں جس کو حاصلِ مے خانہ کون ہے

توڑے ہیں جس نے توبہ و پیمانہ کون ہے

بے گانگی میں کس کی ہے رنگِ یگانگی

اپنا جو ہو سکا نہ وہ دیوانہ کون ہے

جُز موج کیا ہے سلسلۂ ابرِ کوہسار

جُز شمع حسرتِ دلِ پروانہ کون ہے

مستی وہ کیا کہ جس میں ہو مستی کی بھی خبر

میں کیا بتاؤں ساقیِ مے خانہ کون ہے

پلکوں پہ میری خواب سجا کر تمام رات

کہتا ہے مجھ سے جو مِرا افسانہ کون ہے

ہر عکسِ آئینہ سے اب آئینہ خانے میں

دیوانہ پُوچھتا ہے کہ دیوانہ کون ہے

دیوانہ کہہ کے اُس نے اُٹھا تو دیا ضیا

اب مجھ سا بزمِ دہر میں فرزانہ کون ہے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

کِھلیں جو پھول تو خاروں کی بات ہوتی ہے

خزاں جب آئے بہاروں کی بات ہوتی ہے

دلِ فلک بھی لرز جاتا ہے جسے سُن کر

وہ تیرے سینہ فگاروں کی بات ہوتی ہے

دلوں میں لیتی ہے انگڑائی یادِ گلبدناں

لبوں پہ لالہ عزاروں کی بات ہوتی ہے

ہر ایک ذرّہ ہے رشکِ صد آفتاب مگر

ہنوز چاند ستاروں کی بات ہوتی ہے

وہاں بھی ہوتا ہے ذکرِ شراب و جام و سبو

یہاں بھی بادہ گساروں کی بات ہوتی ہے

بچانے والے سہارے ہی ڈوب جائیں تو پھر

ڈبونے والے کناروں کی بات ہوتی ہے

ضیا قریب جب آتے ہیں دو دھڑکتے دل

نظر نظر کے اشاروں کی بات ہوتی ہے

نئی دہلی – ۱۹۷۷

کہیں یہ جبہ سائی سعی لا حاصل نہ بن جائے

کسی کا کاسۂ سر کاسۂ سائل نہ بن جائے

نہ روک اے لغزشِ پا بیٹھ کر پھر کون اُٹھا ہے

رہِ پُر پیچ کا یہ موڑ ہی منزل نہ بن جائے

اُمیدیں آرزویں حسرتیں یادیں مناجاتیں

سکوتِ خلوتِ دل شورشِ محفل نہ بن جائے

اُبھر آتے ہیں تازہ زخم زخمِ کہنہ بھرنے تک

مسیحا وقت کا خنجر بکف قاتل نہ بن جائے

نہاں خانے میں دل کے قید کر رکھتا ہوں ہر جلوہ

کسی کا آئینہ عکسِ مہ کامل نہ بن جائے

تڑپ کیوں دل میں جاگے کیوں رگِ غنچہ پھڑک اُٹھے

محبّت کی تن آسانی اگر مشکل نہ بن جائے

کِیا پَر نوچ کر آزاد کوشش تھی ضیا اُس کی

کوئی مُرغِ قفس پرواز کے قابل نہ بن جائے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۷

گلے فلک سے نہ بڑھ کر اگر سحاب ملے

کسی کو تیرا پتا کیا دلِ خراب ملے

خرد سے زلفِ محبّت سُلجھ سکی نہ کبھی

دیارِ شوق میں دیوانے کامیاب ملے

وہ اک نگاہ کہ سو حشر کر گئی برپا

یہ ایک دل کہ جسے زخم بے حساب ملے

قدم ملا کے کہاں تک چلیں گے ساتھ مِرے

وہ ہمسفر جو سرِ جادۂ شباب ملے

وہ اور ہوں گے ہیں کانٹے ہی جن کی قسمت میں

گئے جدھر بھی ہمیں تو اُدھر گلاب ملے

پیالہ زہر کا پہنچا ہمارے ہونٹوں تک

دعا بہ لب تھے کوئی ساغرِ شراب ملے

اُسے تلاش ہو کیا سایۂ شجر کی ضیا

جُھاستی دُھوپ میں جو دشت محوِ خواب ملے

نئی دہلی – ۱۹۷۸

گو رنگ ہزاروں فلکِ پیر نے بدلے

تقدیر نہ لی مانگ کے تدبیر کے بدلے

ہاتھ آئی محبّت کی جنوں گاہِ طلب میں

طولانیِ شب زلفِ گرہ گیر کے بدلے

مُدّت ہوئی چاہا تھا تجھے مجھ سے ابھی تک

لیتا ہے زمانہ اُسی تقصیر کے بدلے

نالے کو مِرے تا درِ محبوب بہت ہے

مل جائے رسائی ہی جو تاشیر کے بدلے

دوڑاتا ہوں کاغز پہ میں الفاظ کے گھوڑے

ہاتھوں میں قلم ہے مِرے شمشیر کے بدلے

بھُولے سے بھی جاتا نہیں اس شہرِ خرد میں

تحقیر جہاں دل کی ہو توقیر کے بدلے

دیوانوں کو خوش آیا ضیا موسمِ گل میں

یہ دامِ جنوں حلقۂ رنجیر کے بدلے

احمدآباد ۔ ۱۹٦٦

مے خانے میں رات ہو گئی ہے

تدبیرِ نجات ہو گئی ہے

بن کر جو دعا لبوں پر آئی

مقبول وہ بات ہو گئی ہے

کیوں آنکھیں کھُلی ہوئی ہیں اب تک

سو جاؤ کہ رات ہو گئی ہے

آئے کہ نہ آئے میرے لب پر

آنکھوں سے تو بات ہو گئی ہے

وہ مجھ کو مِٹا کے کیوں نہ خوش ہوں

تکمیلِ حیات ہو گئی ہے

ذرّات کی سوز آفرینی

صورت گرِ ذات ہو گئی ہے

سمجھے گا اب اس کو ضیا کون

در پردہ جو بات ہو گئی ہے

ناگپور ــ ۱۹۷٦

مے کشی کا لطف تو پی کر بہک جانے میں ہے

دیر کیا اے ساقیِ گلشن بہار آنے میں ہے

خندۂ گل نغمۂ بلبل سے کیا اس کو غرض

جو ازل سے مضطرب دُنیا کے غمخانے میں ہے

پی رہا ہوں پی ہی لوں گا ذوقِ مینوشی بخیر

تلخ و شیریں ساقیا جیسی بھی پیمانے میں ہے

لامکاں آخر مکاں کی قید میں آ جائے گا

کوئی مسجد میں تلاشی کوئی بُتخانے میں ہے

میرے دردِ دل کی اُسکی کج ادائی کی قسم

ہے تڑپنے میں مزا تو لطف تڑپانے میں ہے

میں خزاں میں بھی کہاں ہوں فصلِ گل سے بےخبر

ایک تنکا اب بھی باقی میرے کاشانے میں ہے

سُن تو لوں میں اس کی باتیں سُننے کا حاصل تو ہے

اے ضیا کوئی اثر ناصح کے سمجھانے میں ہے ؟

نکہتِ گل خلشِ خار کہاں تھی پہلے

زندگی اتنی گراں بار کہاں تھی پہلے

نہ سہی دل مگر آنکھیں تو مِلا کرتی تھیں

بیچ میں آہنی دیوار کہاں تھی پہلے

دیدۂ و دل پہ کیا سحر ترے جلووں نے

تیرگی شب کی پُر اسرار کہاں تھی پہلے

سرد مہریِ خریدار کو دیتا ہوں دعا

ورنہ یہ گرمئیِ بازار کہاں تھی پہلے

غمِ عشرت میں یہ اُلجھی ہوئی دل کی دُنیا

عشرتِ غم کی سزاوار کہاں تھی پہلے

شکریہ بازیِ اُلفت کی فسوں کاری کا

جیت سے بڑھ کے مِری ہار کہاں تھی پہلے

اے ضیا خوب نہیں تنگیِ افکار و لغات

تیرے اشعار میں یہ بات کہاں تھی پہلے

نئی دہلی — ۱۹۸۰

وہ پاکباز جو بادہ کشی کا دم بھرتے

نہ بھُول کر بھی کبھی شیخ جی کا دم بھرتے

جیؤ کہ موت کو آنا ہے آ ہی جائے گی

امر ہوئے جو مرے زندگی کا دم بھرتے

اُٹھو کہ دامنِ شب تار تار کر ڈالیں

مِلے گا نُور کہاں تیرگی کا دم بھرتے

تِری نگاہِ کرم بھی تھی شاملِ تخلیق

تو پھر فرشتے نہ کیوں آدمی کا دم بھرتے

یہ اہلِ عشق کی مستی کہاں اماں پاتی

جو اہلِ حُسن فقط ہوش ہی کا دم بھرتے

فریبِ منزلِ مقصود کھُل گیا ہوتا

جو رہنما نہ مِری گمرہی کا دم بھرتے

نجوم و ماہ ضیا رہ گئے بہت پیچھے

ہم آ گئے ہیں کہاں روشنی کا دم بھرتے

بمبئی — ١٩٦٦

ہر ایک پنکھڑی گُل کی ہے نوکِ خار مُجھے

فریب دیتی ہے کیا فصلِ نو بہار مُجھے

قریب آکے دلوں میں ہیں دُوریاں اب تک

نہ اعتبار اُنھیں ہے نہ اعتبار مُجھے

کہاں خلاؤں میں گم ہو گئی خدا جانے

وہ اک نگاہ کِیا جس نے بیقرار مُجھے

تڑپ تڑپ کے کِیا دل نے عشق کو رُسوا

کہیں کا بھی تو نہ رکھا مآل کار مُجھے

نظر کو دعوتِ جلوہ تو دے چُکا ہے بہت

سما کے اب مِرے دل میں کبھی پُکار مُجھے

بڑھا تو لوں گل و لالہ سے رسم و راہ بہت

فضا چمن کی کب آئے گی سازگار مُجھے

اُسے کسی سے کہوں کس طرح گوارا ہو

ضیا جو بات گزرتی ہے ناگوار مُجھے

نئی دہلی – ۱۹۸۰

ہر چاکِ جگر فصلِ جوانی تو نہیں ہے

ہر زخم محبّت کی نشانی تو نہیں ہے

ٹوُٹی ہوئی توبہ پہ پریشان ہے ناحق

بازار میں اس شے کی گرانی تو نہیں ہے

رودادِ حوادش وہ ذرا غور سے سُن لیں

ہر چند کہیں اس کو، کہانی تو نہیں ہے

ہو درد کسی دل میں بھر آتی ہے مِری آنکھ

ہے خون مری رگ میں یہ پانی تو نہیں ہے

مرمر کے جئے جاتا ہوں اب جان لے دُنیا

فانی ہوں میں ہستی مِری فانی تو نہیں ہے

جدّت کہ قدامت مجھے کیا فکر مِرا شعر

بیگانۂ مفہوم و معانی تو نہیں ہے

پاتے ہیں ضیا داد سخنور مگر اُن کی

قسمت میں مِری سحر بیانی تو نہیں ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۹

ہر قدم ہر موڑ پر اک تازہ دھوکا کھائے ہے

جب ہوا کے جنگوں میں آدمی کھو جائے ہے

میری کج فہمی تو دیکھو موت سے ڈرتا ہوں میں

یہ لباسِ نو عُروسِ کہنہ کو پہنائے ہے

کائناتِ بیکراں کو کس طرح کر لے اسیر

وہ تخیل جو فقط حدّ نظر تک جائے ہے

مانگ کر اس کو میں سمجھا تھا کہ سب کچھ مل گیا

تنگ دامانی پہ اب دل کس لئے شرمائے ہے

نام میں ایسی ہی شیرینی ہے کچھ جس کو زباں

بار ہا دہرا چُکی ہے بار ہا دہرائے ہے

ریگزارِ زندگی میں دوُر تک سایہ نہیں

کیا مسافر اِس جُھلستی دُھوپ میں سُستائے ہے

اے ضیا کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھا یہ راز

ایک دن جانا بھی ہے اُسکو یہاں جو آئے ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

یا ہواؤں کو ساحل نما کیجئے

یا کسی موج کو ناخدا کیجئے

ٹھوکریں کھائے جب تک نہ پائے وفا

کیا غمِ ناروا و روا کیجئے

رات تنہائی کی کاٹے کٹتی نہیں

وقت کو اور بھی تیز پا کیجئے

جاگتی صبح کی جگمگاتی کرن

رقص فرما ہوئی آنکھ وا کیجئے

صبح کے شور میں شمع خاموش ہے

اپنی ہی آگ میں اب جلا کیجئے

عقل کی رہنمائی ہے لا حاصلی

لاکھ رہزن ہو دل کا کہا کیجئے

اپنے بیگانے ہو جائیں جب اے ضیا

دوستی کے لئے کیا دعا کیجئے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

سوچ کا سفر

انتخاب و ترتیب : بلراج حیرت

تحریر : مصنف

سنِ اشعات : ۱۹۸۲

نا شر : دیوندر کمار سونی ، لندن

نصف صدی کی مشقِ سخن، تمام اصنافِ سخن پر قدرت ، عصری تقاضوں سے آگاہی ،

کلاسیکی ، ترقی پسند اور جدید صالح اقدار سے ہم آہنگی، تجربہ ، خلوص اور انساں دوستی

نے مل کر مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کی شاعری کو نیا لہجہ اور منفرد اندازِ بیاں بخشا ہے- اُن کے شعری مجمعے: طلوع، نورِ مشرق، ضیا کے سو شعر، نئی صبح، گردِ راہ، حُسنِ غزل، دھوپ اور چاندنی اور رنگ و نور اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں – سوچ کا سفر اُن کی نظمیہ شاعری کا سفرنامہ ہے -

بھگوان مہاویر

رسمِ "قربانی"میں کھو کر آدمی جب رہ گیا

ہو گیا مفقود "مذہب"، صرف "مطلب " رہ گیا

خود غرض انسانیت نے جب لیا درسِ غلط

کم نگاہی کا رواجوں نے دیا درسِ غلط

وادیوں میں "موت" کی جب "زندگی" گم ہو گئی

"رات" کی ظلمت میں "دن" کی روشنی کم ہو گئی

دیوتاؤں کی "خوشی" جب "خون" کی طالب ہوئی

ذہن پر انسان کے "حیوانیت" غالب ہوئی

جب خدائی پر ستم توڑے "خدا" کے نام نے

چھین لیں رعنائیاں آغاز سے انجام نے

جب محبّت کی جگہ نفرت دلوں پر چھا گئی

نسلِ آدم انتشارِ امن سے گھبرا گئی

تو اُٹھا اُس وقت سینے میں جہاں کا غم لئے

روز افزوں تیرگی میں نوُر کا پرچم لئے

توُنے نظروں کو عتا کیں "وسعتیں"کھوئی ہوئی

دیں گلوں کو رنگ و بوُ کی دولتیں کھوئی ہوئی

ابنِ آدم کو دیا توُنے "اہنسا" کا پیام

حق پرستی، حق نوائی کا کیا پھر اہتمام

"شادی" و غم کو نہیں "فکر و عمل" کے ماسوا

ہے ازل سے تا ابد یہ زندگی کا سلسلہ

وہ کوئی "خالق" ہے جس کو بیر ہو "تخلیق" سے ؟

آدمی حیوان بن جائے نہ کیوں "تفریق" سے

یوں تو "رستے" ہیں کئی، اُنکی مگر منزل ہے ایک

آر ہو یا پار، بحرِ زیست کا ساحل ہے ایک

"نغمہ و نالہ" سے جب بیگانہ ہو جائے حیات

کیوں نہ پا لے روح اپنی گمشدہ راہِ نجات

آدمی کا سر ہوا اونچا تِرے پیغام سے

نام اُس کا ہو گیا پائندہ تیرے نام سے

اے مہاویر، اے "چراغِ شب شکن" تجھ پر سلام

بھیجتی ہے محفلِ شعر و سخن تجھ پر سلام

ایک مدّت سے کھڑا ہوں میں بھی تیری راہ میں

کچھ کمی محسوس کرتا ہوں اب اپنی چاہ میں

منزلِ مقصود سے نا آشنا ہوں آج تک

بستیوں، ویرانوں میں گھُوما کیا ہوں آج تک

در بدر کی ٹھوکریں کھائی ہیں میں نے رات دن

ظلمتیں، ناکامیاں پائی ہیں میں نے رات دن

ظلم ڈھائے بھی، سہے بھی کارزارِ زیست میں

کھو دیئے ہوش و خرد سب اعتبارِ زیست میں

میری فطرت میں جو "ہنسا" ہے اُسے پالا کیا

پھُول مسلے، سارے گلشن کو تہہ و بالا کیا

تنگ اپنے کارناموں سے، ندامت کوش ہوں

دے مجھے پیغامِ تسکیں، میں ہمہ تن گوش ہوں

ہمکنارِ نُور کر میرے دلِ تاریک کو

عام کرنا ہے زمانے میں تِری تحریک کو

توڑ کر قصرِ انانیت، بشر آزاد ہے

واپس آ جائیں بہاریں، آشیاں آباد ہے

نئی دہلی — ۱۹۶۳

پاپ اور پشچاتاپ

یہ نگری ہے پاپ کی نگری

غم کی پشچاتاپ کی نگری

توڑ کے اِس نگری کے بندھن، دوُر کہیں اُڑ جاؤں

مکر و ریا کی دُنیا ہے یہ

ہرس و ہوا کی دُنیا ہے یہ

جینا، مرنا، مرنا، جینا، سمجھوں اور سمجھاؤں

مایا، لوبھ اور موہ کے بندے

لوُلے، لنگڑے، بھُوکے، ننگے

جی میں ہے کالے دن کو اُجلی رات بناؤں

استبداد کا بھانڈا پھوڑوں

ظلم کے دھارے کا منہ موڑوں

انساں کو انسان بنا کر راہِ حق پر لاؤں

ضبط اور صبر کروں گا کب تک

دل پر جبر کروں گا کب تک

خوشیوں کے گیتوں کے موتی لوُٹوں اور لوُٹاؤں

آزادی کے گیت سُنا کر

شادابی کا بھید بتا کر

دھرتی کے پیاسے کھیتوں پر پیار کی مے برساؤں

ذرّہ سُورج بن کر چمکے

قطرہ طوفاں بن کر اُبھرے

وجد میں آ کر جھُوموں ناچوں، دُنیا کو بھی نچاؤں

مِل کے جئیوں اور مِل کے مروں میں

مِل کر سارے کام کروں میں

مِل کے چلوں مشکل راہوں پر، مِل کر پاؤں بڑھاؤں

ماضی کا غم دل سے مِٹاؤں

مستقبل کے گیت سُناؤں

آج کی بُجھتی چِنگاری سے کل کے دیپ جلاؤں

انساں کی پہچان جہاں ہو

ہستی کا عرفان جہاں ہو

پریم اور سُندرتا کے سپنے دیکھوں اور دِکھاؤں

نئی دہلی ــ ۱۹٦٤

اہنسا

اہنسا لالزارِ علم و عرفاں　　اہنسا، منزلِ تسلیم و ایقاں
اہنسا، امن خوئی، صُلح جوئی　　اہنسا، دعوتِ صبحِ بہاراں

ربابِ شوق کی آواز، اہنسا　　شراب و شعر کا اعجاز، اہنسا
رہائی کو نوید اہلِ قفس کو　　نشاطِ جرأتِ پرواز، اہنسا

بتاؤں، آ، تجھے کیا ہے اہنسا　　فرشتہ آشتی کا ہے اہنسا
جُھکا دیتا ہے سر جو سر کشوں کے　　وہ نصب العین اہنسا ہے اہنسا

سکون و امن کی تائید، اہنسا　　نفاق و بُغض کی تردید، اہنسا
ازل سے تاابد ہے اس کا پرتو　　ہے خود تکمیل، خود تمہید اہنسا

نئی دہلی ــ ۱۹٦۵

ہولی

گلاب اس طرح اُڑے کہ گلستاں کو رنگ دے

زمیں کا عکسِ حُسن اُٹھ کے آسماں کو رنگ دے

کہاں ہے مہر کی کرن جو کہکشاں کو رنگ دے

جبینِ شوق بندگی سے آستاں کو رنگ دے

اُمنگ کی ترنگ دل میں اُٹھ رہی ہے پے بہ پے

ہر ایک طِفل و پیر کو، ہر اِک جواں کو رنگ دے

درِ نیاز پر جبیں جُھکی ہوئی ہے ناز سے

شکایتوں کو حُسن کر عطا، فغاں کو رنگ دے

یہ بزم تیری بزم ہے، حیا، حِجاب کس لئے

نظر اُٹھا کے پردہ ہائے درمیاں کو رنگ دے

ہوائیں بادہ بار ہیں، فضائیں کیف ریز ہیں

تو بیخودی کا عذر رکھ کے گلرخاں کو رنگ دے

یہ انتہائے درد ہے کہ درد خود ہے چارہ گر

ٹپک رہا ہے اشکِ خوں کہ دلستاں کو رنگ دے

یہ بزمِ کیف و رنگ ہے، کسی سے دشمنی نہیں

حیات کیوں نہ بڑھ کے مرگِ ناگہاں کو رنگ دے

یہ تیرے کام آئے گا جگر کا خون کب ضیا

جنوں کی رُت ہے، سُرخیوں سے داستاں کو رنگ دے

نئی دہلی — ۱۹٦۵

شکستِ شب

رات گئی، تاریکی سِمٹی
اپنی دُکاں ساقی نے بڑھائی
جام و صُراحی اوندھے پڑے ہیں
چہرۂ مے پر چھائی ہے زردی –
داغ بہ دل، اِک شمعِ فسردہ سوچ رہی ہے :
رند کہاں ہیں، جو محفل کو گرماتی تھیں، وہ آوازیں کون سُنے گا
جن پر ہستی اِتراتی تھی، اُن خوابوں کو کون بُنے گا ؟

سُورج کی پہلی ہی کرن نے
سارا افسوں توڑ دیا ہے
دِن کے ہنگاموں کی لگن میں
انساں خود کو بھُول گیا ہے ،

نئی دہلی – ۱۹٦٦

نئی منزل

اِک لڑکا – اِک لڑکی

لڑکے نے لڑکی کو دیکھا، لڑکی نے لڑکے کو

دونوں کے دل میں جاگی

انجانے جذبوں کی دُنیا،

ارمانوں کی سیج سجی ،

پھُول کھلے،

گلشن مہکا،

اموا کی کومل ڈالی پر کوئل کی وینا چہکی

اِک لڑکی – اِک لڑکا

جنم جنم کے ساتھی

بِچھڑ بِچھڑ کے جب ملتے ہیں

تاروں کے دیپک جلتے ہیں

رات کے کالے، اندھے پردے اُٹھ جاتے ہیں

انگڑائی لیتی آتی ہے

دُور اُفق سے

صبح کی دیوی

یہ لڑکی – یہ لڑکا

دونوں کے مِلنے سے تکمیلِ انساں مُمکن بنتی ہے

انسانیت جاگ اُٹھتی ہے

پیار کے پھُولوں کی خوش بوُ سے

باغ کی جھولی بھر جاتی ہے

جنگ کی شورش دب جاتی ہے

امن کے نغمے گوُنج اُٹھتے ہیں

سُورج، چاند، ستارے، ذرّے،

سب مِل کر آگے بڑھتے ہیں

ایک نئی منزل کی جانب –

بمبئی – ۱۹٦٦

دوای تنہائی

رات کے کالے سنّاٹے میں کون نہیں جو آکر اب
چُپکے سے میرے کانوں میں امرت کی ورشا کر دے
مدّت سے جو بند پڑے ہیں دل کے بُوڑھے دروازے
ننھے کومل قدموں کی ٹھوکر سے اُن کو وا کر دے

کوئی نہیں، جو سُن لے میرے غم پرور دل کی باتیں
آکر مجھ سے پوچھے: تنہائی اچھی لگتی ہے کیوں
سُورج سے کیا بیر ہے مجھ کو، چندا سے کیوں پیار نہیں
موت سی وحشت دُنیا پر چھائی اچھی لگتی ہے کیوں

یہ بستی ہے یا ویرانہ، شہر ہے کوئی یا مرگھٹ
انجانوں کی بات نہیں ہے، اپنے بھی بیگانے ہیں
زہرِ ہلاہل رگ رگ پھیلا، موت کے بس میں ہے ہستی
اک دیوانہ میں ہی نہیں ہوں، سارے یہاں دیوانے ہیں

تنہا آئے، تنہا جائے، ریت ہے یہ اس محفل کی
بھری پُری ہو کر بھی سُونی، جیت ہے یہ اس محفل کی
جسے جِلائے اُسے ہی مارے، پریت ہے یہ اس محفل کی
تنہائی سے نفرت کیسی، میت ہے یہ اس محفل کی

بمبئی ــ ۱۹۶۶

خلشِ وقت

وقت کی لمبی، ختم نہ ہونے والی ڈگر پر

چلتے چلتے، کھویا کھویا،

کرنوں کے روشن گھوڑے پر بیٹھا

بُوڑھا سُورج سوچ رہا ہے

دیکھ رہا ہے

کل کا قطرہ، آج ہے دریا

صحرا کا ہر ذرّہ ذرّہ

جوشِ نموُ سے تنگیِ داماں کا شاکی ہے

پھیل کے، بڑھ کر، کوہِ گراں بنتا جاتا ہے

اور یہ بُوڑھا سُورج کب تک

اپنی آگ میں جلتا رہے گا

کب تک ننھے، دمکتے تارے

اس کی پُوجا کرتے رہیں گے

کب تک خود سُورج نہ بنیں گے ؟

بُوڑھا سُورج سوچ رہا ہے

بمبئی ــ ۱۹٦٦

انقلابِ نوُر

چُبھتی ہے آنکھوں میں کانٹا بن کے صُورت رات کی
دل کی دھڑکن تیز کر دیتی ہے ہیبت رات کی
جب بِچھاتی ہے غموں کے جال وحشت رات کی
جب تجاوز حد سے کر جاتی ہے ظلمت رات کی
تیرگی کے بطن سے ہوتی ہے پیدا روشنی
بھرتی ہے کلیوں میں رنگِ موجِ صہبا روشنی

چاند ہوتا ہے طلوع اُس وقت مُسکاتا ہوا
رقص کرتا، گیت گاتا، نوُر پھیلاتا ہوا
چاندنی کے پھُولوں سے گلشن کو مہکاتا ہوا
سوزِ دل سے سینۂ گیتی کو گرماتا ہوا
نغمۂ نکہت سے وا ہوتی ہے آغوشِ ضیا
ڈوُب جاتا ہے نوا میں سازِ خاموشِ ضیا

جگمگاتی وادیوں میں ندّیاں محوِ خرام
کوہساروں پر غزلخواں پرچمِ امنِ دوام
کوہ، وادی دشت و صحرا فیضیاب و شاد کام
آدمی، آزادیوں کی عظمتوں سے ہمکلام

عالمِ وجدان و سرشاری میں کھوئی کائنات

سنوری سنوری، نکہری نکہری، اُجلی اُجلی کائنات

چاند، عکسِ مہر، حُسنِ صبحِ فردا، چاندنی

راحتِ دل، جنّتِ چشمِ تماشا چاندنی

زخمہائے جسمِ ہستی کا مداوا چاندنی

زندگی بخشِ چمن، دستِ مسیحا چاندنی

چاندنی سوزِ دروں، سحر و فسونِ آرزو

چاندنی سے گرمیِ بزمِ جنونِ آرزو

ہر بشر سجدے میں ہے، ہر لب پہ شورِ "واہ" ہے

اہلِ دل ہیں رقص فرما، دل کو دل سے راہ ہے

کارواں اب منزلِ مقصود سے آگاہ ہے

آسماں ہے شادماں، وقتِ طلوعِ ماہ ہے

پی کے بوندیں اوس کی سونا اُگلتی ہے زمیں

انقلابِ نُور کے سانچے میں ڈھلتی ہے زمیں

نئی دہلی – ۱۹٦٦

مانجھی

یہ طوفاں، یہ باد و باراں   یہ بپھری موجوں کے پیکا ں
کشتی کا دل چھلنی چھلنی   کب یہ کالی رات ہے ڈھلنی
کب نکلے گا صبح کا تارا   ما نجھی، کتنی دوُر کِنارا

پانی کی دیوار کھڑی ہے   سر پر اِک تلوار کھڑی ہے
گردوں پر چِنگھاڑتے بادل   گردابوں کی مہلک ہلچل
قطرہ قطرہ ہے انگارا   ما نجھی، کتنی دوُر کِنارا

خالقِ طوفاں ہے یہ سمندر   دُشمنِ انساں ہے یہ سمندر
کشتی موج سے ٹکراتی ہے   ہستی موت سے ڈر جاتی ہے
کب تک دیگی آس سہارا   مانجھی، کتنی دوُر کِنارا

اُٹھتی، گِرتی، بڑھتی موجیں   دھرتی کے سر چڑھتی موجیں
امن و سکوں کی ہائے گرانی   پانی، پانی، ہر سُو پانی
اُس کو ڈبویا، اِس کو ابھارا   مانجھی، کتنی دوُر کِنارا

اشکوں سے کیا کام چلے گا ڈوُبے گا جو ہاتھ ملے گا
دریاؤں سے سازش کر کے ساگر کے ساغر کو بھر کے
دوُر سے کس نے مجھے پُکارا مانجھی، کتنی دوُر کِنارا

ہر غم کا پچنا مشکل ہے دھاروں سے بچنا مشکل ہے
غرقابی کس کو راس آئی کس نے مر کر دُنیا پائی
دیوانہ ہے عالم سارا مانجھی، کتنی دوُر کِنارا

چاند نے آکر آفت ڈھائی طغیانی نے دھُوم مچائی
سمے قیامت کا آ پہنچا قطرے قطرے کا دل دھڑکا
کچھ تو منہ سے بول خدارا ما نجھی کتنی دوُر کِنارا

بمبئی ــ ١٩٦٨

فسانہ نگار کی تخلیق

رات تنہائی، اُداسی، خامشی،

یاس و غم، بیم و رضا،

موت کے سائے میں پل کر زندگی

چینختی، چِلّاتی، گِرتی، رینگتی،

وقت کی لمبی ڈگر پر پے بہ پے

منزلِ موہُوم کی جانِب رواں؛ -

آدمی، ماحول کا صید و غلام،

محوِ تخریبِ خودی –

آدمیت کی زوال آمادگی،

گل میں کانٹے کی چُبھن،

بستیاں ، ویرانیاں

وحشتیں، آوارگی،

باد و باراں،

قحط کا رقصِ فنا،

شوخ آنکھوں کی نمی،

ساغرِ محرومِ مے،

موجِ زمزم، آبِ گنگا، اور پھر بھی تشنگی،

مسجدوں میں داغِ سجدہ کی جلن،

مندروں میں نفرتوں کا شور و غل،

امن سے بیزاریاں،

جنگ کی تیّاریاں —

یہ مناظر، یہ مظاہر دیکھ کر

کرشن چندر رو دیا،

روتے روتے بن گیا

ایک افسانہ نگار —

بمبئی — ۱۹٦۸

میری تصویر

میری تصویر –

مری نظم کا عنوانِ عجیب،

آپ یہ نظم سُنیں گے تو پریشاں ہوں گے

کیونکہ یہ نظم تو ہے،

نظم کا موضوع بھی ہے،

لیکن اِس نظم کے فنکار کی –

یعنی میری –

دستِ نقاّش نے کھینچی ہی نہیں

کوئی تصویر ابھی، -

میں نہیں ہوں گا جب اِس دُنیا میں

میری اِس نظم کو پڑھ کر احباب

کسی فردوسِ تخّیل میں پہُنچ جائیں گے

اور صد رنگ تصوّر کی قلمکاری سے

اپنے اِس صفۂ دل پر، کوئی

میری تصویر بنا ہی لیں گے

میری تصویر

مِری نظم کے ہر لفظ میں ہے

بمبئی – ۱۹٦۷

خوش فہمیِ شب

شب کے خلوتکدۂ ظلمت میں

آج بھی ٹوُٹتا ہے آئینۂ کربِ سکوں،

آج بھی کرتے ہیں سرگوشیاں چُپ سنّاٹے،

سالہاسال سے جلتے ہوئے سُورج کی یہ آگ —

حسّد و رشک کی آگ،

آگ جو زیست کے ہنگاموں کو دیتی ہے ہوا،

کبھی بنتی ہے چِتا —

جلتے جلتے یونہی ہو جاے گی اِک دِن ٹھنڈی —

اور رہ جائے گا پھر

وہی سنّاٹا،

وہی سلسلۂ ظلمتِ شب —

ہائے، خوش فہمیِ شب !

نئی دہلی — ۱۹٦۸

اُردو کا المیہ

کسے یہ خبر تھی، ترے نام پر قتل و غارت کا بازار بھی گرم ہوگا

تری آستیں سے پُکارے گا خون آدمیت کا، انسانیت کا

کسے یہ خبر تھی - ؟

وہ دامن تِرا جس کے سائے میں سیکھا محبّت سے ہندو و مسلم نے رہنا

محبّت سے اونچا نہیں کوئی مذہب

محبّت ہی دُنیا، محبّت ہی عقبیٰ

محبّت سے نفرت ہے توہینِ ہستی

محبّت خدا ہے

وہ دامن جہاں دو دھڑکتے دلوں نے اماں پائی تھی کل،

وہی آج لتھڑا ہوا ہے لہو میں - !

تِرے گیسوؤں کی مہک جو گلوں کو کھلاتی تھی بن کر نوا بلبلوں کی

خلاؤں کی لاانتہا وسعتوں میں

کہاں کھو گئی ہے ؟

(ہندو مسلم فسادات رانچی)

بمبئی ــ ۱۹۶۷

گاندھی نے کہا تھا

(۱)

میں ہندوُ ہوں

تم ہو مُسلماں

میں گجراتی

تم مدراسی

یہ ساری باتیں بے معانی

خوش فہمی، کوتہ نظری کی

آؤ، بھُولادیں اِن باتوں کو

آؤ، مِٹادیں

"میں" اور "میرا" کا احساس،

اُبھریں تومِل کر اُبھریں ہم

ڈوُبیں تو مِل کر ڈوُبیں ہم

(۲)

کسی کو تم نہ ستاؤ، کسی کا دل نہ دکھاؤ

کہ اس سے بڑھ کے جہاں میں کوئی گناہ نہیں

(۳)

غلطی کرنا

انساں کی فطرت میں داخل،

لیکن سچ ہے

غلطی کا اقبال اور اُس سے توبہ

متقاضی ہے ہمّتِ مردانہ کی

(٤)

اک اچھے گھر سے بہتر

درس گاہ زیست کیا ہوگی ؟

نہیں بڑھ کر کوئی استاد

ایسے باپ اور ماں سے

جو لے کر شمعِ ایماں

راستے پر پاکبازی کے

رواں رہتے ہیں ہردم –

(٥)

ہمّت،

استقبال،

بے خوفی،

ایثار و قربانی،

یہی پہچان سچے رہنما کی ہے

(٦)

ایک ہے روح سب مذاہب کی

مختلف لیکن اُس کے قالب ہیں

بمبئی – ١٩٦٩

وقت وقت کی بات

میں، ایک صدیوں پُرانے
کہن سال درخت کے نیچے
گہرے پانی میں جال پھیلائے
مچھلیاں پکڑ رہا تھا –

اور – اُس صدیوں پُرانے
کہن سال درخت کی ٹُنڈمُنڈ ٹہنی پر
کرشن کنہیا
گوپیوں کے رنگ برنگ وستر لئے
بانسری کی اُداس تانوں سے
پانی کی خاموش سطح پر
ایک نئے یُگ کا
خواب بُن رہا تھا –

بمبئی – ۱۹۶۹

بدن

لہلہاتا بدن، جگمگاتا بدن

حُسن کے ساز پر گیت گاتا بدن

مثلِ ابرِ بہاراں چمن در چمن

مستیوں کے خزانے لُٹاتا بدن

قلبِ گیتی میں ہلچل مچاتا ہوا

رسمساتا، سِمٹتا، لجاتا بدن

ٹھنڈی آنچوں میں دِن کا تصوّر لئے

ظلمتِ شب میں شمعیں جلاتا بدن

چاند تاروں سے دامن بچاتا بدن

آئینہ زندگی کو دکھاتا بدن

بمبئی — ۱۹٦۹

غالب - ایک صدی

موت کا تو ہے معین ایک دن

نیند پھر کیوں رات بھر آتی نہیں

کہتے کہتے تُو بھی آخر سو گیا

تلخیِ غم آج بھی جاتی نہیں

تُو نہیں لیکن ترے اشعار میں

گرمیِ بزمِ سخن ہے آج بھی

تُونے کھینچی تھی جو تصویرِ حیات

وہ کمالِ حُسنِ فن ہے آج بھی

کل بھی تھا اہلِ سخن کو تجھ پہ ناز

تیری عظمت کا ہے چرچا آج بھی

موت اس کو آ نہیں سکتی کبھی

تُونے اُردو کو وہ بخشی زندگی

شعرِ اردو کو دکھائی تھی جو راہ

آج بھی وہ ہے اُسی پر گامزن

اک صدی کے بعد بھی تیری صدا

گونجتی ہے انجمن در انجمن

طرزِ بیدل، میر کا سوز و گداز

طنز و شوخی، تیرا لہجہ بن گیا

یاس میں اُمید کی بھر دی کرن

درد بڑھ کر ہو گیا اپنی دوا

رگ سے پتھر کی نِچوڑا تُونے خون

سایۂ مسجد میں پی تُونے شراب

زندگی پر سحر پھُونکا اِس طرح

اُٹھ گئے آنکھوں سے سب پردے، حِجاب

میکشی سے بیخودی مقصود تھی

تھی نرالی رندی و مستی تِری

"عذرِ مستی" چھیڑ نے کا تھا سبب

تھی بلندی آشنا پستی تِری

تیرا مذہب، تیرا ایماں، تیرا دین

تھا فقط انسان بننے کی سبیل

واقعی تجھ کو سمجھتے ہم ولی

تُو اگر دیتا نہ رندی کی دلیل

دوستو میں غمگساروں کی تلاش
تیرے دل میں عمر بھر باقی رہی
کیوں نہ ہم قائل تِری مستی کے ہوں
واہ اے غالب، تِری ساقی گری

بمبئی — ۱۹٦۹

کل، آج اور کل

رشی آئین سٹائین نے کہا تھا

کہ جب گاندھی نہیں ہوگا

تو لوگ حیرت کریں گے

کہ کسی زمانے میں

گوشت پوست کا ایک ایسا پُتلا

دھرتی پر گامزن تھا –

اور آج

جب مہاتما گاندھی

امن اور شانتی کا دیوتا

آزادی کا پیغمبر

جس کے انکسار نے انسان کا سر اُونچا کیا

جس کی للکار نے انسانیت کو جگایا

جس نے محبّت اور اخوت کا پیغام دیا

جس کی اہنسا نے جا بروں کی گردنیں جھُکا دیں

جس نے نفرت کی جوالا میں

اپنی جان کی آحُتی دی

تا کہ زندگی کا تسلسل ٹوُٹنے نہ پائے –

وہی مہان آ تما

ہمارے درمیاں نہیں رہی

تو ہم اُس کے دھرتی پر چلنے پر حیرت نہیں کرتے

بلکہ زندگی اور موت،

نفرت اور محبّت،

آزادی اور غلامی،

افلاس اور امارت

کے دو راہے پر کھڑے، اس سوچ میں غرق ہیں

کہ گہری پستیوں سے مانوس انسان

کس طرح آسمانی بلندیوں کو چھو سکتا ہے

کل، ہمارے حسین خوابوں کی سُنہری منزل

کتنی ہی دوُر سہی،

کتنی ہی دُشوار سہی،

نزدیک بھی ہے

آسان بھی ہے

یقیناً ہم اُس کو پا لیں گے

اگر اپنے پوجیہ پِتا

مہاتما گاندھی کے دکھائے ہوئے راستے پر پا مردی سے چلتے رہے

زندگی کے اُن اصولوں کو،

جو اُس مہان آ تما نے

(جو اب ہم میں نہیں)،

ہمیں سِکھائے،

اگر ہم نے اپنائے رکھا

تو کوئی وجہ نہیں

دُنیا کی کوئی طاقت نہیں

جو ہماری سچّائی کو جُھوٹلا سکے

ہمیں منزل تک پہنچنے نہ دے – نئی دہلی – ۱۹٦۹

دو جسم اور ایک جان

رات اور دن

محبّت کی کبھی نہ ٹوُٹنے والی ڈور میں

ایسے بندھے

کہ پھر کروڑوں صدیاں گزر جانے کے بعد

آج تک

ایک دوُسرے کے آگے پیچھے

دوڑتے رہتے ہیں

گویا یہ ایک کُل کے دو اہم جزو ہیں

ہزاروں چاندوں،

ہزاروں سورجوں،

نے کوشش کی

کہ رات کو دن سے

اور دن کو رات سے

الگ کر دیں، جدا کر دیں

مگر سب کوششیں، تمام تدبیریں بیکار گئیں –

اور دن اور رات

بدستور

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

جسم کو جسم سے ملائے

وقت کی لمبی ڈگر پر

انجانی منزل کی طرف

آج بھی

رواں، دواں ہیں – نئی دہلی – ۱۹۶۹

ہِپّی

سُنا ہے کہ اگلے زمانے میں کھُلتے تھے انساں پہ اسرار جب زندگی کے

تو وہ شہر اور بستیوں سے نکل کر چلا جاتا تھا پھر

کہیں جنگلوں میں، گپھاؤں میں، کرتا خود اپنا تجسس

لئے ایک انجانی منزل کی دل میں تمنّا –

تعلق کی دیوارِ بوسیدہ ڈھا کر،

سر اپنا مُنڈا کر

رماتا تھا دھُونی –

اُسے لوگ کہتے تھے سنیاسی، سادھُو –

مگر آج کچھ اور ہی کفیت ہے

حوادش سے، افکار سے، زندگی سے بشر بھاگتا ہے

انہیں اجنبی جانتا ہے

تسلّی سہاروں کو پہچانتا ہے

نہ حال اور فردا، نہ ماضی کا غم ہے

نہ اپنی خبر ہے، نہ اپنوں سے مطلب، نہ غیروں کی پروا

کبھی بیٹھ کر ہوٹلوں میں یہ پیتا ہے قہوہ

دھُویں میں کبھی کھو کے یہ ناچتا ہے

کبھی گھُومتا ہے یہ گلیوں میں آوارہ، حیراں

بڑھائے ہوئے بال رُخسار و سر کے

لباسِ برہنہ بدن پر سجائے

بنائے ہوئے بھیس سنیاسیوں کا

بُلاتے ہیں لوگ اب اُسے کہہ کے ہِپّی

نئی دہلی – ۱۹۷۱

نیا تارا --- بنگلادیش

جنگ کی غارتگری سے وقت کا دل ہِل گیا

خونِ مظلومی سے دھرتی نے بُجھائی اپنی پیاس

ہو گئیں ویراں بھری گودیں، اُٹھا شورِ نشوُر

سنسناتی گولیوں میں بِکھرا مانگوں کا سندوُر

جبر حد سے بڑھ گیا تو صبر کا یارانہ تھا

ناتوانی کا غلط احساس بھی جاتا رہا

سر فگندہ، سرکشی پر آخر آمادہ ہوئے

نوُر نے ظلمت کو للکارا بہ آوازِ بلند

ظلم کانپا، جذبۂ شوقِ شہادت دیکھ کر

صحنِ گلشن سے ہوا رُخصت خزاں کا کارواں

کربناکی سے گزر کر مل گیا دل کو سروُر

غالب آیا بربریت پر غمِ انسانیت

اک نئے تارے کا گردوں پر ہوا نوُر و ظہور

تیرہ سامانیِ شب کو نوُر کا پیکر ملا

خانما برباد انساں کو دوبارہ گھر ملا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۲

بس ایک بار

خوشی مناؤں کہ چھبیس جنوری کا یہ دن
بس ایک بار ہی آتا ہے سال بھر کے بعد

بس اک بار ہی خوشیاں منائی جاتی ہیں
بس ایک بار ہی رنگِ چمن نکھرتا ہے
بس ایک بار ہی گل کی ہنسی بکھرتی ہے
بس ایک بار ہی کانٹوں کی شمعیں جلتی ہیں
بس ایک بار دلوں کا غُبار دُھلتا ہے
عوامِ ہند کا سر ایک بار اُٹھتا ہے
پھر اُس کے بعد وہی زندگی کا رونا ہے
وہی گلے، وہی آنسوُ، وہی کمی، وہی درد
وہی ستم، وہی نفرت، وہی اُمید کی لاش
وہی اندھیرے، دبوچے ہوئے اُجالوں کو،
تمام سال وہی ایڑیاں رگڑنی ہیں
تمام عمر یہی غم ہماری قسمت ہے
کہ ہم کو دِن سے نہیں، رات ہی سے نسبت ہے
اِسی لئے تو یہ اِک روز بھی غنیمت ہے

خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری کا یہ دن
بس ایک بار ہی آتا ہے سال بھر کے بعد -

نئی دہلی — ۱۹۷۲

آوازوں کا شہر

سازٹوٹے ہوئے، مطرب خاموش،

گیت مقتول تو نغمے بسمل،

ٹھمریاں بیٹھی ہیں سر لٹکائے،

پا ئلیں بے حس و حرکت، مظلوم،

تھاپ بن طبلہ ، وجودِ بےسود،

قلقلِ مینا کہیں کھوئی ہوئی،

گم فضاؤں میں کھنک ساغر کی،

نہیں کلیوں کے چٹکنے کی صدا،

بلبلیں مہر بلب، محوِ سکوت،

چلتی ہے ڈرتی، دبے پاؤں نسیم،

کسی مسجد سے نہیں اُٹھتی اذاں کی آواز،

شورِ ناقوس بھی مندر میں نہیں،

سیٹیاں، ہارن، بگل چُپ سادھے،

موٹریں چلنے کی آواز نہیں،

حادثے، فتنے سر افراز نہیں،

اور کیا ہے یہ اگر راز نہیں ----

کوئی بولے تو اُس سے پوچھوں
کیا یہی شہر ہے آوازوں کا ؟

مجھے تنہائی کہاں لے آئی،
ایک سنّاٹا ہے طاری ہر سُو،
میری آواز ڈراتی ہے مجھے،
کھڑکیاں بند پڑی ہیں کب سے
اپنا بیگانہ یہاں کوئی نہیں
کیوں نہ اب خود ہی پُکاروں خود کو
کوئی آواز تو کانوں میں پڑے —
یہ میرا شہر ہے آوازوں کا -

نئی دہلی — ۱۹۷۲

شادی

(اپنے لڑکے رویندر کمار سونی کی خانہ آبادی پر)

اپنے آنگن میں جو لگایا تھا

ایک پودا گلاب کا میں نے

بیس اور نو برس میں وہ بڑھ کر

میرے قد کر قریب آ پہنچا،

روشنی گھر کے گوشے گوشے میں

اُس کے حُسن و جمال کی پھیلی

لے اُڑی نکہت اُس کی بادِ سحر

اور معتر ہوا تمام چمن

رکھ دیا زندگی کا نام چمن –

دوُر سے دیکھ کر اُسے خنداں

کِھل اُٹھی ایک نا شگفتہ کلی –

دو دلوں کی خموش دھڑکن نے

رازِ مستی کہا اِشاروں میں

چھِڑ گیا ساز لے کر انگڑائی

کھول دی اپنی آنکھ نغموں نے

سبز پتّوں نے تالیاں پیٹیں

شاخیں محدِ ہوا میں جُھول گئیں

غم و آلامِ دہر بُھول گئیں –

شادمانی، نشاط، کیف و طرب

بجتی شہنایوں کا شور و غل

نرتکی کائنات کی رقصاں

زندگی جیسے اِک حسین غزل

بن سنور کر بنی ہوئی دُلہن

اِک نئے موڑ پر کھڑی ہے حیات

دے رہی ہے نئی سحر کا پیام

روشنی ہر طرف ہویدا ہے

سرِ انسانیت پہ سہرا ہے –

نئی دہلی – ۱۹۷۳

میری ساٹھویں سالگرہ

جگمگ، جگمگ ساٹھ ستارے،
توڑ کے گردوں کی ٹہنی سے،
میں نے سجائے
آنگن کی دیوار میں اپنے

طاق کی زینت ساٹھ دیئے یہ
دُور سے لگتے ہیں کتنے سندر
ان کے روشن دلوں کی دھڑکن
کتنی ہی یادوں کی امیں ہے
ان کے نقوشِ پا صحرا میں
لمحوں کے بڑھتے طوفاں کو
راہ دکھاتے ہیں منزل کی،

ساری رات ان سے کھیلا ہوں
دیکھو ان کو نہ چھونا ہرگز
یہ وہ نرم و نازک گل ہیں
لمس سے آوارہ نظروں کے
جو اکثر مرجھا جاتے ہیں –

سوچ رہا ہوں
کیوں نہ میں ان کو
اپنی تجوری میں اب رکھ کر
تالہ لگا دوں –
اس پونجی ہی کے تو سہارے
مجھ کو ابھی زندہ رہنا ہے -

نئی دہلی – ۱۹۷۳

ہم ایک ہیں

یہ ہے زمانے کا چلن ہر فرد فردِ انجمن
پھُولوں سے تزئینِ چمن منّت کشِ انجم، گگن
ذرّوں میں آندھی کی پھبن
قطروں کے دل میں موجزن
طوفان ہیں
ہم ایک ہیں

مذہب کی ہے یہ روشنی معراج ہے تہذیب کی
چینی، فرنگی، بھارتی جاپانی، رُوسی، کابُلی
ہندُو، مُسلماں، پارسی
عیسائی، جینی، سِکھ، سبھی
انسان ہیں
ہم ایک ہیں

حق بات جو دل نے کہی (میٹھی نہیں، کڑوی سہی)

آ کر زباں پر ہی رہی ٹوُٹا طلسمِ گمرہی

رہنا تو ہے مِل جُل کے ہی

دُنیا میں جینے کے یہی

سامان ہیں

ہم ایک ہیں

بتہائے نفرت توڑ دیں اُلفت سے ناتا جوڑ لیں

انسانیت کی راہ میں کھائیں ہزاروں ٹھوکریں

ہر دم قدم آگے بڑھیں

پھر دیکھئے، سب مُشکلیں

آسان ہیں

ہم ایک ہیں

نئی دہلی — ۱۹۷۳

نظم در غزل

میں نظموں کا شاعر

غزلیں کہہ کر لایا ہوں

جانتا ہوں، نظمیں تم کو اچھی لگتی ہیں

نظموں میں دل کے اندر کی ساری باتیں کھُل کر باہر آ جاتی ہیں

معانی، لفظوں کے پیراہن پھاڑ کے ننگے ہو جاتے ہیں

قاری، سامح کی ذہنی دیواریں ٹوُٹ کر گِر جاتی ہیں

نظموں کی قندیلیں روشن کرتی ہیں بزمِ انساں کو

شب کی ظلمت چھٹ جاتی ہے

قدرِ جہالت گھٹ جاتی ہے

قافلۂ ہستی کو مِل جاتا ہے نشاں اپنی منزل کا

لیکن آج سِمٹ آئی ہے کیفیت میرے دل کی

سازِ غزل سے نکلے نغموں کے اُس سوزِ پیہم میں

جس کی آنچوں سے سُورج گرمی لیتا ہے

چاند میں تابانی آتی ہے

تارے گردوں کی پہنائی میں جگمگ جگمگ کرتے ہیں

برف پگھلنے لگتی

پھُولوں کے رُخساردمک اُٹھتے ہیں کنارِ نکہت میں

غزلیں، نظموں کے پیکر میں ڈھل جاتی ہیں –

آج مری غزلیں ہی سُن لو

نئی، پُرانی آوازوں سے مستقبل کے خواب ہی بُن لو

پھُول کے بدلے خار ہی چُن لو –

نظم و غزل کی مفرُوضہ حدّ فاصل تو مِٹ بھی چکی ہے

غزلوں کے شعروں میں تصویریں نظموں کی اُبھر آئی ہیں

غزلیں سُن لو

گمکردہ جنّت چاہو تو پھر اُس کو پا لو، لیکن

آج مِری غزلیں ہی سُن لو

کل کیا ہوگا، کس کو خبر ہے ؟

کل کی کل دیکھی جائے گی

میں نظموں کا شاعر

غزلیں کہہ کر لایا ہوں –

نئی دہلی – ١٩٧٤

گرانی

رات اندھیری، دِن طوُلانی حرص و ہوس کی یہ ارزانی

چلتی، پھرتی بے ایمانی خون ہوا رگ رگ میں پانی

بِکتی ہے بے دام جوانی

ہائے گرانی ، ہائے گرانی

گندم، چاول، دال، نمک، گھی روز افزوں ہے قیمت سب کی

بجتی ہے اِک ہاتھ سے تالی کلجُگ کی یہ ریت بھی دیکھی

گیانی کہلائیں اگیانی

ہائے گرانی ، ہائے گرانی

بازاروں میں لوُٹ مچی ہے پوُچھ نہ جو حالت دل کی ہے

سر پر آفت منڈلاتی ہے قدموں سے بیڑی لِپٹی ہے

محرُومی، حسرت سامانی

ہائے گرانی ، ہائے گرانی

کون سُنے گا من کے دُکھڑے بھُوکے پیٹ اور سینے سُکڑے

گھُٹتے دم اور اُترے مُکھڑے جیون درپن ٹکڑے ٹکڑے

ہر شے دھوکا، ہر شے فانی

ہائے گرانی ، ہائے گرانی

پانی منوں آکاش سے برسے پیاسا اِک اِک بوُند کو ترسے

بوجھ یہ کب اُترے گا سر سے دھرتی کا دل کانپے ڈر سے

ہونے کو ہے ختم کہانی

ہائے گرانی ، ہائے گرانی

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

یکجہتی

لاکھوں پتّے، ایک درخت　　　صدہا قطرے، اِک دریا

رنگ ہزاروں، اک تصویر　　　اِک سُورج، اَن گِنت نجُوم

اربوں انساں، اِک دُنیا

پھُول کِھلیں تو باغ سجے　　　موجیں مِل کر بنیں طوفاں

سائے اِکٹھے ہوں تو رات　　　کرنیں جمع ہوئیں تو دِن

تانوں کا سنگم سنگیت

یکجہتی، قوت کی اساس　　　یکجہتی، اُلفت کی دین

یکجہتی، پیغامِ امن　　　یکجہتی، انسانیت

یکجہتی، تدبیرِ حیات

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

گاندھی یُگ

دوُر دوُر دیشوں سے اُڑتے،

بھارت کے مرکز، دِلّی، میں

بڑے بڑے، جانے پہچانے پنچھی آئیں،

اپنی اپنی چونچوں میں لے کر پھُولوں کی حسیں مالائیں

جمُنا، راج گھاٹ پر جائیں

صُلح و رضا کے دیوتا کو دیں نذرِ عقیدت

گاندھی —

جس نے ہندُستاں میں آزادی کی رُوح جگائی

انساں، انساں میں جھُوٹی تفریق مٹائی

امن و اماں کی راہ دکھائی

پریم کی جوت جلا کے دلوں میں ہِنسا سے نفرت پیدا کی

گیتا کی حکمت کو ڈھالا سانچے میں کردار و عمل کے

گوتم کا پیغام سُنایا

رام، رحیم کا بھید مِٹایا

اپنے ہاتھوں سے لہرایا

انسانیت کا پرچم ---

اُس گاندھی کو اِک پاگل نے گولی ماری

لہُو لہُان تھی دھرتی ساری

دل نے جیتی بازی ہاری ---

ختم ہوا گاندھی یُگ، لیکن

اُس کی دھیمی آنچیں

آج بھی ہیں محسوس رگِ جاں

کل بھی دلوں کو گرمائیں گی !

نئی دہلی — ۱۹۷۵

میرا ہمدم میرا دوست

گوپال متال

رات، یعنی دِن کی ضد

تہہ بہ تہہ تاریکیوں کا بار کندھوں پر اُٹھائے

بے ہسی کے گیت گاتی، ناچتی،

بحر و بر، کون و مکاں پر چھا گئی –

ہر گلی، کوچے میں ہیبتناک اُداسی کا سماں

خیمہ زن خاموشیوں کے کارواں،

آندھیوں کی زد میں عالم آ گیا

کِھلنے پا یا تھا نہ گل، مرجھا گیا

دفعتاً دل کے نہاں خانے میں گُونجی ایک دُور افتادہ چینخ،

اِک دھماکا، جیسے ایٹم بم خلاؤں میں پھٹے، پھٹتا ہی جائے،

مُردہ ارمانوں کو ازنِ زندگیِ نو مِلا

یاس پر اُمید کا جادُو چلا

روشنی کی جُستجوُ تازہ ہوئی -

چلتے چلتے مِل گیا اِک ہمسفر

مشعلِ عرفاں لئے

محرمِ اسرارِ حُسنِ کائنات

رہگزر کے پیچ و خم سے آشنا

منزل آگاہِ حیات

خوف، ڈر، اندیشے کی آرائشوں سے پاک و صاف

حق پرست و راست گو

قدردانِ علم، ادب کا پاسباں

دوستوں کا دوست لیکن دشمنوں کے حق میں برقِ بے اماں

نکتہ داں، صاحب نظر

حامیِ آزادیِ فکر و خیال

آدمی اور آدمیت کا پرستارِ قدیم

اِک عجب انداز سے دی اُس نے "صحرا میں اذاں"

وہ ازاں دراصل اِک "تحریک" تھی

ذرّہ ذرّہ، پتّہ پتّہ جاگ اُٹھا

نُور کے فوّارے پھُوٹے ہر طرف

طالبانِ روشنی کو روشنی مِل ہی گئی

نئی دہلی ـــ ۱۹۷۵

گیان مارگ کی نظمیں

(کرشن موہن کا مجمۂ کلام)

شعر کے بازاروں، کوچوں میں شیشوں کے انبار لگے ہیں

بے پیراہن، ننگے بدن کا عکسِ لرزاں

ہر شیشے سے جھانک رہا ہے

حُسن، جوانی، پیار، مِلن کی مستی،

لذّت کی پرچھائیں،

اہلِ نظر کو دعوتِ نظّارہ دیتی ہے

اہلِ خرد کو سوچ پر آمادہ کرتی ہے

اہلِ جنوں کی آبلہ پائی پر نشتر رکھتی ہے

اور کہتی ہے :

مجھ سے کیسی شرم، حیا کیا،

میری جانِب غور سے دیکھو

اور پہچانو،

میں تو تمہارا عکس، تمھاری پرچھائیں ہوں

نئی دہلی — ۱۹۷۵

فصلِ باراں

ٹہنی ٹہنی، جُگنوُ جُگنوُ طرفہ جشنِ چراغاں ہے

کیاری کیاری شادابی کا عالم، فصلِ بہاراں ہے

ہریالی تا حدّ نظر ہے، رنگ و نوا کے طوفاں میں

دھرتی ڈوُبی، گردوں ڈوُبا، غرقابی کا ساماں ہے

آنگن آنگن مہکا مہکا، دیوار و در رقص کناں

مدھ برساتی بدلی بن کر شبگوں زلف پریشاں ہے

جنگل جنگل، منگل منگل، ہر پگڈنڈی کا ہکشاں

گاتا آئے، گاتا جائے، بنجارا ہر انساں ہے

پربت پربت، وادی وادی، جوشِ نمو کا آئینہ

ہاں، یہ وہی موسم ہے جس کا اہلِ دل پر احساں ہے

بلبل کے نغموں کی تپش میں میر کی غزلوں کی گرمی

حفظ اک اک نورس غنچے کو غالب کا کل دیواں ہے

کانٹا کانٹا، غنچہ غنچہ، دونوں سے ترکیبِ چمن

یکجہتی ہی دین ضیا کا، یکجہتی ہی ایماں ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

دو موڑ

اِک ایسا موڑ آ جاتا ہے

جیون کی ٹیڈی میڈی، اندھی، انجانی راہوں میں

جب دو سِمتوں سے آنے والے دو راہی مِل جاتے ہیں

اور مِلا کر پاؤں سے پاؤں

ایک ہی رستے پر چلتے

آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں

خوشیوں کے پرچم لہراتے

شیش محل سپنوں کے بناتے

اِک ایسا بھی موڑ آتا ہے

جیون کی ٹیڈی میڈی، اندھی، انجانی راہوں میں

جب دو راہی چلتے چلتے الگ الگ رستوں کی جانِب مُڑ جاتے ہیں

ٹوُٹ کے شیش محل سپنوں کے گِر جاتے ہیں

خوشیاں غم میں کھو جاتی ہیں

یاس کی دیواریں اُٹھتی ہیں

دل، احساسِ تنہائی کی برف تلے دب سا جاتا ہے

جیون سے ڈرنے لگتا ہے

مِل کر بِچھڑنا

یہ ہے جگ کی ریت پُرانی

لیکن زخمی دل نے کبھی یہ بات نہ مانی

آنسوُ بن کے لہوُ بہتا ہے

پھُول خزاں کی آندھی سے مُرجھا جاتا ہے

خوُن کی لالی،

پھُول کی زردی،

یہی دورنگی کی یکرنگی رکھتی ہے شاداب چمن کو

کوئی موڑ ہو، اپنی دھُن میں بہتا ہی رہتا ہے وقت کا دھارا

کیسی ہی آندھی ہو، جیون جوت بُجھی ہے اور نہ بُجھے گی

چلتا ہی رہتا ہے مسافر –

نئی دہلی – ۱۹۷۵

دَورِ نو

آنکھ کھُلی تو رات نہ تھی --- وہ بات نہ تھی

بطنِ مشرق سے دِن کا اِٹھلاتا سوُرج اُبھر رہا تھا

دھرتی کے روشن آنگن میں کنواری کِرنیں ناچ رہی تھیں

وقت کی لمحہ لمحہ بجتی پائل نغمے بانٹ رہی تھی

صدیوں کا رس گھول رہی تھی ----

بول رہی تھی :

ختم ہوا ظلمت کے جادوُگر کا تماشا

ٹوُٹ گیا وہ سلسلۂ تخریب و تباہی

جس سے خجل انسانیت تھی –

ہنگامِ بیداری آیا

سونے والو ! جاگ بھی جاؤ

دیکھو، ہر سوُ شادابی ہے

کھیتی کھیتی ہریالی ہے

پیاس بُجھی ہے

چہرہ چہرہ نِکھر گیا ہے

کلی کلی پر رنگِ تبسّم بِکھر گیا ہے

ہوتا ہے دَورِ تعمیر آغاز یہیں سے

انساں سر افراز یہیں سے

بڑھ کر استقبال کرو اس دَورِ نَو کا

پاؤں نہ پیچھے ہٹنے دو اس دَورِ نَو کا

یہ دَورِ نَو گہوارہ ہے امن و سکوں کا

بہبودیِ بشر کا حامل

اس نے ہی گرتوں کو سنبھالا

اس کی نظریں آزادی کی سچّی منزل

مدّت سے جو بند پڑے تھے دروازے، وہ اس نے کھولے

اور اِجازت دی جاں بخش ہواؤں کو اندر آنے کی

صدیوں کے سوئے آخر انگڑائی لے کر جاگ اُٹھے

آنکھ کھُلی تو رات نہ تھی --- وہ بات نہ تھی

نئی دہلی ـــ ۱۹۷۵

بسملِ غزل

(بسمل سعیدی)

کل شام ناگہاں سرِ راہ مل گئی مجھے
فتنے قدم قدم پہ جگاتی ہوئی غزل
پوچھا کہ آج پائے سفر کا ہے رُخ کِدھر
بولی نظر جُھکا کے، لجاتی ہوئی غزل:

کہتی ہوں دل کی بات جو پھیلی ہے شہر میں
پردہ ہی اُٹھ گیا ہے تو تجھ سے چھُپاؤں کیا
محبوبہ جس کی ہوں، میرا محبوب ہے وہی
سودا ہے کس دیار کا سر میں، بتاؤں کیا
گرمی ہے بزمِ شعر میں جس کی نواؤں سے
میرے خدنگِ ناز کا بسمل وہی تو ہے
سر گرداں کوُ بہ کوُ ہوں میں جس کی تلاش میں
دلبر مِرا وہی، مِری منزل وہی تو ہے

نئی دہلی ــ ۱۹۷۵

غیر معمولی

اندھیرے روشنی پر غالب آ جاتے تو کیا ہوتا

نہ کِھلنے پائے تھے جو پھُول، مُرجھاتے تو کیا ہوتا

تباہی کے ارادے دل میں تھے صیّاد و گلچیں کے

لگا کر آشیاں میں آگ بھڑکاتے تو کیا ہوتا

نہ جانے کیا گزرتی فصلِ گل میں جیب و دامن پر

جو دیوانوں کو زنجیریں نہ پہناتے تو کیا ہوتا

نشاں ملتا نہ کوسوں منزلِ خود اعتمادی کا

یہ ابن الوقت اپنی بات منواتے تو کیا ہوتا

جنہیں جیبیں کترنے کے سِوا آ تا نہیں کچھ بھی

وہی بازاروں، کوُچوں میں نظر آتے تو کیا ہوتا

نہ جب رہتا دِلوں میں ایک قطرہ خوُن کا باقی

لہوُ کے اشک ہم آنکھوں سے برساتے تو کیا ہوتا

یہ مانا منزلِ مقصود تھی صحرانوردی میں

نکل کر گھر سے در در ٹھوکریں کھاتے تو کیا ہوتا

کنارے آ لگی موجوں کا سینہ چیر کر کشتی

تلاطُم خیزیِ دریا سے گھبراتے تو کیا ہوتا

یہ معمارانِ ہستی جاگ اُٹھے نیند سے، ورنہ

کِھلونوں ہی سے شب بھرجی کو بہلاتے تو کیا ہوتا

پسِ پردہ ضیا، کب تک نُمائش حُسنِ تاباں کی

وہ برقِ جلوہ سے محفل کو گرماتے تو کیا ہوتا

جِسم

جِسم ایک پردہ ہے

رُوح اپنا ننگاپن جس سے ڈھانپ لیتی ہے

جِسم ہے لباس ایسا

آتما پہن کر جو پھر اُتار دیتی ہے

جِسم ایک دھوکا ہے

جس کے جال میں پھنس کر زندگی پنپتی ہے

جِسم پا کے اُٹھتے ہیں

کائنات میں نغمے،

نئی دہلی – ۱۹۰۷٦

ابنِ مریم

ابنِ مریم خدا کا بیٹا تھا

وہ بھری بزم میں بھی تنہا تھا

کل بھی ہم نے اُسے نہ پہچانا

آج بھی پوچھتے ہے وہ کیا تھا

اس نے مر کر دکھا دیا ہم کو

اپنا جینا نہ جیسے جینا تھا

روز کندھے پہ اِک صلیب لئے

اپنے دروازے سے گزرتا تھا

پیاس کانٹا بنی ضیا، تو کھُلا

وہ خلوُص و وفا کا دریا تھا

نئی دہلی — ۱۹۷۷

نئی رُت

ٹھُٹھر رہی ہے ہر کلی
شجر شجر ہے منجمد
ہوا خنک، فضا خنک
ہے رات سرد، سرد دِن
تپش نہیں ہے دھُوپ میں
حرارت آگ میں نہیں
یہ مُردہ جِسم برف برف
یہ ہونٹ سرد، گال زرد
دِیا دِیا ، بُجھا بُجھا
وہ گرمجوشیاں نہیں
وہ بادہ نوشیاں نہیں
مِرے خدا ! مِرے خدا ! بتا، بتا
یہ زندگی کی رُت ہے کیا ؟ یہ رُت ہے کیا ؟

نئی دہلی – ۱۹۷۷

ایک لُٹیرا

کس سے کھیلوں، جی بہلاؤں
اُچھلوں، کوُدوں، ناچوں، گاؤں
ہنسوں، ہنساوں، روؤں، رُلاؤں
کیسے بگڑی بات بناؤں

ٹوُٹ گیا ہے دل کا کھلونا
دل کا کھلونا ٹوُٹ گیا

میں ہوں، رات ہے، تنہائی ہے
غم کی کالی گھٹا چھائی ہے
بیتے دنوں کی یاد آئی ہے
دل کی کلی مُسکائی ہے

چھُوٹ گیا ہے ساتھ یُگوں کا
ساتھ یُگوں کا چھُوٹ گے

یہ تو بتا، او جانے والے

میں برہن ہوں کس کے حوالے

دل میں زخم، زباں پر تالے

بھرنے کو ہیں صبر کے پیالے

پھُوٹ گیا ہے، ہائے نصیبا

ہائے نصیبا پھُوٹ گیا

سوُکھا گیا موسم ساون کا

مالا ٹوُٹی، بکھرا منکا

ہوش کسے ہے اب تن من کا

نیند آنکھوں کی، سُکھ جیون کا

لوُٹ گیا ہے ایک لٹیرا

ایک لٹیرا لوُٹ گیا

نئی دہلی ــ ۱۹۷۸

مقتول لمحے

اے میرے مقتوُل لمحو ! اب نہ یاد آؤ مجھے

یاد آ آکر نہ صبح شام تڑپاؤ مجھے

تم تو تھے ہمدرد میرے، تم تو تھے مونس مِرے

گھولتے ہو کس لئے اب جام میں تم بِس مِرے

ساتھ رہ کر ہر قدم پر یوں بِچھڑ جانا نہ تھا

اور جانا ہی اگر مقصوُد تھا، آنا نہ تھا

تم نے تو مجھ کو لگایا راستی کی راہ پر

کر دیا میں نے نِچھاور تم کو اپنی چاہ پر

میری آنکھوں پر پڑا تھا پردہ، کیا آتا نظر

کر لیا ہاتھوں سے اپنے خوُنِ دل، خوُنِ جگر

کیا سمجھ سکتا اشاروں کو تمہارے دل مِرا

آگے بڑھ کر کس طرح لیتی قدم منزل مِرا

بند آنکھیں کر کے میں سوتا رہا، کھویا رہا

بیج دھرتی میں جہاں بویا وہیں بویا رہا

میرے ہاتھوں میں دیا تم نے قلم بھی ، تیر بھی

دیکھتی ہی رہ گئی تقدیر بھی ، تدبیر بھی

تم نے سمجھا تھا مِرے دل کو گِلِ نَو زائدہ

تم نے چاہا تھا کہ میں تم سے اُٹھاؤں فایدہ

میری غفلت نے مگر معذور ہی رکھا مجھے

خود نمائی، خود پرستی نے دیا دھوکا مجھے

ہائے میری کم نصیبی، پا کے تم کو کھو دیا

میں وہ قاتل ہوں، جو تم کو قتل کر کے رو دیا

دعائے شادی

مبارک، مبارک، سُریش اور بندوُ کو شادی کی یہ نیک ساعت مبارک،

ہزاروں اُمیدوں، ہزاروں اُمنگوں کے سنگم پہ دو دل مِلے ہیں

خدا ان کو رکھے ہمیشہ سلامت

ہمیشہ سلامت رہیں یہ خدارا

یہی اِک دعا ہے جو ماں باپ کے لب پہ بے ساختہ آ گئی ہے

سُریش اور بندوُ !

پھلو اور پھوُلو

کرو نام اونچا خلوُص و وفا کا

رہو خوش

کرو اپنوں، بیگانوں کو خوش

خوشی، حاصلِ سعیِ تابندگی ہے

خوشی زندگی ہے، نئی زندگی ہے، یہی زندگی ہے –

(سُریش – ضیا کا لڑکا)

نئی دہلی – ۱۹۸۰

خدا کہاں ہے

نہ دیر میں ہے، نہ ہے حرم میں　　نہ لوح میں ہے، نہ ہے قلم میں
نہ زلفِ شبگوں کے پیچ و خم میں　　تو پھر خدارا، کوئی بتا دو
خدا کہاں ہے ؟

خلاؤں کی کروٹوں میں ڈھُونڈا　　ستاروں کے جھُرمٹوں میں ڈھُونڈا
چِتاؤں میں، مرگھٹوں میں ڈھُونڈا　　مِلا نہ پھر بھی کہیں وہ مجھ کو
خدا کہاں ہے ؟

بہارِ فصلِ شباب دیکھی　　تجلّیِ آفتاب دیکھی
ورق ورق ہر کتاب دیکھی　　کسی دلِ مضطرب سے پوچھو
خدا کہاں ہے؟

جسے خوشی کا پتا مِلے گا　　وہ غم میں ڈوُبا ہوا مِلے گا
دھڑکتے دل میں خدا مِلے گا　　یہ راز ہے زندگی کا ، سوچو
خدا کہاں ہے ؟

لکھنؤ ــ ۱۹۸۰

شادی کی شادی

پھر وہی دلکش صدا شہنایوں کی صحن میں
پھر وہی گلہائے شادی کی ہواؤں میں مہک

پھر فضاؤں میں وہی نغمے مبارکباد کے

پھر وہی ہر دل میں ارمانوں، تمنّاؤں کی بھیڑ

کیوں نہ ہو، در پر ضیا کے دیتی ہے دستک خوشی

کھول دو دروازہ، اب آنے بھی دو اندر اُسے

تاکہ دویندر کے سر پر سہرا باندھے جھُوم کر

اور دے مستی کی دعوت لب سُبو کے چُوم کر

ہاتھ میں ریکھا کے ریکھاؤں کی آنکھیں کھُل گئیں

پھُوٹ نکلی روشنی بام و در و دیوار سے

دو دلوں نے دھڑکنیں آپس میں مِل کر بانٹ لیں

وقت نے کچھ اس طرح باندھا گلوں کے ہار سے

عہد و پیماں کے سہارے، زندگی کی راہ پر

دو مسافر چل دیئے ہیں،ہاتھ ہاتھوں میں دیئے

توڑ کر ماضی سے رشتہ، سر خوشی میں حال کی

اِک نیا مستقبلِ رنگیں نگاہوں میں لئے

ذرّے ذرّے کی زباں پر ہے یہی اب تو دعا

مِل گئے ہیں آکے جو، مِل کر یونہی چلتے رہیں

ہر بلا سے یہ رہیں محفوظ اور پھُولے پھلیں

ان کے سر پہ رحمتِ حق کا رہے سایہ مدام

(دیوندر ضیا کا لڑکا)

نئی دہلی ــ ۱۹۸۰

قصّہ ایک بندر، دو بِلّیوں کا

کئی سال پہلے کی ہے یہ کہانی

پڑھی تھی جو اپنی نصابی کتابوں میں ہم نے

نقوش آج بھی اُس کے تازہ ہیں دل پر

اُسے بھُول کر بھی نہیں بھُولے اب تک

کہ بھُولا جو اُس کو وہ خود کو بھی بھُولا

یہ دو بِلّیوں، ایک بندر کا قصّہ

حقیقت میں روداد انسان کی ہے

اگر کوئی گہرائی میں جاکے دیکھے

تو اُٹھ جائیں اسرار کے سارے پردے

ہو آئینہ کردار انسانیت کا

سمٹ کر شبِ تار جا بیٹھے گوشے میں ہاتھوں سے منہ کو چھُپائے

بجاتی ہوئی نوُر کے شادیانے

شعائیں لُٹاتی

اُمیدیں اُگاتی

زمیں جگمگاتی

سواری سحر کی چلی آئے لے کر بہاریں نئی زندگی کی –

محبّت کو ٹھُکرا کے نفرت کی دیوار اُٹھا لیں

کریں جنگ آپس میں دو بِلّیاں جب

تو آتا ہے بندر کے ہاتھ ایک موقع

کہ دونوں کی تقسیم کی آڑ میں اپنی جھولی تو بھر لی

مگر کچھ نہ رہنے دے دونوں کے گھر میں

ہوں دونوں ہی محروم و مغموم و محزوں –

سیانے اسی واسطے کہہ گئے ہیں

کہ آپس کے جھگڑوں سے دامن بچانے میں ہی عافیت ہے

انھیں چاہئے، ایک ہو کر رہیں یہ

نہیں ایکتا سے زیادہ کوئی اور طاقت جہاں میں

یہی ایکتا زینہ ہے ارتقا کا

یہی ایکتا رنگ بھرتی ہے تصویر میں زندگی کی

اسی ایکتا سے ہے شاداب و سر سبز دھرتی

پروتی ہے یہ ایکتا محبّت کے رشتے میں سب کو

اگر ایکتا کا سبق بِلّیاں سیکھ لیتیں

نہ آپس میں لڑتیں

تو بندر کے دھوکے میں ہرگز نہ آتیں

نہ نقصان اُٹھاتیں

نہ خود کو گنواتیں —

نئی دہلی — ۱۹۸۰

رونمائِ برگِ زرد

(طالب چکوالی کے مجموعہ ہائے کلام)

اے ضیا، مژدہ کہ نخلِ شعر میں

بعد "برگِ سبز" آیا "برگِ زرد"

میں بھی طالب کی خوشی میں ہوں شریک

اُس کے دل میں بھی ہے میرے دل کا درد

ہمقدم، ہمراز، ہمدم، ہمسخن

ایک منزل کے ہیں دونوں رہ نورد

سبزی و زردی سے ہے رغبت اُسے

اور مجھے ذوق و شوقِ نُور و گرد

سب بلاؤں سے رکھیں محفوظ اُسے

یہ زمانے کی ہوائیں گرم و سرد

نئی دہلی — ۱۹۸۱

میل، ملاپ

قدم قدم سے ملا کر چلو تو بات بنے

خلوص و شوق کی باتیں کرو تو بات بنے

یہ دَورِ عشق ہے ، کیا اس میں ذکر نفرت کا

جو بات کہنے کی ہے وہ کہو تو بات بنے

تنازعات کی پستی میں کھوئے کھوئے کیوں

تنازعات سے اوپر اُٹھو تو بات بنے

یہ نسل و رنگ کی تفریق کس کو راس آئی

ہو ایک، ایک ہی ہو کر رہو تو بات بنے

ہزاروں سال پیا گھاٹ گھاٹ کا پانی

اب ایک گھاٹ سے پانی بھرو تو بات بنے

اساس بیر پہ ہرگز نہیں ہے مذ ہب کی

پتے کی بات یہی ہے، سنو تو بات بنے

انیکتا تو ہے دراصل ایکتا کا لباس

دریدہ دامنِ ہستی سِئیو تو بات بنے

سبھی ہیں اپنے، پرایا نہیں کوئی ان میں

جو ہیں تمہارے، تم اُن کے بنو تو بات بنے

ملاپ، میل کی دولت ہے آدمی کے لئے

یہی تو دُنیا میں جنّت ہے آدمی کے لئے

نئی دہلی — ۱۹۸۱

خانہ آبادی

(اودیش ضیا کا لڑکا)

یہ شادی کی گھڑیاں، یہ خوشیوں کے لمحے

یہ مہکی فضائیں، یہ بہکے ترانے

یہ رس گھولتا شور شہنائیوں کا

یہ جھُرمٹ فسوں ساز رعنائیوں کا

یہ نغماتِ عشرت سے گونجی فضائیں

یہ کالی گھٹائیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں

یہ اودیش کے سر پہ پھولوں کا سہرا

یہ دل میں سریندر کے ہلچل سی پیدا

یہ سہرے کی خوشبو، یہ کنگن کا درپن

یہ لہراتی گلیاں، یہ مُسکاتے آنگن

یہ آنکھوں میں اک تازہ خوابوں کی دُنیا

یہ رنگین و دل کش سرابوں کی دُنیا

یہ دیپک محبّت کے ہر سمت روشن

یہ اخلاص پھیلاتا کرنوں کا دامن

یہ نوُرِ مسرّت جبینِ ضیا پر

یہ تہذیبِ انساں رہِ ارتقا پر

مبارک، مبارک، یہ لمحہ مبارک

مبارک، یہ سنگم دلوں کا مبارک

نئی دہلی — ۱۹۸۱

اُردو ایک زبان ہے لیکن
میری ماں بھی، بہن بھی یہ ہے
مانا بہن سُسرال گئی ہے
مجھ کو، ماں کو چھوڑ گئی ہے،
ماں تو میرے پاس ہے اب تک
کوئی بتاؤ
کس کے سہارے چھوڑ دوں ماں کو

جس نے مجھ کو دودھ پلایا
بڑا کیا، اور جینے کا انداز سکھایا
مجھ کو انسانوں سے ملایا،
اُس ماں کو میں چھوڑ دوں کیسے
مجھے بتاؤ،
کوئی تو اُن کو سمجھاؤ —

لکھنؤ — ۱۹۸۱

" اے ہم ....."

میں نے اپنے "میں" سے پوُچھا ایک دِن

کوئی باعس تیری خوُشنوُدی کا ہے

بولا، حیرت ہے، نہیں تجھ کو خبر

راز اسی میں تیری بہبوُدی کا ہے

میں خلاؤں کی ہوں لامحدوُدیت

اور تجھے احساس محدوُدی کا ہے

توُ تو ہے تارِ شکستہ کی صدا

ساز میرا لحنِ داؤدی کا ہے

میں ترا میں ہوں، نہ توُ ٹھُکرا مجھے

میں ہی سچّائی ہوں، کر سجدہ مجھے

لکھنؤ ــ ۱۹۸۱

سوچ کا سفر

مجھے کیا خبر

ابتدا کب ہوا تھا

سفر سوچ کا

مجھے کیا خبر

کیوں ہے جاری ابھی تک

سفر سوچ کا

اب بتا دو کوئی

ختم ہوگا کہاں، کس طرح اور کب

یہ سفر سوچ کا

جانتا ہوں مگر

ابتدا ہے ازل

انتہا ہے ابد

ہے ازل کی تلاشِ ابد کا صلا

یہ سفر سوچ کا

لکھنؤ ــ ۱۹۸۱

خاندانی منصوبہ بندی

ایک اکیلا

دو کا میلہ

اس کے آگے ہے سوتیلا

دو پر رُک جانا اچھا ہے

دو کا سُکھ پانا اچھا ہے

بھُوک سے غم کھانا اچھا ہے

موسم کا گانا اچھا ہے

لکھنؤ ــ ۱۹۸۱

سخنورانِ دیارِ مغرب

سخنورانِ دیارِ مغرب، تمہیں مبارک

یہ شعر و نغمہ کی شامِ رنگیں

جو مجھ سے عدنی غلامِ اُردو سے کر کے منسوب تم نے بخشی ہے میری اُردو زباں کو عزت

تمہاری دیدہ وری، تمہارے سلوک کا کیوں نہ معترف ہوں،

یہ شعر و نغمہ کی شامِ رنگیں

مِرے خلوص اور تمہاری انسانیت کا شفّاق آئینہ ہے

یہ آئینہ تو دھڑکتا دل ہے

جو لمسِ برگِ گُلِ شگفتہ سے بھی ہو جاتا ہے ریزہ ریزہ

اس آئنے کو بچائے رکھنا

یہ آئینہ ٹوُٹنے نہ پائے

کہ ٹوُٹ کر پھر نہ جُڑ سکےگا

یہ آئینہ مشرق و مغرب کی گنگا جمنی حکایتوں کا، روایتوں کا اک آئینہ ہے

ہے کہنہ تہذیب کی وراشت

لہو سے صدیوں کے آج بھی اس میں ہے حرارت

یہ آئینہ ہی تو آئینہ دارِ زندگی ہے

یہ آئینہ ٹوُٹنے نہ پائے

یہ آئینہ ٹوُٹ کر جُڑا ہے نہ جُڑ سکے گا

لندن ــ ۱۹۸۱

آنکھیں

دل نے کہی جو بات ہے تیری آنکھوں میں

پیار مِلن کی رات ہے تیری آنکھوں میں

گلشن گلشن تیرے بدن کی خوشبوئیں

نغموں کی برسات ہے تیری آنکھوں میں

تیری سانسوں میں گونجیں شہنائی کی

سپنوں کی بارات ہے تیری آنکھوں میں

سویا سویا دِن ہے تیری پلکوں پر

جاگی جاگی رات ہے تیری آنکھوں میں

دیکھنے والا، دیکھتا ہی رہ جاتا ہے

کچھ ایسی ہی بات ہے تیری آنکھوں میں

امرت سے لبریز تِرے ہونٹوں کے جام

کوشر کی سوغات ہے تیری آنکھوں میں

لندن ــ ۱۹۸۱

ترکِ وطن

میں نے سوچا تھا

مِرے ملک، مِرے شہر، مِرے کوچے، مِرے گھر میں، مِرے کمرے میں

دل کی تسکین کا سامان نہ مہیا ہوگا

ریزہ ریزہ ہی رہےگا جسدِ خاک آلود

تا ابد روح نہ پائے گی قرار

ذہن جو روزِ ازل سے ہے پراگندہ، پراگندہ رہےگا تا عمر

زندگی کرنے کا انداز نہ آئےگا مجھے

اور مر مر ہی کے جینا ہوگا –

میں نے دیکھا تھا

وہ دیواریں، لِکھی تھی جِن پر

عہدِ طفلی کی حکایت میں نے،

ایک افسانہ بنی بیٹھی تھیں

گھر کے دروازے، کھُلے رہتے تھے جو شام و سحر

آتی جاتی سی ہواؤں کے لئے،

بند، لب بستہ تھے، جیسے درِ زندانِ ستم،

وہ جو میرے تھے، جنہیں اپنا کہا کرتا تھا،

میرے ارمانوں، تمنّاؤں کے قاتل نکلے ----

دوست بن جائیں گے دشمن، مجھے معلوم نہ تھا

اُنگلیاں پھولوں سے کانٹوں کی چُبھن پائیں گی

مِرا ماحول مجھے راس نہ آئےگا کبھی

راہ کھو جائے گی، مِٹ جائیں گے منزل کے نشاں –

اے وطن، میرے وطن، اچھے وطن، پیارے وطن،

ترک کر کے تجھے غربت میں چلا آیا تھا

میں نے چاہا تھا

تری یاد کا ہر نقش مِٹا دوں دل سے

بھُول جاؤں کہ مجھے جان سے تُو پیارا تھا

تیری آغوش میں پل کر ہی ہوا تھا میں جواں

دوڑتا تھا مِری رگ رگ میں لہُو تیرا ہی

پھر بھی، اے میرے وطن،

دُور کے ڈھول سُہانے تھے بہت

دُور سے ذرّہ بھی لگتا تھا رقیبِ خورشید

پاس آکر جو اُٹھے پردے تو نظروں کا بھرم ٹُوٹ گیا

ساغرِ ضبط بھی ہاتھوں سے مِرے چھُوٹ گیا،

ہاں، مقدّر ہی مرا پھُوٹ گیا،

پیاس دل کی بڑھی، بڑھتی ہی گئی

خونِ دل پیتا رہا، پیتا رہا

دیکھنا تھا مجھے اِک روز یہ دِن بھی افسوس

اے وطن، میرے وطن، اچھے وطن، پیارے وطن،

ترک کر کے تجھے پچھتاتا ہوں

اپنے اس اجنبی ماحول سے گھبراتا ہوں

اب تِری یاد میں کھوئی ہوئی تسکیں کا پتہ پاتا ہوں

جانی پہچانی، یہ بھُولی ہوئی آواز کہاں سے آئی

روشنی پھیل گئی

چھٹ گئی تیرگیِ شامِ الم

سالہا سال سے جو بند دریچے تھے، کھُلے

ذہن بیدار ہوا

دل نے انگڑایاں لیں

خُلد کی چٹکیاں محسوسِ رگِ شوق ہوئیں –

ہاں، وطن، میرا وطن، میرا وطن کوئی نہیں

اور اگر میرا وطن ہے کوئی

تو وہ سب دُنیا ہے ، کُل دھرتی ہے

مجھے ٹُکڑوں میں نہ تقسیم کرو

میرے انسان کے قاتل نہ بنو

لندن – ۱۹۸۲

حلالِ عید

اے حلالِ عید، اے آئینۂ حُسنِ ازل

منتشر ہے تیرے نظّارے کا ہر پیر و جواں

ایک لمحے کے لئے تاریک بادل سے نکل

تابہ کے لیتا رہے گا یوں نظر کا امتحاں

تیرے مشتاقوں میں اک ہلچل مچی ہے صبح سے

اُن کی اُمیدیں ہیں نازک، توُ انھیں ٹھکرا نہ دے

آ، کہ اب باقی نہیں آنکھوں میں تابِ انتظار

روزہ داروں کو قیامت ہو رہی ہے ہر گھڑی

اک مہینے سے دلِ ارماں زدہ ہے بیقرار

اور توُ صبرآزما، مشکل ہے یہ کتنی بڑی

یہ تغافل کیشیاں اپنوں سے، ہیں زیبا تجھے ؟

ظلمتِ غفلت میں گم ہے جلوۂ راہِ بقا

پائے ہمّت ہے شکستہ، دوُر ہے منزل ابھی

وقت ہے، اپنی شعاعِ نوُر سے رستہ دکھا

ہوتی ہے مشکل ہی میں پہچان سچے دوست کی

ہند مدّت سے ہے تشنہ کامِ درسِ اتحاد

عید کے ہمراہ دے پیغامِ درسِ اتحاد

لاہور ــ ۱۹۳۲

ترانۂ شوق

(سانیٹ)

بلند و پست عالم پر مرے احکام جاری ہیں

گھٹائیں آسماں پر میکدہ بر دوش طاری ہیں

ہجومِ رنگ و بوُ سے دشت و صحرا غیرتِ گلشن

چراغِ کشتۂ ایّام، رشکِ شعلۂ ایمن

چمن پر زیرِ لب نغمے جواں غنچوں کے ساری ہیں

عنادل گوشۂ زنداں میں محوِ آہ و زاری ہیں

نشاط انگیز و دل افروز ہے کہسار کا دامن

گہر ہائے تمنّا کا بنا ہے ہر جگر معدن

سمجھ سکتی نہیں مجھ کو ابد تک عقلِ انسانی

بھٹکتے ہیں مِرے کوچے میں خاقانی و قآنی

کہ اسباب و نتائج سے مبّرا ہے مِری ہستی

ہے میرا راز ہی رازِ طلسمِ ہستیِ فانی

شرارِ بیخودی سے روشنی پاتی ہے یہ بستی

یہاں کے رہنے والوں کو نہیں فکر و غم پستی

امرتسر — ۱۹۳۲

آخری تہذیب

چاندنی پر منحصر ہے چاند کا سارا وقار

اور کرنوں سے ہے قائم مہرِ روشن کا وقار

ہر گلِ تازہ نظر افروف رنگ و بوُ سے ہے

امتیازِ کارِ آساں، سعیِ مشکل جوُ سے ہے

بزم کیا ہے، شمعِ نوُر افروزِ محفل گر نہ ہو

راہ کیا ہے، رہرووں کو شوقِ منزل گر نہ ہو

ہے ترشّح سے حقیقی نزہتِ ابرِ بہار

سُرخیوں سے ہے شبابِ نَو بہارِ لالہ زار

نشّہ جس مَے میں نہیں، اُس کو نہیں کہتے ہیں مَے

دل کو پہلو میں نہ تڑپا دے، تو ہے بیکار لےَ

گلستاں وہ کیا ہے، جس کا باغباں کوئی نہیں

وہ زمیں کیسی ہے، جس پر آسماں کوئی نہیں

دل کا ہر انداز ہے آئینہ سازِ زندگی

اور مضرابِ نفس، نغمہ نوازِ زندگی

دل حقیقت میں ہے اک بیتاب سازِ زندگی

اس کے ہر ذرّے میں پوشیدہ ہے رازِ زندگی

زندگی ہے موت، پہلو میں اگر دل بھی نہیں

بینیازِ شمعِ ہستی دل کی محفل بھی نہیں

شمع ہستی، شاہکارِ فطرتِ حُسن آفریں

جس کے آگے ہے خمیدہ آسمانوں کی جبیں

جس کی آنکھوں میں اجل کی روشنی تابندہ ہے

جس کا روحانی تصوّر تا ابد پائندہ ہے

گمرہی کے واسطے اک رہبرِ کامل ہے وہ

راہِ ہست و نیست کی اک آخری منزل ہے وہ

جس کے مندر میں عبادت کے سوا کچھ بھی نہیں

جس کے مذہب میں محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں

جو صداقت کے لئے مٹنے کو بھی تیّار ہے

جس کا اک پیغام ہے اور وہ فقط ایشار ہے

ازدواجِ باہمی فطرت کا وہ قانُون ہے

روحِ ہستی جس کے کیف و رنگ کی ممنُون ہے

قلب کی تسکیں بغیر اس کے کبھی ممکن نہیں

نسلِ انساں کا کوئی اس کے سوا ضامن نہیں

آدمی کو مقصدِ ہستی بتا دیتا ہے یہ

رفتہ رفتہ آدمِ کامل بنا دیتا ہے یہ

کھیلتی ہے گود میں اس کی نشاطِ جاوداں

پرورش پاتی ہیں اس کے سائے میں رعنائیاں

حامیِ اخلاقِ کبری، مانعِ تخریب ہے

ازدواج انساں کی اک آخری تہذیب ہے

لاہور ــ ۱۹۳٤

ایذا طلبی

(سانیٹ)

تجھ کو دیکھا تو تھی نظر کی خطا

آہ کھینچی تو بے قرار تھا دل

نامُراد اور سوگوار تھا دل

جو ہُوا، جوشِ بیخودی میں ہُوا

یاد آتی رہی تِری شوخی

بھُول کر بھی تجھے بھُلا نہ سکا

بات بگڑی ہوئی بنا نہ سکا

روز و شب دل کی بیکلی نہ گئی

رازِ وحشت صبا نے تاڑ لیا

گل و بلبل سے کہہ دیا جا کر

اہلِ گلشن نے وجد میں آکر

کہہ دیا تجھ سے ماجرا سارا

ڈر ہے تُو اب خفا نہ ہو جائے

درد دل کی دوا نہ ہو جائے

لاہور – ۱۹۳٤

لاہور – ایک یاد

یاد آ رہی ہیں مجھ کو لاہور کی فضائیں

وہ دلفریب نغمے، وہ رس بھری ہوائیں

غُنچوں کا وہ چٹک کر دینا پیامِ مستی

مُرغانِ خشنوا کی رنگین وہ صدائیں

وہ صبح صبحِ ہستی، وہ شام شامِ بادہ

حُسنِ ازل کی ہر سُو بِکھری ہوئی ادائیں

وہ سبزہ زار دلکش، تازہ دماغ جس سے

چھائی ہوئی سُروں پر مے ریز وہ گھٹائیں

وہ دَورِ جامِ رنگیں، وہ رقصِ روح پرور

وہ عشرتوں کے ساماں ہر سمت دائیں بائیں

وہ رازداں کہ جن کو خود راز ڈھُونڈتا ہے

حاصل ہے کیف جن کو اخلاص و خامشی کا

وہ انجمن کہ جس میں ہے شمعِ عشق روشن

پروانے کو سبق ہے ایشار و بندگی کا

وہ دَورِ جامِ اُلفت، مہر و وفا کی باتیں

وہ مستیوں کی دعوت، عالم وہ بیخودی کا

وہ شمعِ حُسن قرباں صد کوہِ طور جس پر

دُنیا کی انجمن کا ہے وقف نوُر جس پر

وہ پھُول جس کی پتّی پتّی میں جنّتیں ہیں

لاہور کی زمیں کو فخر و غرُور جس پر

وو نغمۂ مجسّم، وہ پیکرِ ترنّم

ہے منحصر دلوں کا کیف و سرُور جس پر

باغوں میں رنگ و بوُ کا طوفاں وہی ہے اب بھی

بلبل چہک رہی ہے، گل مُسکرا رہے ہیں

اب بھی وہ آسماں پر چھائی ہوئی ہے بدلی

میٹھے سُروں میں کوئی اب بھی تو گا رہا ہے

رقص و سرود اب بھی ہنگامہ آفریں ہیں

اب بھی چراغِ محفل ہاں جگمگا رہا ہے

"لارنس" و "مال" اب بھی ہیں ضامِنِ تجلّی

اب بھی تو کوئی دل پر بجلی گِرا رہا ہے

مہجور و مضمحل ہوں، فریاد کر رہا ہوں

میں بھُول جانے والوں کو یاد کر رہا ہوں

دہلی – ۱۹۳۷

مہمان

دستک

واہمہ یہ تو نہیں

آ گئے ہیں وہ یقیناً اب تو

ڈھُونڈتا پھرتا رہا ہوں جن کو

آ گئے ہیں یہ وہی

اے دل !

کھٹ کھٹ

کھولتا ہوں میں ابھی

بند دروازہ کیا تھا کس نے

یوں انہیں چھین لیا تھا کس نے

سوچ میں ڈُوب گیا

اے دل !

ہر سُو

خامشی چھائی ہوئی

پھر یہ دروازے پہ آیا تھا کون

روح میں میری سمایا تھا کون

ہو نہیں سکتی ہوا

اے دل ! دہلی – ١٩٤٥

بڑھتے سائے

سائے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں

خاک اُگلتی ہے دھُواں

نوُر سِمٹا ہوا، منہ اپنا چھُپانے کے لئے

جُستجوُ میں ہے کسی گوشے کی

اور بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں سائے ہردم

ہر طرف مشرق و مغرب کی فضاؤں میں ہجوم

جنگ کی تیرہ و پُر ہول گھٹاؤں کا ہے

ہچکیاں لیتے نظر آتے ہیں خوُرشید و نجوُم

رنگ بِکھرا ہوا مایوس فضاؤں کا ہے

چنگ و بربط کی صدا

رُوح کے رقص کا اِک عکسِ جمیل

نوعِ انسانی کی تہذیب و تمّدن کا نکھار

یعنی صدیوں کا نچوڑ

شورش و غلغلۂ محشرِ اجسام میں آہ

رہ گئی دب کے ہمیشہ کے لئے

کیا ہمیشہ کے لئے ؟

کرّۂ ارض پہ چھائی ہے بھیانک ظلمت

اور معلوم نہیں راہ کے پیچ و خم بھی

اور منزل کا تصّور بھی نہیں زہنوں میں

اور دل دہلے ہوئے، پاؤں پہ لرزہ طاری

اور دم گھُٹتا ہوا ---

ظلمتیں پھر بھی گھری آتی ہیں

اور بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں سائے ہر دم

دہلی – ۱۹۳۹

دفتر کا خدا

مدام حاکم و محکوم کے جھمیلوں میں

کُچل گئے ہیں دماغ و ضمیر و ذہن اس کے

یہ اپنے آپ، کیا جانے، کیا سمجھتا ہے

خود اپنے عیب و ہنر پر نہیں نظر اس کی

یہ دیکھتا ہے فقط دوُسروں کے عیب و ہنر

اگر یہ خوش ہے تو بدتر گناہ بھی ہے معاف

یہ خوش نہیں تو کارِ ثواب کارِ گناہ

بندھی ہی رہتی ہیں آنکھوں پہ پٹیاں اس کی

اسے نصیب کہاں فرصتِ نظر دم بھر

یہ ہے مشین جو کرتی ہے دستخط — لیکن

ہو "گڑبڑی" تو بچارے کلرک کا ذمہ

پسند اس کو خوشامد ہے گو خلاف بھی ہے

یہ دفتروں کا خدا بھی عجیب خلقت ہے

دہلی — ۱۹۳۹

سوچ

ایک گوشے میں جل رہا ہے چراغ

روشنی ہو رہی ہے کمرے میں

در و دیوار و بام مُہر بہ لب

زندگی سو رہی ہے کمرے میں

اور باہر ہے ظلمتوں کا ہجوم

گِھر کے آئی ہے مست کالی گھٹا

آندھیوں کی یہ تُندی و تیزی

شورِشوں کا ہے ایک حشر بپا

منہ لپیٹے ہوئے پڑا ہوں میں

سُن رہا ہوں ترانۂ طوفاں

جب گرج بادلوں کی ہوتی ہے

کانپتا ہے مِرا دلِ ناداں

سوچتا ہوں، عروسِ فطرت کو

ابنِ آدم سے کیا عداوت ہے

ہے بشر کو سکونِ دل کی تلاش

خوُگرِ اضطراب فطرت ہے

دہلی — ۱۹٤۰

چار یُگ

ست یُگ :

پریم کی مدیرا پی کر دُنیا ہو ہی گئی دیوانی

کھو بیٹھے مستی میں آکر اپنی سُدھ بُدھ گیانی
دھرتی اور آکاش میں گوُنجی آس اُمید کی بانی

تریتا یُگ :

جاگی انگڑائی لے کر روشن اوشا کی رانی
جیون ساگر کے دھاروں سے اُلجھے سارے پرانی
وقت کی آندھی نے کی پیدا دریا میں طغیانی

دواپر یُگ :

ٹیڑھی میڑھی راہوں پر چلنے میں ہوئی آسانی
دانا دانائی سمجھے اس کو ناداں نادانی
قدر اُجالوں کی کس نے تاریکی میں پہچانی

کلی یگ :

چھِرے ہوئے انجان ارادوں نے کر لی من مانی
پریم کے امرت میں بِس گھولا، خون ہوا سب پانی
ختم ہوئی آکر اس منزل پر اپنی بھی کہانی

دہلی ــ ١٩٤١

معذرت

رومانیت سے دل کو تعلق نہیں رہا

رومان ڈھُونڈتے ہو مِرے شعر میں فضُول

ہوں حادشاتِ گردشِ ایّام کا شکار

چُبھتا ہے بنکے خار اب آنکھوں میں میری پھُول

آزاد کون کہتا ہے مجھ کو بہ ایں ہمہ

مجبوریِ فرائض و پابندیِ اصُول

قلب و دماغ وقفِ غم و فکرِ روزگار

میں معجزاتِ حُسن و محبّت گیا ہوں بھُول

وہ دن گئے کہ لیتی تھی منزل مِرے قدم

ہر سمت رہگزر میں اب اُ ڑتی ہے خاک، دھُول

دہلی — ۱۹٤۱

شام

اُجالا سوئے مغرب جا رہا ہے تیزگامی سے

نقوشِ پا سُنہری بدلیوں پر رقص فرما ہیں

شعاعِ آخری ہوتی ہے رُخصت کوہساروں سے گلے مِل کر

فلک سا اونچے میناروں پہ عکسِ مہرِ تاباں ہے

بڑھے جاتے ہیں سائے

رفتہ رفتہ رُوئے عالم پر اندھیرا چھاتا جاتا ہے

بِکھیرے کالی زُلفیں آ رہی ہے رات کی دیوی

لبِ شیریں سے خواب آور ترانے گاتی آتی ہے

جبینِ تیرگی پر جِھلمِلاتے ہیں ستارے ننھے ننھے سے

مُرتّب ہو رہا ہے خواب کا افسانۂ رنگیں

ہوا دِن ختم ----

اب اے زندگی کی کشمکش رُخصت

مسافر تھک گیا ہے بیٹھ جانے دے سرِ راہے

نہیں معلوم کتنی دُور ہے منزل ابھی اس کی

کہ ہے روزِ ازل سے جُستجوُ باطل ابھی اس کی

ذرا یہ تازہ دم ہو لے

نمود صبح ازنِ کوُچ پھر دینے کو ہے اس کو

دہلی — ۱۹٤۱

ڈبکنی

(سانیٹ)

پسِ پردہ کسی نے میرے ارمانوں کی محفل کو،

کچھ اِس انداز سے دیکھا، کچھ ایسے طور سے دیکھا،

غُبارِ آہ سے دے کر جِلا آئینۂ دل کو،

ہر اِک صُورت کو میں نے خوُب دیکھا، غور سے دیکھا

نظر آئی نہ وہ صُورت، مجھے جس کی تمنّا تھی

بہت ڈھُونڈا کیا گلشن میں، ویرانے میں، بستی میں

منّور شمعِ مہر و ماہ سے دِن رات دُنیا تھی

مگر چاروں طرف تھا گھُپ اندھیرا میری ہستی میں

دلِ مجبُور کو مجرُوحِ اُلفت کر دیا کس نے

مِرے احساس کی گہرایوں میں ہے چُبھن غم کی

مِٹا کر جِسم، میری رُوح کو اپنا لیا کس نے

جوانی بن گئی آما جگہ صدماتِ پیہم کی

حجاباتِ نظر کا سلسلہ توڑ اور آ بھی جا

مجھے اِک بار اپنا جلوۂ رنگیں دِکھا بھی جا

دہلی ــ ۱۹٤٤

منا ہی لیا

میری جیون کی بگیا ہے پھُولی ہوئی　　یاد پھر آ گئی بات بھُولی ہوئی
من کے ساگر میں طوفاں اُمنگوں کا ہے　　کھیل سارا انوکھا یہ رنگوں کا ہے
وہ تو سوتے تھے میں نے جگا ہی لیا
اپنے پیتم کو میں نے منا ہی لیا

میں تو خوشیوں کے دیپک جلانے چلی　　پریت کے گیت سب کو سُنانے چلی
میرے آنگن میں آج اُجالا ہے پھر　　میری آشا نے مجھ کو پُکارا ہے پھر
اپنی بِگڑی ہوئی کو بنا ہی لیا
اپنے پیتم کو میں نے منا ہی لیا

ساز بجتا ہے بوُندوں کا، گاتی ہوں میں　　اپنے پیتم کو جھُولا جھُولاتی ہوں میں
میری آنکھوں کو پھر روشنی مِل گئی　　آپ ہی آپ من کی کلی کِھل گئی
اپنا کھویا ہوا چین پا ہی لیا
اپنے پیتم کو میں نے منا ہی لیا

دہلی ــ ۱۹٤۵

پریت نبھاؤ

پریم اگن ہردے میں جلاؤ سُونے جیون کو چمکاؤ

سانجھ سویرے، جنگل ویرانے میں ٹھوکر کھاؤ

پریم سے کیوں گھبراؤ

پریت کرو تو اُسے نبھاؤ

لوگ جو کہتے ہیں کہنے دو لوگوں کی باتیں رہنے دو

لوگوں کی باتیں جھُوٹی ہیں، اُن باتوں میں نہ آؤ

اُن باتوں کو بھُلاؤ

پریت کرو تو اُسے نبھاؤ

جس نے کھویا، اُسی نے پایا کون اپنا اور کون پرایا

جھُوٹے جگ کے جھُوٹے ہیں یہ سارے بھید اور بھاؤ

ان سے بچو، بچاؤ

پریت کرو تو اُسے نبھاؤ

پریم کو جیون جوت بنا لو دھرتی پر آکاش جھُکا لو

بڑھتے ہوئے ان طوفانوں میں نیّا پار لگاؤ

مرو، امر ہو جاؤ

پریت کرو تو اُسے نبھاؤ

دہلی ــ ۱۹٤۵

کھلونا

تِرے چہرے پہ ہیں بِکھرے ہوئے پوڈر کے نقوش

جیسے دیوار پہ قلعی کا دمکتا ہوا رنگ

سُرخ دہکے ہوئے رُخساروں پر

آتشِ نغمۂ ہستی کی لہک

ساغرِ لب میں چھلکتی ہے شفق کی مئے ناب

لِپ سٹِک، رُوج کا اعجاز و کرشمہ ہے یہ

مشرقی جسم پہ مغرب کا لباسِ عریاں

ہو گیا خبط نمائش کا تجھے

کیا ترے ملک میں ایسا نہ تھا ملبوس کوئی

جو ترے پیکرِ آوارہ کی زینت بنتا

---- کون کہتا ہے کہ ہے مشرق و مغرب میں تمیز ---

مُسکراہٹ تِرے چہرے پہ ہے پھیکی پھیکی

رُوح کے کرب و اذیت کی امیں

سُرمگیں آنکھوں میں تیری ہے خمارِ غمِ دوشیں کی جھلک

جذبِ رُوح نہیں یہ تِرا حُسنِ ارزاں

تیرے پہلو میں دھڑکتا ہے مِرا دل پھر بھی

رینگتی ہے مِرے اعضا میں جوانی کی اُمنگ

میں ملمح کو بھی سونا ہی سمجھ لیتا ہوں

میری جنّت تِری آغوش میں ہے

خوُبصُورت مِرے ہاتھوں میں کھلونا ہے توُ

تیرے چہرے پہ ہیں بِکھرے ہوئے پوڈر کے نقوش

ساغرِ لب میں چھلکتی ہے شفق کی مئے ناب

دہلی — ۱۹٤۵

میں

جب تخیّل میں سکوں کا شائبہ پاتا ہوں میں

آتشِ نغمات کی تخلیق فرماتا ہوں میں

قلبِ گیتی میں جلا کر شمعِ سوزِ آرزو

زیست کی رگ رگ میں خونِ گرم دوڑاتا ہوں میں

بیخودی میں جب خودی کا راز ہو جاتا ہے فاش

کل فضائے عالمِ امکاں پہ چھا جاتا ہوں میں

خود پہ کر لیتا ہوں طاری عالمِ دیوانگی

اس طرح کھو کر ہی اپنے آپ کو پاتا ہوں میں

دل کی دھڑکن انتہائے غم میں ہو جاتی ہے تیز

ڈُوب کر احساس میں تازہ غزل گاتا ہوں میں

میں ہی میں ہوں اس جہاں میں ، کچھ نہیں میرے سوا

ڈھُونڈتی ہے اور کس کو اب زمیں میرے سوا

دہلی ــ ۱۹٤۵

سنگیت

جھن جھنن جھنن جھنکار اُٹھی — تاروں کی مسلسل جنبش سے
ناگن کوئی پھونکار اُٹھی — زہریلے، نشیلے بل کھاکے
کانوں نے سُنا، دل نے سمجھا — آنکھوں نے سنہرے جال بُنے
جیون میں اک طوفان اُٹھا — اُمیدوں کے تیور بدلے
ملتی ہوئی آنکھیں جاگ اُٹھی — رنگین افسانوں کی رانی
پھر لے بیٹھی دل کی کشش — بحرِ جذبات کی طغیانی
ہستی نے اپنا رُخ بدلا — غم، عشرت میں گم ہو ہی گیا
اک نُور کا دریا بہہ نکلا — اور تاریکی کو کھو ہی گیا
ماضی کے خزانوں کے موتی — چمکے، دُنیا کو چمکایا
اور ذہن میں وہ عہدِ مستی — پھر اپنے آپ اُبھر آیا
وہ عشق و محبّت کی گھاتیں — وہ حُسن و ادا کی رعنائی
وہ کیف میں غلتیدہ راہیں — پھر بیتی جوانی یاد آئی
ماضی کے ہر ویرانے پر — تعمیرِ فردا ہونے لگی
دل میں دل کے سمجھانے پر — اُمیدیں پیدا ہونے لگی

دہلی ــ ۱۹۴۶

رام کہانی

دُور ہے تیری منزل راہی، دُور تجھے ہے جانا

مایہ، موہ، وبال میں پھنس کر

جیون کے جنجال میں پھنس کر

آشاؤں کی مدیرا پی کر

ہردے کی آنکھوں کو سی کر

منزل کو نہ بھُلانا

دُور ہے تیری منزل راہی، دُور تجھے ہے جانا

برکھا، دھوپ، پہاڑ اور دریا

جنگل، ویرانہ اور صحرا

سانجھ سویرے چلتے رہنا

دُکھ سہنا اور کچھ نہ کہنا

دُکھ میں بھی سُکھ پانا

دُور ہے تیری منزل راہی، دُور تجھے ہے جانا

منزل کو تو جا ہی لے گا

کھوئی دولت پا ہی لے گا

سُن کر تیری رام کہانی

جھُومے گی دنیا کی جوانی

آگے پاؤں بڑھانا

دُور ہے تیری منزل راہی، دُور تجھے ہے تجھ کو جانا

دہلی — ۱۹٤٦

اُمید

تُو بنانے مجھے آئی ہے، چلی جا ، جا بھی

تیری باتوں میں نہ آوں گا، نہ آوں گا کبھی

تیری باتوں ہی میں آکر تو ہوا ہوں برباد

چھوڑ پیچھا مِرا، کم بخت، کمینی، بد خُو

زندگی میری اجیرن ہوئی تیرے کارن

تُو میرے پیچھے چلی آتی ہے ---- دِن ہو کہ ہو رات ---

باد و باراں میں بھی پاتا ہوں تجھے ساتھ اپنے

اور جب تُو ہے مِرے ساتھ تو پھر فی الواقع

میری منزل ہوئی جاتی ہے پہنچ سے باہر

تیرے نغموں کی مدُھر تانوں میں کھو جاتا ہوں

شورشِ زیست سے بے فکر سا ہو جاتا ہوں

تجھ کو منحوس اداہائے تبسّم کی قسم

بجلیاں خرمنِ دل پر نہ مِرے اور گِرا

میرے اشکوں کو نہ دعوت دے اُمڈ آنے کی

تیرے چہرے سے اُتر جائے جو غازے کی یہ تہہ

دیکھنا تجھ کو گوارا نہ کرے آنکھ کبھی

تیرے رنگین و حسیں سپنے ہیں مکر اور فریب

زندگی تلخ حقیقت ہے تو پھر تلخ سہی -

دہلی ــ ١٩٤٦

عالم جاگا

مغرب کا در بند ہوا مشرق سے سُورج اُبھرا

نُور کا پرچم لہرایا تاریکی کا رنگ اُڑا

بھُوکے پیٹوں نے بڑھ کر زر کا ساغر چھین لیا

ہو کے رہا، تم بھی دیکھو میں نے جو کچھ چاہا تھا

میرے زورِ بازو نے دریا کا رُخ موڑ دیا

میں بھی تو اک انساں ہوں میں خود کو پہچان گیا

اونچے، سرکش ایوانو، میں نے تم کو جیت لیا

غم کی زنجیریں ٹُوٹیں آخر میں آزاد ہوا

روشن میرا مستقبل

میں جاگا، عالم جاگا

دہلی — ۱۹٤۷

کیسے کٹے گی رات

تجھ بِن کیسے کٹے گی رات

بیٹھی بیٹھی راہ تکوں گی

کروٹ کروٹ سو نہ سکوں گی

لا نہ سکوں گی اپنی زباں پر پاپی من کی بات

تجھ بِن کیسے کٹے گی رات

بیتے دِن پھر یاد آئیں گے

نینن انسون بھر لائیں گے

آنسو میں بہنے نہ دوں گی اور ملوں گی ہات

تجھ بِن کیسے کٹے گی رات

سُونی ہے بگیا جیون کی

ٹوُٹ گئی ہر آشا من کمی

مجھ کو ستانے آئی ہے کیوں یہ سُوکھی برسات

تجھ بِن کیسے کٹے گی رات

دہلی – ۱۹٤۸

ماں

ماں، توُ کہاں ہے ؟

تیرے لگائے ہوئے پھُول کِھل کر قہقہہ لگانے والے تھے

تیری سینچی ہوئی بیلیں بڑھ کر آسمانی بلندیوں کو چھُو لینا چاہتی تھیں

تیرے باغ میں بہار کی خوبصورت دیوی سفید بازو پھیلائے آمادۂ رقص تھی

مندروں میں دیوتاؤں کی آرتی اُتاری جا چُکی تھی

زندگی اپنے جوبن پر اِترا رہی تھی

ایسے وقت میں، اے ماں،

تُونے ہنستے ہوئے پھُولوں کے چہروں میں دلچسپی نہ لی

تُونے بڑھتی ہوئی بیلوں کے روشن مستقبل پر نظر نہ ڈالی

تُونے رقصِ بہار پر توجہ نہ کی

تُو آرتی اُتار چُکی تھی، مندروں سے دوُر، بسترِ علالت پر

اور موت کا دیوتا تیری جیون بھینٹ قبول کر چُکا تھا

ماں، تُو جا چُکی تھی

ان پھولوں، ان بیلوں، ان بہاروں، ان مندروں سے بہت دوُر

ایسی جگہ جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا، کبھی نہیں آتا –

دہلی – ۱۹۴۹

نرم چٹانیں

پھر وہی نرم چٹانیں مِرا رستہ روکے

اُسی منزل کی خبر دیتی ہیں

میں جہاں سے تھا چلا

یہ چٹانیں تو ہیں جانی ہوئی، پہچانی ہوئی

ان میں بہتا ہے جو دریائے حیات

میری سیرابی و شادابی کا باعث ہے وہی

مگر ان نرم چٹانوں کی حسیں سطح کا لمس

آج اک تازہ کشش رکھتا ہے

ایک انجانی سی لذّت کا پیامی بن کر

دیدہ و قلب کو گرماتا ہوا

روح کے تار جھٹک دیتا ہے

اور وہ تیرہ و تاریک بھیانک منزل

رات کی رانی بنی بیٹھی ہے

اک نیا رُوپ، انوکھی سج دھج

کون وہ سُورما رہرو ہے نکل جائے جو دامن کو بچا کر آگے —

پھر وہی نرم چٹانیں اُسی منزل کی طرف

مجھے کھینچے لئے جاتی ہیں، بڑھی جاتی ہیں

زندگی یوں ہی جنم پاتی ہے

سیلم (تملناڈو)- ۱۹۵۷

نیا آدمی

تقریروں سے آگ لگائے تحریروں سے حشر اُٹھائے
خوابوں کے پرچم لہرائے مستقبل کے نغمے گائے
اُمیدوں سے دل بہلائے ارمانوں کی سیج سجائے
عزم و ارادہ پر اِترائے منزل منزل ٹھوکر کھائے
ذرّے میں سُورج چمکائے قطرے میں ساگر چھلکائے
جنگ و جدل پر اشک بہائے امن و سکوں کے گیت سُنائے
پھُولوں کے سینے دھڑکائے کانٹے کانٹے کو مہکائے
نوچ کے پھینکے شب کے سائے نُورِ سحر ہرسُو پھیلائے
بھید انسانیت کا پائے انساں کو انسان بنائے
اک بنجارا گاتا جائے
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

مدراس ــ ۱۹۵۷

ماں کی موت

بدلہ بدلہ نظر آتا ہے زمانہ اے ماں کبھی بھُولے گا نہ مجھ کو تِرا جانا اے ماں

تیری آغوش کی تسکین ہے اب خواب و خیال اب تیرا پیار بھی ہے ایک فسانہ اے ماں

دیکھ سکتی نہ تھی آنسوُ توُ میری آنکھوں میں کیوں گوارا ہے مِرا اشک بہانا اے ماں

میری تشکیل و ترّقی تِرے ہاتھوں سے ہوئی توُ ہی منزل کا پتا مجھ کو بتانا اے ماں

میرے اُلجھے ہوئے بالوں میں کریگا اب کون اُنگلیوں سے تِرے اُٹھ جانے پہ شانا اے ماں

تھپکیاں، لوریاں جب دے کے سُلاتی تھی مجھے اصل میں تھا وہ سماں کتنا سُہانا اے ماں

خواب دیکھا تھا جو توُنے، ہوں اُسی کی تعبیر تو میری خوابوں کی تعبیر دکھانا اے ماں

تُونے جو شمع جلائی تھی، رہے وہ روشن آندھیوں سے اُسے ظلمت کی بچانا اے ماں

ماں، تِرے جانے سے دُنیا میں کمی پاتا ہوں

درد سینے میں تو آنکھوں میں نمی پاتا ہوں

دہلی ــ ۱۹٤۹

چراغ

(میراجی کی موت پر)

چراغ بُجھ گیا

ادب کی بزم تیرہ ہو گئی

فضا میں سگواریوں کے بھُوت ناچنے لگے

اُمید یاس بن گئی

نِراس دل تڑپ اُٹھے

نگاہ آنسوؤں کی بیقراریوں میں کھو گئی

تمام کائنات ظلمتوں کی نذر ہو گئی

شباتِ زندگی فریب تھا، فریب ہی رہا

اجل کی سخت و سرد اُنگلیوں نے کھول دی گِرہ

تجلّیوں پہ اوس پڑ گئی، جمُود چھا گیا

چراغ بُجھ گیا ادب کی بزم تیرہ ہو گئی

چراغ بُجھ گیا تو کیا ؟

نہیں ہے روشنی تو کیا ؟

جو آج ہے، وہ کل نہ تھا

جو ہوگا کل، وہ اب نہیں
نئی تجلّیاں لئے نئے چراغ آئیں گے
نئے ترانے چھیڑ کر دلوں کو گدگدائیں گے
نئی حیات لائیں گے
اجل پہ مُسکرائیں گے

بُجھے ہوئے چراغ کا لطیف نرم سا دھواں
فلک کی بے پناہ وسعتوں میں جھُوم جائے گا
کہ اُس کی روشنی دوام و پائیدار ہو گئی –

دہلی – ۱۹٤۹

نہرُو کے بعد

شمعِ گوتم جلائے گا اب کون ظلمتوں کو مِٹائے گا اب کون

شانِ انساں بڑھائے گا اب کون نئے نغمے سُنائے گا اب کون

بزمِ دل جگمگائے گا اب کون جام چھلکاتا آئے گا اب کون

راہِ منزل دِکھائے گا اب کون رازِ ہستی بتائے گا اب کون

ہمیں اپنا بنائے گا اب کون پھرگلے سے لگائے گا اب کون

غنچۂ دل کِھلائے گا اب کون

رُوح کو گُگدائے گا اب کون

کون پیغام امن کا دے گا کون گاندھی کا نام اب لےگا

کون دیکھے گا خواب فردا کے جام چھلکائے گا تمنّا کے

کون ہوگا فدا صداقت پر صدقے ہو جائے گا محبّت پر

کون اُٹھائے گا سوچ کر ہر گام کون رکھے گا صرف کام سے کام

کون دے گا نویدِ فصلِ بہار لائے گا ہر کلی پہ تازہ نکھار

کون گِرتوں کو اب اُٹھائے گا راہِ انسانیت دکھائے گا

کون ہوگا شریکِ غم اپنا

کون رکھے گا اب بھرم اپنا

بُجھ گئی شمع جو فروزاں تھی زندگی کے نگار خانے میں

بلبلِ خشنوا سکوت بہ لب یاس کا باس آشیانے میں

زندگی موت کے دوراہے پر

کیا کڑا وقت ہے زمانے پر

مادرِ ہند، تیرے ماتھے پر اب جواہر کی آب و تاب نہیں

جس نے اونچا کیا تھا سر تیرا تیرے سر پر وہ آفتاب نہیں

جانے والے کی رُوح کی سوگند ہم بھی تیرے سپُوت ہیں، اے ماں

طاقت و حوصلہ ہمیں بھی دے کر سکیں تجھ پہ جان و دل قرباں

جو دکھائی ہے راہ نہرُو نے ہم رہیں صبح و شام اُسی پہ رواں

جو پرستار ہیں اہنسا کے

جیت لیتے ہیں دل وہ دُنیا کے

نئی دہلی ــ ١٩٦٤

محرُومِ مرحوُم

اے فلک، کچھ ہے تُجھے معلوُم بھی

چل بسے حضرتِ محرُوم بھی

رو رہا ہے دل کہ کہنا ہی پڑا

حضرتِ محرُوم کو مرحوُم بھی

کیا گئے محرُوم، اک دِن ہو گئی

بزمِ اُردو مفلس و مغموُم بھی

ہو گئی خاموش آخر وہ نوا

جس سے اُردو کی مچی تھی دھوُم بھی

ہے شکستِ ساغرِ دل کی صدا

اے ضیا، یہ نوحۂ منظوُم بھی

نئی دہلی – ۱۹٦٦

لا متنَاہی

ابھی اِک شمع کے بُجھنے کا الم تھا دل میں
ابھی روتی ہوئی آنکھوں پہ اندھرا تھا مُحیط
ابھی شب بیٹھی تھی گیسوئے پریشاں لے کر
ابھی سر بستہ تھے اسرارِ نمُودِ خُورشید

اور اِک شمع بُجھی، ایسی چلی بادِ سمُوم
اور ٹوُٹا سرِ ہستی پہ مصائب کا پہاڑ
اور اُجالوں کا ہوا خون، بڑھی ظلمتِ غم
اور اَن دیکھے حسیں خوابوں کا بھانڈا پھُوٹا

امنِ ایثار طلب لے کے رہا نذرِ وفا
ایک پروانہ ہوا جلوہ گہ دل پہ نثار
ایک دیوانے نے دی جان صداقت کے لئے
آتشِ گل سے ہوا راکھ شناخوانِ بہار

شمع جلتی ہے تو اِک نُور کو دیتی ہے جنم
اور بُجھتی ہے تو وہ نُور نہیں مِٹ جاتا
شمع بُجھ کر ہی تو کر جاتی ہے شمعیں روشن
سلسلہ ختم ضیاؤں کا کہیں ہوتا ہے ؟

نئی دہلی — ۱۹٦٦

شِفا گوالیاری کی موت

نالے کی موت، آہ کی موت اور بُکا کی موت

سُورج کی موت، چاند کی، صبح و مسا کی موت

سچ، جھُوٹ، جیت، ہار، روا، ناروا کی موت

اُمید و بیم و حسرت و صبر و رضا کی موت

کیف و جمال و نکہت و رنگ و نوا کی موت

مستی و جام و بادہ و ابر و ہوا کی موت

شبنم کی موت، شعلۂ برق انتہا کی موت

دَورِ بہار و عہدِ خلوص و وفا کی موت

رنگینی و لطافتِ فکرِ رسا کی موت

تخیّل کی، نزاکت و حُسن و ادا کی موت

راہِ وفا میں ہمسفرِ بے ریا کی موت

اِک دوست، اِک رفیق کی، اِک آشنا کی موت

جیسے چمن میں بلبلِ نغمہ سرا کی موت

اِک سانحہ ہے شہرِ ادب میں شِفا کی موت

بمبئی ــ ۱۹٦۸

والد کی موت

باپ کا سایہ بھی میرے سر سے آخر اُٹھ گیا
رونا آ جائے نہ کیوں اپنی "یتیمی" پر مجھے
پے بہ پے صدماتِ غمہائے زمانہ نے ضیا
کر دیا ہے رفتہ رفتہ درد کا خُوگر مجھے

میں چلوں گا کس کی اُنگلی تھام کر اب راہ میں
کون ذمہ دار ہوگا اب خطاؤں کا مِری
کون غمخواری و دلداری کرے گا بے خطر
کون اُٹھائے گا خوشی سے ناز اداؤں کا مِری

میری پُر اسرار خاموشی سے اب اُلجھے گا کون
کون چونکے گا مِری آواز سُن کر صبح و شام
بات جو ہے میرے دل میں اَن کہی، سمجھے گا کون
کون ہوگا کامرانی پر مِری اب شادکام

ہو گیا رُخصت، مجھے کس کے حوالے چھوڑ کر
میں بھی اُڑ جاؤں گا اِک دِن جھُوٹے بندھن توڑ کر

نئی دہلی — ١٩٦٨

شاد بِن درد

(نریش کُمار شاد کی موت پر)

زمانہ پریشاں ہے، نا شاد بھی	کہ ہم سے جُدا ہو گیا شاد بھی
حوادش سے دُنیا کے پامال تھا	شرابی کا ہوتا ہے جو حال، تھا
تلاش اپنی کرتا رہا عمر بھر	رہی ڈھُونڈتی اُس کو منزل مگر
اُمیدوں کی موجوں میں بہتا ہوا	مُخالف ہواؤں سے لڑتا رہا
غموں کو سمجھ کر دلیلِ حیات	وہ گاتا رہا نغمۂ کائنات
مِٹاتا رہا تشنگی جام سے	بڑا پیار تھا درد کے نام سے
جُدائی نہ وہ درد کی سہہ سکا	پِگھلتے پِگھلتے فنا ہو گیا
فنا ہو کے زندہ دوبارا ہوا	جو کل پھُول تھا آج تارا ہوا

بمبئی — ۱۹٦۹

منظر صدیقی کی موت پر

پھُول پژمُردہ، بلبلیں خاموش

ہائے، لوُٹا خزاں نے باغ اک اور

سائے بزمِ سخن میں پھیل گئے

ہو گیا نقش دل پہ داغ اک اور

دارِ فانی سے اُٹھ گیا منظر

دفعتاً بُجھ گیا چراغ اک اور

وقت نے اِتنی بھی نہ دی مہلت

پاتا وہ لمحۂ فراغ اک اور

مِل گیا خاک میں کراچی کی

اکبرآباد کا ایاغ اک اور

اے ضیا، شاید اُس نے مر کر ہی

پا لیا زیست کا سُراغ اک اور

نئی دہلی ـــ ۱۹۷۱

پوسٹ مارٹم

(فرقت کاکوری کی موت پر)

ریل کے تھرڈ کلاس ڈِبے میں

کل برآمد ہوئی تھی جو اِک لاش

سُکڑی، سِمٹی سی، ٹھٹھری، مُرجھائی

آج اخبار میں چھپی ہے یہ نیوُز

تھی وہ اِک بینوا و بد قسمت

جانے، پہچانے اُردو شاعر کی

مر کے شاید کسی کی فرقت میں

جنّتِ وصل مِل گئی اُس کو

دہلی – ۱۹۷۳

ابر احسنی کا قتل

افسوس، زندگی نے کِیا زندگی کا قتل

ہاتھوں سے آدمی کے ہوا آدمی کا قتل

کس کو خبر تھی صفحۂ آخر پہ زیست کے

لکھا تھا دستِ جہل سے دانشوری کا قتل

نالہ کناں ہے صبح، کہ پردے میں رات کے

ظلمت کی آندھیوں نے کِیا روشنی کا قتل

اب اس ستم ظریفیِ فطرت کو کیا کہوں

ہاتھوں سے بے بصر کے ہوا دیدہ وری کا قتل

اُردو کے حق میں ایک المناک سانحہ

منہ بولتے کلام کی جادُوگری کا قتل

سایہ کہاں "سحابِ سخن" کا ملے گا اب

یہ قتلِ شاعری ہے کہ ابر احسنی کا قتل

بے مایگیِ دہر کے ہاتھوں ہوا ضیا

تہذیب کا، شرافت و شائستگی کا قتل

نئی دہلی — ۱۹۷۳

نرم گرم ہوَائیں

سال اشاعت: ۱۹۸۷ء

ناشر: شریمتی راج کماری سونی

ضیا فتح آبادی کا ادبی سفر

وقتِ طلوع مستی

نکلا تھا گھر سے راہی

اِک سوچ کے سفر پر

صحنِ چمن میں اُس نے

سورج اُگا دیا تھا

لے کر جمالِ ہستی

راہوں کی گرد اُڑاتا

حُسنِ غزل کی دھن میں

نغماتِ صبح گاتا

ظلمت مٹانے نکلا

رستہ دکھانے نکلا

ہر لفظ اس کا جادو

ہر بات اک تجلّی

بن کر ضیا ئے ہستی

محفل پہ چھا گیا تھا

منزل کو پا گیا تھا

تصویر اس کے فن کی

کندہ ہے دل کی لو پر

جاوید ہو گئی ہے

دھوپ اور چاندنی میں

دنیا کی کھو گیا ہے

خاموش ہو گیا ہے

شاید تھکا تھکا سا

دو پل کو سو گیا ہے

آؤ چراغ اس کا

روشن کریں جہاں میں

دل میں بسائیں اس کو

بھولیں نہ ہم گماں میں

صِدق و صفا پر اس نے مٹ کر دکھا دیا ہے

اردو کی شاعری کو اونچا اٹھا گیا ہے

اوم پرکاش بجاج

مرکز کا اعتبار اُسے دائرے میں تھا

منزل کو پا کے کھویا ہُوا راستے میں تھا

میخانے کا یہ عالمِ مستی کہ رات بھر

مینا بھی رقص میں تھا، سُبو بھی نشے میں تھا

اب دل کے زخم زخم سے اٹھتی ہے کوئی چینخ

درماں سے بے نیاز تھا جب تک نشے میں تھا

پہچان ہوتی چہروں کی کیا اس دیار میں

اک اور آئینہ بھی جہاں آئنے میں تھا

اُلفت کے کاروبار کی دلچسپیاں نہ پوچھ

تھا فائدہ زیاں میں، زیاں فائدے میں تھا

کھولی زبان جس نے، گیا دار پر وہی

جو جان کر خموش رہا، وہ مزے میں تھا

تھی جس سکونِ دل کی تلاش اے ضیا مجھے

آہ و فغاں میں تھا نہ وہ شکوے گِلے میں تھا

آ، بڑھتی ہوئی پیاس بُجھانے کے لئے آ

آ، بُجھتی ہوئی شمعیں جلانے کے لئے آ

آ، لوریاں تاروں کو سُنانے کے لئے آ

آ، اونگھتی راتوں کو سُلانے کے لئے آ

آ، غنچۂ نورس سے ٹپکتی ہوئی بجلی

آ، شاخِ نشیمن کو جلانے کے لئے آ

آ، تو کہ ہے چارہ گرِ بے چارگیِ شوق

آ، درد کی دیوار گرانے کے لئے آ

آ، ہمّتِ پرواز پر و بال میں بھر دے

آ، ہوصلۂ زیست بڑھانے کے لئے آ

آ، توُ تو نہیں وقت، کہ آیا بھی گیا بھی

آنا تو یہی ہے کہ نہ جانے کے لئے آ

آ، جانِ ضیا، حسنِ غزل، شوخیِ اظہار

آ، گوہرِ الفاظ لُٹانے کے لئے آ

وہ بد نصیب تھا، اس کا کبھی نہ بخت اُگا

جو تیرے در کے مقابل کوئی درخت اُگا

ہزاروں چہرے، مگر سب کا ایک ہی چہرہ

شکستہ ہو کے ہی آئینہ لخت لخت اُگا

مٹے سکندر و فرہاد دونوں ایسے کہ پھر

نہ کوئی تختہ ہی اٹھا نہ کوئی تخت اُگا

یقین و عزم سے ہوتی ہے رہگزر ہموار

زمیں ہے نرم بہت، اس میں سنگِ سخت اُگا

کسی کو رحم کی بھیک اس دیار میں نہ ملی

جو مانگنا ہے تو لہجہ ذرا کرخت اُگا

نجوم و ماہ ہوئے محوِ جلوۂ بادہ

حضورِ پیرِ مغاں آفتابِ بخت اُگا

جُھلستی دھوپ سے سائے کی کیا اُمید ضیا

زمیں وہ سُوکھ گئی جس پہ تھا درخت اُگا

سہرا، گویا حجاب پھولوں کا

گجرا، جیسے شباب پھولوں کا

چُھو کے ہونٹوں کو رنگ چھلکائے

ساغرِ پُرشباب پھولوں کا

چیر کر ابرپاروں کا سینہ

نکلےگا آفتاب پھولوں کا

کیوں نہ کانٹوں کی سیج پر سو جائے

جس نے دیکھا ہو خواب پھولوں کا

ہر طرف رنگ، ہر طرف خوشبو

پھوٹ نکلا شباب پھولوں کا

بدلیاں چُپ ہیں، بجلیاں پُر شور

واہ رے انقلاب پھولوں کا

ہو قبا چاک تو ضیا پوچھوں

حالِ خانہ خراب پھولوں کا

آستاں سے تیرے، اپنا سر اُٹھا لے جاؤں گا

ایک دن یہ راہ کا پتّھر اُٹھا لے جاؤں گا

زندگی کی رہگزر ہموار یا دشوار ہو

بارِغم ہر حال میں دل پر اُٹھا لے جاؤں گا

میری آوارہ خرامی کے نشاں رہنے بھی دو

میں انھیں گلیوں میں پھر آکر اُٹھا لے جاؤں گا

گردشِ افلاک تھم جائے گی، رُک جائے گا وقت

دشتِ وحشت میں جب اپنا گھر اُٹھا لے جاؤں گا

صبح کا تھا منتظر، آئی، تو ہوں اس فکر میں

اب کہاں میں رات کا بستر اُٹھا لے جاؤں گا

رہ گیا ہے اب یہی اک میرے حصّے کا ضیا

دل جو ہے ہر درد کا خوگر، اُٹھا لے جاؤں گا

وہ پہاڑی تھا، مِت ہوا کس کا

بھات کھاتے ہی چُپکے سے کھسکا

پا بھی لیتا تو کرتا کیا درماں

دلِ زردار، دردِ مفلس کا

اُس کا مندر تو من کے اندر ہے

پوچھتا پھرتا ہوں پتہ جس کا

تجھے ہرجائی لوگ کیوں نہ کہیں

تُو کبھی اُس کا ہے، کبھی اِس کا

تھا ارسطو کوئی مرا دل بھی

بھر کے پیالہ جو پی گیا بِس کا

درد بن کر جو دل میں بیٹھا ہے

حادثہ ہے نزاکتِ حِس کا

سوتے میں جو چُرا لیا تھا ضیا

یہ غزل ہے جواز اُسی کِس کا

خالی پنجرا چھوڑ کے پنچھی اُڑ ہی گیا

سیدھا بہتا دریا آخر مُڑ ہی گیا

تم نے ہمدردی جو دکھائی، ٹوٹ کے پھر

میرے دل کا آئینہ بھی جُڈ ہی گیا

کوئی ہوَا کا جھونکا تھا جو ہولے سے

دروازے پر دستک دے کے مُڈ ہی گیا

پیغامِ شیریں کی تلخی پوچھ نہ کچھ

لے کے ساتھ نہ کیوں نامہ بر کُڈ ہی گیا

پوچھتا تھا آنےوالے کا اتا پتا

کائیں کائیں کرتا کوّا اُڑ ہی گیا

پاکے خزانہ قاروں کا خوش تھا لیکن

بانٹنے جب بیٹھا تو وہ بھی تھُڑ ہی گیا

آوٹ سے چلمن کی اس نے جھانکا تھا ضیا

چہرۂ گل کا رنگ چمن میں اُڑ ہی گیا

سانپ ڈستے رہے، زہر چڑھتا رہا

پربتوں پر کوئی منتر پڑھتا رہا

جس کے ہاتھوں میں میں نے ترازو دیا

میرے ہی سر وہ الزام مڈھتا رہا

دل کے ارمان دم توڑتے ہی رہے

اور آنکھوں کا دریا بھی چڑھتا رہا

دیکھ لینا مرے چہرے کا رنگ بھی

میرا اعمال نامہ وہ پڑھتا رہا

کوئی دریا تھا میری ہی تقدیر کا

روز اُترتا رہا، روز چڑھتا رہا

ایک منزل اِدھر، ایک منزل اُدھر

پیچھے ہٹتا رہا، آگے بڑھتا رہا

وہ مسافر جو منزل پہ پہنچا ضیا!

گر کے اُٹھتا رہا، رُک کے بڑھتا رہا

دیواریں چُپ، در گویا تھا

ہمسائے میں دل کھویا تھا

جلتی لکڑی، جلتے ہاڑ

دیکھ کے وہ سادھوُ رویا تھا

کاٹی فصلِ درد بھی اُس نے

بیج محبّت کا بویا تھا

اُتری تھی آکاش سے گنگا

پاپی دامن جب دھویا تھا

بول ذرا اے رات کے بستر

میں جاگا تھا یا سویا تھا

زہریلے سانپوں میں، میں نے

منزل کو پایا، کھویا تھا

تجھ سے کہوں کیا، میں نے ضیا کیوں

بوجھ صلیبوں کا ڈھویا تھا

اُس نے چھیڑی غزل، ساز زندہ ہوا

دلِ پُر درد کا راز زندہ ہوا

بڑھ گیا، چڑھ کے سولی پہ دورانِ خوں

پڑ گئی جان، سر باز زندہ ہوا

ڈال دی گل پہ کس نے بہاریں نظر

پیکرِ ناز و انداز زندہ ہوا

تشنہ کامی بلا کش کو لے ڈوبتی

تھا درِ میکدہ باز زندہ ہوا

پر سمیٹے قفس میں وہ تھا مردہ دل

ہوا مائل بہ پرواز زندہ ہوا

ٹکرے ٹکرے ہوا سنگباری سے جب

آئینہ، آئینہ ساز زندہ ہوا

مارنے کو مجھے تھا سکوتِ لحد

دی ضیا کس نے آواز زندہ ہوا

صحرا سے جو پلٹے تو کُھلا در نہیں دیکھا

ہم کہتے تھے اپنا جسے وہ گھر نہیں دیکھا

کشتی کہ ڈبو کر جو اُبھارے سرِ ساحل

طوفاں بکنار ایسا سمندر نہیں دیکھا

تھی میری دروں بینی بھی اک طُرفہ تماشا

اندر جسے دیکھا اُسے باہر نہیں دیکھا

مرہم سے گریزاں ہے وہ بیگانۂ درماں

اتنا بھی کوئی درد کا خوگر نہیں دیکھا

تدبیر نے پھینکی تو ستاروں پہ کمندیں

بگڑی ہوئی قسمت نے سنور کر نہیں دیکھا

بس ایک ہی جرعے میں جو پی جاتا ہے صحرا

ہم نے تو ابھی تک وہ سمندر نہیں دیکھا

غالب نے کہا کل جو ضیا آج بھی سچ ہے

غالب سا زمانے میں سخنور نہیں دیکھا

جان لیوا دردِ بے درماں ہوا

میں ہوا پیدا تو وہ پنہاں ہوا

لمس نوکِ خار کو اب کیا کہوں

رنگ و بو سے گل تہی داماں ہوا

دھوپ یخ بستہ تھی لا وا چاندنی

دل کی بربادی کا جب ساماں ہوا

مختصر تھی چار دن کی زندگی

مرتے ہی آخر امر انساں ہوا

بے حقیقت کھو کھلے افسانے پر

حیرتی آئینہ عنواں ہوا

سر گرانی، قتل و غارت، صبح شام

آدمی کا خون کیا ارزاں ہوا

ٹکرے ٹکرے کر کے ایٹم کو ضیا

سعیِ لا حاصل پہ خوش انساں ہوا

اعتبار اُٹھتے ہی عالم معتبر ہو جائے گا

جب خبر آے گی انساں بے خبر ہو جائے گا

شمع ہو جائے گی اپنی آگ میں جل کر خموش

قصّۂ طولانیِ شب مختصر ہو جائے گا

منزلِ مقصود کو پائے گا زیرِ نقش پا

وہ مسافر جو بھٹک کر راہ پر ہو جائے گا

مستقل غم دل نے چاہا تھا مگر تھی کیا خبر

درد بڑھ کر آپ اپنا چارہ گر ہو جائے گا

میرے تیرے درمیاں اک لمحے کا ہے فاصلہ

آج میرا ہے جو، کل وہ تیرا گھر ہو جائے گا

ٹھوکریں کھانے پہ بھی میں اس لئے گرتا نہیں

کون جانے میرا میں کیا ٹوٹ کر ہو جائے گا

کیا کہوں خوابِ طلسمِ شب کی کیفیت ضیا

آنکھ جب کُھل جائے گی، وقتِ سحر ہو جائے گا

دل چُراتے ہی مرے گھر سے وہ دوڑا کیسا

ایک پل بھی نہ رُکا ، نکلا بھگوڑا کیسا

دن کے ہنگاموں میں بھی رہتا ہے میرے پیچھے

شب کی تنہائی نے جادو کوئی چھوڑا کیسا

تھیں بہت تلخ نوا زہر اگلتی موجیں

میں نے بھی حلق میں قطروں کو نچوڑا کیسا

ایک ہی چوٹ میں جاتے رہے سب ہوش و حواس

کیل کے سر پہ پڑا آج ہتھوڑا کیسا

جیت جاتا تو ستاروں میں بھی آجاتی چمک

میری تقدیر میں تھا ریس کا گھوڑا کیسا

آنکھ کُھلتے ہی نظر آئی سیہ کاریِ شب

مجھے سوتے میں شعاعوں نے جھنجھوڑا کیسا

آج بھی سیلِ حوادث کو چنوتی ہے ضیا

رُخِ دریا کسی موسیٰ نے تھا موڑا کیسا

حالِ دل اُن سے کسی حال میں کہنے نہ دیا

مجھے حالات نے خاموش بھی رہنے نہ دیا

بستیاں دل کی بسا کر بھی رہا وہ ویراں

جنگلوں میں اُسے صحراؤں نے رہنے نہ دیا

تپشِ دل کو دعا دیتا ہوں، اے دل، جس نے

دھوپ کے شہر میں سایہ کہیں رہنے نہ دیا

یوں تو میری ہی کہانی تھی لبِ دنیا پر

کچھ مگر میری زباں سے مجھے کہنے نہ دیا

حشر اُٹھا یا تھا دل و جاں میں شبِ غم جس نے

رگِ احساس پہ اُس چوٹ کو سہنے نہ دیا

داغِ دل بن کے ہوا قبلہ نما مشلِ سحر

قطرۂ اشک، جسے آنکھ سے بہنے نہ دیا

موجِ طوفاں پہ ضیا، تہمتِ غرقابی ہے

کشتیاں ڈوب گئیں جب انھیں بہنے نہ دیا

ہوش اُڑاتا، رندوں کو چھلتا رہا

دورِ ساغر رات بھر چلتا رہا

واہ، ذوقِ گرمئیِ بزمِ حیات

سورج اپنی آگ میں جلتا رہا

اجنبی رستوں کی تھی پہچان اُسے

کارواں کے ساتھ وہ چلتا رہا

وہ جسے کہتے تھے ہم بوڑھا درخت

بوڑھا ہو کر پھُولتا پھلتا رہا

اُس کے ہاتھوں کی لکیریں، کیا کہوں

وہ کفِ افسوس کیوں ملتا رہا

کیا ہوا جو کیسہ بے جھنکار ہے

اُس کا لاکھوں پر قلم چلتا رہا

دل میں گہما گہمی اس ارماں کی ہے

وعدۂ فردا پہ جو پلتا رہا

وقت نے تاکا اُسی کو اے ضیا

جو بدلتے سانچوں میں ڈھلتا رہا

گرگٹ رنگ بدلتے دیکھا

وقت کا جادو چلتے دیکھا

بوڑھے خلاؤں کے چگر میں

کالا سورج ڈھلتے دیکھا

گلی گلی ڈھونڈھ آئے جسے، وہ

دل پہلو میں اچھلتے دیکھا

منزل منزل تھی گم راہی

جادہ جدہ سنبھلتے دیکھا

سعی و کاوش کا ہر جذبہ

بیکاری میں گلتے دیکھا

مردہ دلوں کو ہم نے اکثر

زندہ دلوں کو چھلتے دیکھا

جنہیں کیا روشن آندھی نے

اُن شمعوں کو جلتے دیکھا

میں نے ضیا، پھولوں کا گریباں

فصلِ گل میں نکلتے دیکھا

اک اشتہارِ شادی اخبار میں چھپا تھا

پڑھ کر اُسے نہ جانے کیا دل کو ہو گیا تھا

بنتی اگر تو بنتی دونوں میں کس بِنا پر

میں اُس کو چاہتا تھا، وہ مجھ کو چاہتا تھا

کہہ دوں اگر وہ مجھ سے ناراض ہو نہ جائے

غیروں سے اُس کا ملنا دل کو بُرا لگا تھا

دم لینے کی بھی فرست اے وقت تُونے کب دی

کیا تھک کے بیٹھ جاتے، رستہ تو دوڑتا تھا

اک حادثہ ہوا تھا، اتنی خبر ہے، لیکن

کچھ بھی پتہ نہیں ہے، کیا حادثہ ہوا تھا

مجھ پر بھی ایک ایسا آیا تھا وقت، یارو

جب اُس کی انجمن میں دل میرا بُجھ گیا تھا

مقتل میں سر جھکائے، دیوانۂ دل آئے

شہرِ وفا کی ساری دیواروں پر لکھا تھا

مطرب نے بزم لوُٹی، گا کر تری غزل جب

پہچانا کس نے، تُو بھی موجود اے ضیا تھا

ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں، بزمِ دل گرما گیا

کون تھا، دے کر کِھلونے جو مجھے بہلا گیا

اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے، مل گئی دل کو زباں

پھر کتابِ شوق کا کوئی ورق اُلٹا گیا

فصل ارمانوں کی یخ بستہ دلوں میں کچھ نہ پوچھ

لہلہاتے سبزہ زاروں کو بھی پالا کھا گیا

میری دُکھتی رگ سے جو نالہ اُٹھا تھا شامِ غم

صبح ہوتے ہوتے وہ کُل آسماں پر چھا گیا

پردہ ہائے درمیاں کی کیا شکایت کیا گِلا

آنکھ اُٹھا کر مجھ سے تیری سمت کب دیکھا گیا

اللہ اللہ، آدمی کی خود تباہی کا جنوں

لرزہ طاری تھا زمیں پر، آسماں تھرّا گیا

اے ہجومِ یاس و حرماں، کیا کروں جاؤں کہاں

زندگی کی کشمکش سے جی مرا گھبرا گیا

منحصر ہے سالمیت پر ضیا، رنگِ چمن

ٹوُٹ کر ٹہنی سے جو پتہّ گرا، مُرجھا گیا

وہ مسافر جو تھک گیا ہوگا

راستے سے بھٹک گیا ہوگا

غُنچہ غُنچہ چٹک گیا ہوگا

گوشہ گوشہ مہک گیا ہوگا

آہٹیں نرم نرم پتّوں کی

پیڑ پر آم پک گیا ہوگا

ڈال کر پھندا اپنی گردن میں

کوئی چھت سے لٹک گیا ہوگا

مُڈ کے دیکھا جو تُونے، لوگوں کو

میری نظروں پہ شک گیا ہوگا

اُس کی اُنگلی پکڑ کے چلتا تھا

ہاتھ میرا جھٹک گیا ہوگا

ارے احساسِ تشنگی توبہ

کوئی ساغر کھنک گیا ہوگا

گرتا پڑتا یہ جادۂ پُر پیچ

اے ضیا، دُور تک گیا ہوگا

ذرّہ ذرّہ ہے درخشاں اپنا

پتّہ پتّہ ہے گل فشاں اپنا

پھول مُرجھا ئے، ستارے ٹوُٹے

کہہ کے کیوں حالِ پریشاں اپنا

اللہ اللہ، جمالِ کافر

متزلزل ہوا ایماں اپنا

چہرۂ حال کی تاریکی میں

رُخِ فردا ہے درخشاں اپنا

جب کُھلا دفترِ قیس و فرہاد

نام تھا سب میں نمایاں اپنا

بسترِ خواب میں ظلمت بکنار

سر دُھنے شمع شبستاں اپنا

چاہیں کچھ اور، کریں ہم کچھ اور

ہے یہی عالمِ امکاں اپنا

آ گیا ہاتھ کسی کا دامن

چاک کرتے تھے گریباں اپنا

یہ مرا دل ہے ضیا، بڑھتا قدم

روک لے گردشِ دوراں اپنا

رات تارا جو آسماں سے گرا

دن نکلتے کھجور میں اٹکا

اس پریچہرہ کا جو عکس پڑا

آبِ آئینہ بن گیا دریا

مجھ سے اب پوچھتا ہے ہر منظر

ایسا منظر کسی نے دیکھا تھا

استعاروں میں ہو گئے تحلیل

شیریں، فرہاد، کوہ، کلہاڑا

سر برہنہ ہے دن کا سورج اب

چادرِ شب کا ڈال دو سایا

میں بھی للکارتا اُسے اکبار

بارہا اُس نے مجھ کو للکارا

کیوں نہ پہلے ملی مجھے یہ خبر

تھا مرے گھر میں تیرا بھی کمرا

بول، خونِ شہید، میں کب تک

بوجھ اُٹھائے پھروں صلیبوں کا

شمعِ منزل کی روشنی پھیلی

راستہ اپنے آپ میں سِمٹا

نگہہ لطف کی غلط بخشی

کچھ سمجھنے لگا ہے خود کو ضیا

سینوں میں اُترتی ہوئی تاشیر کی لذّت

پُر درد ہے تقریر یہ تحریر کی لذّت

لمحات شبِ غم کے ابھی ٹوُٹ رہے ہیں

زخموں میں مرے دل کے کسی تیر کی لذّت

رستوں کے طلسمات سے کیا دے گی رہائی

اس اشہبِ دوراں کو عناں گیر کی لذّت

پائے گا کہاں جائے اماں ذوقِ اسیری

کی ترک اگر پانوٗ نے زنجیر کی لذّت

اب بھی ہے یہی نعرہ لبِ موجِ رواں پر

تقدیر کے ہاتھوں میں ہے تدبیر کی لذّت

کیا بھیڑ ہے مقتل میں شہادت طلبوں کی

چلتا ہوا جادو ہے یہ شمشیر کی لذّت

جینے کا مزہ کیا ہے اگر موت نہ ہوتی

تخریب کی لذّت سے ہے تعمیر کی لذّت

تسکینِ دل و جاں ہے ضیا، بزمِ سخن میں

شوخی کہیں غالب کی، کہیں میر کی لذّت

واہ رے کیا ہے چھ کی بات
آگے پیچھے پانچ اور سات
بستی سج کے بنی دُلہن
آنگن میں اُتری ہے برات
میں تو تُجھ میں کھوئی ہوں
خامے سے کہتی ہے دوات
کاٹ رہا ہوں رو رو کر
کتنی ابھی باقی ہے رات
پلکوں سے چِپکی بیٹھی
بھیگی بِلی سی برسات
میں ہی دوُری، میں ہی وقت
سو باتوں کی ہے اک بات
فرض نِبھا اور قرض چُکا
ایک ہی ہے اب راہِ نجات

پردہ مینا سے اُٹھا رات کی رات

جام بھر بھر کے پلا رات کی رات

موت سے پہلے مجھے جینے دے

اے خدا، میرے خدا رات کی رات

صبح سے کہہ دو یہ، میرے گھر میں

کوئی مہماں ہے ذرا رات کی رات

راہ میں آنکھیں بچھا رکھی ہیں

دیکھ کر پانوں بڑھا رات کی رات

صبح کی آہٹیں سُنتا ہوں کہ ہے

دل گزرگاہِ بلا رات کی رات

چھپکلی اُتری ہے پانی میں مگر کی صورت

دشت پیمائی نے پھر دیکھ لی گھر کی صورت

اِس کھنڈر شہر میں کوندا سا لپک جاتی ہے

کسی دیوار، کسی چھت، کسی در کی صورت

جھیل سی آنکھوں میں اُترے گی تو اُڑ جائے گی

چادرِ شب میں جھپکتی یہ سحر کی صورت

جانے کیوں پتھّروں سے جھولیاں بھر لاتے ہیں

دیکھتے رہتے تھے جو لعل و گوہر کی صورت

سوچ کی دھوپ میں سہمے ہوئے سائے پیہم

نظر آتی نہیں تا دُور سحر کی صورت

چاند نے مُڑ کے نہ دیکھا تو بہت خوب ہوا

نقشِ خورشید میں تھی رقصِ شرر کی صورت

اُتر آیا ہے فرشتہ کوئی آنگن میں ضیا

بدلی بدلی نذر آتی ہے بشر کی صورت

صحت الفاظ کی بیمار کتابوں میں نہ ڈھونڈ

جو سوالوں میں نہیں بات، جوابوں میں نہ ڈھونڈ

چار دیواری کے اندر ہے تصوّر گھر کا

جذبۂ حُبّ وطن خانہ خرابوں میں نہ ڈھونڈ

جلوۂ زیست کے ہر موڑ پہ ہے لغزشِ پا

دل کی تسکین کا سامان عذابوں میں نہ ڈھونڈ

وا دریچوں سے چلی آتی ہیں گھُس پیٹھ ہوائیں

بوئے اخلاص نظر بند گلابوں میں نہ ڈھونڈ

ڈال رکھے ہیں جو آنکھوں پہ ہٹا دے پردے

کُھلے بازار میں توُ خود کو حجابوں میں نہ ڈھونڈ

وجہ رسوائی ترا شعر بھی ہو کوئی ضیا

اک جھلک نور سیہ پوش نصابوں میں نہ ڈھونڈ

فوقیت دیتے ہیں دانائی کو نا دانی پر

طنزِ دشوار پسندی ہے تن آسانی پر

جلوہ در جلوہ ہے، کیا جانے، خدا خیر کرے

آئینہ خانے کو حیرت میری حیرانی پر

گھر سے نکلا تو ادھر لائے قدم وحشت کے

سوچ کا سایہ پڑا دشت کی ویرانی پر

ہائے اس شمع کی قسمت، جو بھری محفل میں

رات بھر جلتی رہی سوختہ سامانی پر

کافری جس کو ہو آئینۂ نورِ ایماں

کیوں نہ دل ناز کرے اس کی مسلمانی پر

کفش بردار انہی کا ہوں ضیا، میرا سلام

سعدی و حافظ و خاقانی و قآنی پر

بے شمر سائے کا پاس

ڈوبتا سورج اُداس

کھول کر البم کھُلا

کل بہو تھی آج ساس

سُونگھتی آنکھوں میں دیکھ

کاغذی پھولوں کی باس

مکتبِ غم کا عمل

اکتساب و اقتباس

رات کو تنہائی کی

روشنی کیا آئے راس

کوئی آنسو پی گیا

پانچ دریاؤں کی پیاس

یا مرے جانے کا دُکھ

یا ترے آنے کی آس

صبح منتی ہی نہیں

شام بیٹھی ہے اُداس

پھر وہی قطح و برید

پھر وہی خوف و ہراس

جنگلوں کی بھیڑ میں

پیڑ سب تنہا، اُداس

ساقی و مینا و مے

ہوشمندی کی اساس

میرا گھر بھی ہوتا کاش

تیرے گھر کے آس پاس

چھپتا پھرتا تھا ضیا

درد نکلا دل شناس

لایا تھا مانگ کے میں زیست کے دو چار برس

ختم ہوتا نظر آتا نہیں اب کارِ ہوس

تشنگی اور بڑھا اور بڑھا اور بڑھا

اے گھٹا، اور برس اور برس اور برس

صبح ہونے بھی نہ پائے مگر آنکھیں مند جایں

ظلمتِ شامِ جدائی، مجھے اتنا بھی نہ ڈس

نو کے آگے کوئی گنتی نہیں، مانا، لیکن

ایک کے ساتھ صِفر رکھ دیں تو ہو جاتے ہیں دس

آئی آندھی تو اُڑالے گئی پھولوں کی مہک

اور ایسی گری بجلی کہ بچا خانہ نہ خس

دم نکل جائے، نہ قسمت اگر اس کو کہیئے

خواب دیکھا تھا نشیمن کا مگر پایا قفس

چاند کی مٹی اُٹھا لایا ہے دیوانے کو

اے ضیا گردشِ ایّام پہ قابو ہے نہ بس

(زرینہ شانی کی نا گہانی موت پر)

پا شکستہ رباب ہے خاموش

پردہ پردہ حجاب ہے خاموش

خمکدے میں سکوت کا عالم

خانۂ آفتاب ہے خاموش

تھم گئی کائنات کی گردش

شورشِ انقلاب ہے خاموش

حادثوں کی یہ خود پشیمانی

خلشِ اضطراب ہے خاموش

بے سوالی دلیلِ نا فہمی

آئینہِ لا جواب ہے خاموش

منزلِ ریگزار خاک بسر

تشنگیِ سراب ہے خاموش

اے غمِ دل، نہ شورِ حشر اُٹھا

زندگی محوِ خواب ہے خاموش

بیکراں دشتِ بیکسی میں ضیا

دلِ خانہ خراب ہے خاموش

حلقۂ داغِ عشق دل پر پھینک

سر اُٹھاتا ہوں، کوئی پتھّر پھینک

میں جسے خونِ دل سے لکھتا رہا

وہی نغمہ اِدھر نواگر پھینک

مہر و مہ بہہ گئے لہو ہو کر

اپنے ہاتھوں سے تُو بھی خنجر پھینک

جنم پاتی ہے ان سے نا تہذیب

گندے انڈوں کو گھر سے باہر پھینک

شبنمستاں سجا کے پلکوں پر

ناوکِ غمزہ دل کے اندر پھینک

سطح دریا پہ مستقل ہلچل

تجھ سے کس نے کہا تھا کنکر پھینک

میری تر دامنی کی شرم ذرا

اب ادھر بھی کوئی گلِ تر پھینک

تجھے دو روز جینا ہے تو ضیا

چھیل کر دل سے موت کا ڈر پھینک

گزری جو پچھلی رات کوئی پاس سے مہک

آتی رہی تمام دن مرے انفاس سے مہک

لائی ہے خواب زار میں سورج کی زرد دھوپ

مانگی تھی رات نے تو ہری گھاس سے مہک

ٹوُٹے ہوئے کِواڑ بھی کیا روکتے اُسے

اُڑ کر کہاں گئی رگِ احساس سے مہک

کتنے خزینے دفن ہیں اس میں کُرید یے

مٹی کی آ رہی ہے جو اتہاس سے مہک

کرتی ہے خاص اگنی پریکشا کا اہتمام

شاخِ برہنہ چھین کے بن باس سے مہک

کیوں دل جلوں کو لگتی ہے اچھی، نہ پوچھئے

اُٹھتی چتا میں جلتے ہوئے ماس سے مہک

خنکی ہے چاندنی میں نہ گرمی ہے دھوپ میں

کیسی بہو نے پائی ضیا ساس سے مہک

آنے جانے والے لوگ

سارے بھولے بھالے لوگ

خانوں میں بٹ کر ہی رہے

بھورے، گورے، کالے لوگ

دوڑے لے کے ہاتھوں میں

پتھر، نیزے، بھالے لوگ

نالے، غم کے نغمے ہیں

کیوں نہ کریں پھر نالے لوگ

شورستاں میں خاموشی

تالے لبوں پر ڈالے لوگ

تھے جو اُمیدوں کے امین

نکلے وہی جیالے لوگ

محوِ فسانہ گوئی ضیا

عنوانوں کے پالے لوگ

تھما دو دستِ دعا دستِ چارہ ساز میں تم

سُنو نہ عذرِ دوا درد کے جواز میں تم

تمھیں تلاشنے نکلے گا جب سکوتِ شبی

مِلوگے کھوئے ہوئے نغمگیِ ساز میں تم

طلسم توڑ ہی دیں گے، چھپوگے تا بہ کجا

نگاہِ جلوہ طلب سے حریمِ ناز میں تم

شبوں کی نیند یں اُڑاتے رہو، سجاتے رہو

فسونِ خواب حسیں چشمِ نیم باز میں تم

سُبو و جام کی گردش نہ تم پہ ختم ہو کیوں

کہ سرفراز ہو رندانِ پاک باز میں تم

زمانہ سازیِ دنیا کا کیا گلہ، کیا غم

ہوئے ہو خود ہی گرفتار ہرص و آز میں تم

ضیا ملی تھی دلِ غزنوی کو جس سے تڑپ

وہ خم نہ پاؤگے اب گیسوئے ایاز میں تم

دل میں گنجینۂ جذبات لئے پھرتے ہیں

حسرتِ ذوقِ ملاقات لئے پھرتے ہیں

اُن کا دامن نظر آئے تو کریں نزر اس کی

پلکوں پر اشکوں کی سوغات لئے پھرتے ہیں

مژدۂ منزلِ خورشید نہ دے ہم کو فریب

اپنے ہمراہ ابھی رات لئے پھرتے ہیں

پھر وہی آئینہ خانہ ہے، وہی عکسِ جمال

پھر وہی صورتِ حالات لئے پھرتے ہیں

ان صلیبوں کا صحیفوں میں کہیں ذکر نہیں

ہم جنہیں دوش پہ دن رات لئے پھرتے ہیں

پیاسی دھرتی پہ برس کر ہی بنیں گے دریا

بادل آنکھوں میں جو برسات لئے پھرتے ہیں

کتنے بھولے ہیں کہ بیداریِ تفریق میں وہ

اے ضیا، خوابِ مساوات لئے پھرتے ہیں

جب پلٹ کر دشت سے آتا ہوں میں

گھر کا دروازہ کُھلا پاتا ہوں میں

لوگ کیوں دانا سمجھتے ہیں مجھے

اپنی نادانی پہ اِتراتا ہوں میں

زندگی کا راز کھولوں کس طرح

خواب کو تعبیر بھر پاتا ہوں میں

شیر تو سب جنگلوں کو جا چکے

دل کو اب شعروں سے بہلاتا ہوں میں

مجھ پہ دروازے ہیں اتنا خندہ زن

کھڑکیوں سے جتنا گھبراتا ہوں میں

چاندنی اور دھوپ اُترتی ہے مگر

آسماں دھوکے میں ہے، چھاتا ہوں میں

اے ضیا، پت جھڑ سے کیا لینا مجھے

گل کھلاتا، باغ مہکاتا ہوں میں

تُو مان جائے گا، مرا دل مانتا نہیں

میں جانتا ہوں، تو بھی مجھے جانتا نہیں

دیکھو اُٹھا کے تو نظر آ جائے جانے کون

چہرہ مرا اب آئینہ پہچانتا نہیں

کیوں آپ پوچھتے ہیں، خدارا نہ پوچھیے

کچھ تو ہے اس کا نام مگر شانتا نہیں

اتنی سی بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی

دشمن ہے، دوست میں جسے گر دانتا نہیں

بجھ جائے گا یہ طاق میں جلتا ہوا دیا

کیا ہوگا اس کے بعد کوئی جانتا نہیں

معلوم ہے کہ بدلیں گے اک دن مرے بھی دن

کوئی نہیں ہے میرا خدا مانتا نہیں

جس پر یقین رکھتا نہ ہو دل مرا ضیا

وہ بات اپنے دل میں کبھی ٹھانتا نہیں

چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

کسی بھی منزلِ مقصود کو دوام نہیں

بلا کشی میں مری ہاتھ موسموں کا بھی ہے

شکستِ توبہ فقط اعتبارِ جام نہیں

گھروندے ریت کے بن بن کے مٹتے جاتے ہیں

گمانِ خام خیالی، خیالِ خام نہیں

نہ گیسوؤں ہی کی چھاؤں، نہ عارضوں ہی کی دھوپ

یہ صبح صبح نہیں ہے، یہ شام شام نہیں

زمانہ سازی انسان دشمنی، توبہ

رواج و رسمِ محبّت کا احترام نہیں

خلا سے تا بہ خلا کورچشم اندھیرے میں

یہاں بھی جشنِ چراغاں کا اہتمام نہیں

کشاں کشاں چلا آیا ہوں اُن کے در پہ ضیا

اب اُن سے کیسے کہوں مجھ کو اُن سے کام نہیں

نظر نظر سے ملانا کوئی مزاق نہیں

مِلا کے آنکھ چُرانا کوئی مزاق نہیں

پہاڑ کاٹ تو سکتا ہے تیشۂ فرہاد

پہاڑ سر پہ اُٹھانا کوئی مزاق نہیں

اُڑانیں بھرتے رہیں لاکھ تائرانِ خیال

ستارے توڑ کے لانا، کوئی مزاق نہیں

لہو لہو ہے جگر، داغ داغ ہے سینہ

یہ دو دلوں کا فسانہ کوئی مزاق نہیں

ہوائیں آج بھی آوارہ و پریشاں ہیں

مہک گلوں کی اُڑانا کوئی مزاق نہیں

ہزاروں کروٹیں لیتے ہیں آسمان و زمیں

گرے ہوں ؤں کو اُٹھانا کوئی مزاق نہیں

یہ اور بات بُلائیں نہ اپنی محفل میں

مگر ضیا کو بُھلانا کوئی مزاق نہیں

وحشتیں بازاروں میں ارزاں ہوئیں

گھر میں آ کر دردِ بے درماَب ہوئیں

پھیر لی تُونے نگاہِ التفات

میری ساری مشکلیں آساں ہوئیں

آئینہ خانوں میں عکس آرا ہوں کیا

خاک میں کیا صورتیں پنہاں ہوئیں

آ گیا مقتل میں دیوانہ کوئی

بستیوں کی بستیاں ویراں ہوئیں

تھی وہ بیگانہ روی یا گمرہی

کفر کی سب دعوتیں ایماں ہوئیں

کیا کہوں ان داستانوں کو میں، جو

بے نیازِ کاوشِ عنواں ہوئیں

بے مزہ ضبط و تحمل پر ضیا

لذتیں فریاد کی نالاں ہوئیں

دیر سے سوئی ہوئی راہ جگا لوں تو چلوں

پتھروں، کانٹوں کو ٹھوکر سے ہٹا لوں تو چلوں

کتنا پُرہول سفر ٹوُٹتے رشتوں کا ہے

زخمِ دل پنجۂ درماں سے چُھڑا لوں تو چلوں

صبح کی پہلی کرن ہے مرا مقصدِ نگاہ

پیچ و خم گیسوۓ شبگوں کے نکاوں تو چلوں

کہکشاں سے بھی اُدھر جانا ہے آخر مجھ کو

آبلہ پائی کو صد رنگ بنالوں تو چلوں

برہمی زیست کی ہے اس کے بھٹک جانے میں

طفلکِ وقت کو اُنگلی سے لگالوں تو چلوں

کون جانے یہ مرے کام کہاں آ جاۓ

سر پہ بارِغم و اندوہ اُٹھالوں تو چلوں

ازسرِ نو دلِ صد پارہ و ویراں میں ضیا

طلبِ منزلِ مقصود سجالوں تو چلوں

دردیلے گیت اُن کو بھری محفل میں سناتے ڈرتا ہوں

دل کے رِستے زخموں کو بازار میں لاتے ڈرتا ہوں

جلتی دھوپ کے سائے میں جنما ہوں، مرنا بھی ہے مگر

ٹھنڈے کالے سورج میں کیوں آگ لگاتے ڈرتا ہوں

جن میں مجھے ایک ایک قدم پر نا کامی، رسوائی ملی

شہرِ جنوں کے اُن کوچوں میں آتے جاتے ڈرتا ہوں

عقل کی حق گوئی پہ بھروسہ ہو نہ مجھے ایسا تو نہیں

کچھ ایسی ہی بات ہے جو دل کو سمجھاتے ڈرتا ہوں

ہجر کا موسم کیا آیا، پھولوں کی رعنائی بھی گئی

آہیں بھرتے، نالے کرتے، اشک بہاتے ڈرتا ہوں

کس سے پوچھوں، کون بتائے، صبح ہوئی تو کیا ہوگا

مدّت سے جو بُجھے ہوئے تھے دِیے جلاتے ڈرتا ہوں

خود کو کھو کر ہی میں نے اکدن پا یا تھا اُن کو ضیا

لیکن اب اُن کو کھو کر میں خود کو پاتے ڈرتا ہوں

دل کو اب حوصلۂ پاسِ وفا ہے کہ نہیں

غمِ بے چہرگیِ حرص و ہوا ہے کہ نہیں

جانتا ہوں کہ نہیں تیرے سِوا کوئی خدا

سوچتا ہوں کہ کوئی میرا خدا ہے کہ نہیں

ہمہ تن گوش زمانہ ہے ازل سے، جانے

شور کی بھیڑ میں میری بھی صدا ہے کہ نہیں

میری آنکھوں میں ذرا ڈال کے آنکھیں دیکھو

درد میں چارہ گرو، اپنی دوا ہے کہ نہیں

میری غزلوں کا تاثّر، مری نظموں کا فسوں

ہر ادا حُسن کی اک حُسنِ ادا ہے کہ نہیں

میں گنہگار ہوں، سُولی پر چڑھا دو مجھ کو

جسے کہتے ہیں محبّت، وہ سزا ہے کہ نہیں

اے ضیا، میں بھی کوئی بھٹکا ہوا راہی ہوں

دور تک سلسلۂ لغزشِ پا ہے کہ نہیں

دیارِ شوق میں جو سر اُٹھائے پھرتے ہیں

سروں پہ اپنے وہ پتّھر اُٹھائے پھرتے ہیں

نہ میکدہ ہے، نہ ساقی، مگر یہ تشنہ لبی

کہ رند ہاتھوں میں ساغر اُٹھائے پھرتے ہیں

سکوں تلاشنے والے ہم ایسے دیوانے

ازل سے شورشِ محشر اُٹھائے پھرتے ہیں

قفس کا رنگ نہ اُڑ جائے کیوں، کہ مُرغِ اسیر

دل و دماغ سے ہر ڈر اُٹھائے پھرتے ہیں

کہاں وہ درد جو کرتا ہے آپ اپنی دوا

کہاں وہ زخم جو نشتر اُٹھائے پھرتے ہیں

نکل کے خلد سے، کیا جانے، کس لئے اب تک

ہم آسماں کو زمیں پر اُٹھائے پھرتے ہیں

شدید تر جنہیں احساسِ تشنگی ہے ضیا

وہ قطرہ قطرہ سمندر اُٹھائے پھرتے ہیں

ورقِ دل پہ لہو رنگ سی تحریریں ہیں

کوئی پڑھ لے تو یہی شوق کی تفسیریں ہیں

اور کچھ بھی نہ ہو آغوشِ طلب میں لیکن

غم کی پرچھائیاں ہیں ، زخموں کی تنویریں ہیں

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، سمجھے گا کون

میرے ہاتھوں کی لکیریں ہی تو تقدیریں ہیں

میرے پنجاب کی شاداب زمینوں کی قسم

اسی مٹی میں کئی رانجھے کئی ہیریں ہیں

ننگے پاؤں جو نکل آیا ہوں گھر سے لیکن

رینگتے راستے، ڈستی ہوئی زنجیریں ہیں

موجۂ سیلِ حوادث نہ کہیں شورِ نشور

یہ جزیرے کوئی دیوانوں کی جاگیریں ہیں

اے ضیا ان میں کوئی رنگِ غزل بھر دیتا

شہرِ افرنگ میں تصویریں ہی تصویریں ہیں

ننگی ٹہنی کی پیاس کچھ بھی نہیں

شجرِ بے لباس، کچھ بھی نہیں

گرتی دیواریں، ٹوُٹتے رِشتے

فاصلوں کی اساس، کچھ بھی نہیں

جان تھی ایک، سو تجھے دے دی

سچ ہے، اب میرے پاس کچھ بھی نہیں

توُ ذرا اپنی ذات میں تو اُتر

آس، امید، یاس، کچھ بھی نہیں

رہزنی نے مچائی ہے وہ لوُٹ

رہنماؤں کا پاس، کچھ بھی نہیں

راز کھولا، کھُلی ہواؤں نے

بند کمروں کی آس کچھ بھی نہیں

اے ضیا، پتھّروں کی بستی میں

کانچ کا یہ گلاس کچھ بھی نہیں

دم، ہوا کے سوا کچھ اور نہیں

بُت، خدا کے سوا کچھ اور نہیں

شعر فہمی کہاں، کہ اب لب پر

مرحبا کے سوا کچھ اور نہیں

آدمی ہے مگر ادھوُرا ہے

پا رسا کے سوا کچھ اور نہیں

راہِ ہستی کی منزلِ موہوم

نقشِ پا کے سوا کچھ اور نہیں

ابتدا دردِ دل کی کیا کہیے

انتہا کے سوا کچھ اور نہیں

دلِ وحشی کی کفر سامانی

کربلا کے سوا کچھ اور نہیں

اپنی پہچان آپ پیدا کر

توُ ضیا کے سوا کچھ اور نہیں

اُترا جب ما ہتاب پانی میں

آ گیا انقلاب پانی میں

مچھلیوں میں تھی بجلیوں کی چمک

واہ وا، آب و تاب پانی میں

باد بانوں کی تشنہ کامی سے

کشتیاں آب آب پانی میں

موج در موج، قطرہ در قطرہ

رقصِ ریگِ سراب پانی میں

خوش ہیں دریا میں پھینک کر پتّھر

وہ ہوئے جو خراب پانی میں

نیٹ پیتے تھے کل جو آج وہی

ڈالتے ہیں شراب پانی میں

اے ضیا، کہتے ہیں کہ آن بسا

چاندنی کا شباب پانی میں

خانقاہوں میں داغ جلتے ہیں

میکدوں میں ایاغ جلتے ہیں

ٹوُٹ جائے نہ ظلمتوں کا طلسم

حادثوں کے چراغ جلتے ہیں

آمدِ صبح کی اُمید لیے

طاقچوں میں چراغ جلتے ہیں

کیا بُجھے گی یہ آگ اشکوں سے

دل جلوں کے دماغ جلتے ہیں

کیوں نہ اُن پر خزاں کا دھوکا ہو

جن بہاروں میں باغ جلتے ہیں

آئینہ آئینہ یہ جلوۂ شوق

چہرہ چہرہ چراغ جلتے ہیں

اپنی ہی آگ میں نہ جانے کیوں

اے ضیا، باغ و راغ جلتے ہیں

پردۂ رخ اُٹھا دیا، تابِ نظر نہ جائے کیوں

آنکھ خرابِ دید کی اشکوں سے بھر نہ جائے کیوں

فصلِ بہار جا چکی، پھولوں میں رنگ ہے نہ بو

نشہ جو تھا چڑھا ہوا، سر سے اُتر نہ جائے کیوں

آہ، یہ تیرگیِ شب، اُف، یہ سُکوتِ مستقل

دل مرا ہیبت آشنا، سائے سے ڈر نہ جائے کیوں

حُسن و شباب کی قسم، جام و شراب ہیں بہم

گردشِ مہر و ماہ بھی آج ٹھہر نہ جائے کیوں

نامہ بروں کو کیا ہوا، بیٹھے ہیں پر شکستہ سے

ان کی خبر نہ آئے کیوں، میری خبر نہ جائے کیوں

وقت کا سیل دم بدم، شام و سحر رواں دواں

وقت گزر ہی جائے گا، وقت گزر نہ جائے کیوں

بزمِ حیات کی یہی رسمِ قدیم ہے ضیا

سر بفلک جو آئے وہ خاک بسر نہ جائے کیوں

شاخ ارمانوں کی ہری ہی نہیں

آنسوؤں کی جھڑی لگی ہی نہیں

سایۂ آفتاب میں اے رند

تیرگی بھی ہے، روشنی ہی نہیں

قیدِ ہستی سے کس طرح چھوٹیں

راہ کوئی فرار کی ہی نہیں

میرے شعروں میں زندگی کی ہے

وہ حقیقت جو شاعری ہی نہیں

وہ ہُنر آدمی کی فطرت ہے

جو ہُنر عیب سے بری ہی نہیں

دھرم، آدم گری سکھاتا ہے

صرف تقسیمِ آدمی ہی نہیں

گنتا ہوں دل کی دھڑکنیں کہ ابھی

تُونے آواز مجھ کو دی ہی نہیں

اُسے عرفانِ زہد کیا ہو ضیا!

مست آنکھوں سے جس نے پی ہی نہیں

گھروندے ریت کے آبِ رواں پر جو بناتے ہیں

ڈبو کر ساری دنیا کو وہ خود بھی ڈوب جاتے ہیں

وہ ریزے سنگ کے سورج کو جو آنکھیں دکھاتے ہیں

انہیں راتوں کے سائے اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں

گلا ترکِ تعلق کا محبّت میں نہیں واجب

بہت نازک جو ہوتے ہیں وہ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

وہ ماضی کے امانت دار ہیں، فردا کے پیغمبر

نئی تعمیر جو بنیادِ کہنہ پر اُٹھاتے ہیں

نکالے تیرے دیوانوں نے پَر پُرزے خدا حافظ

ستاروں پر کمندیں پھینکتے ہیں، گرد اُڑاتے ہیں

یہ رازِ عشق بھی ہے نا شگفتہ پھول کی خوشبو

کوئی ہم سے چھپاتا ہے، کسی سے ہم چھپاتے ہیں

نفس کی آمد و شد کا ہے اب دار و مدار ان پر

خنک جھونکے ہوا کے جو دریچوں سے در آتے ہیں

ہوئی مدّت کسی نے کر لیا زیرِ قدم لیکن

ضیا، ہم آسماں کو آج بھی سر پر اُٹھاتے ہیں

بیتے ہوئے لمحات دوبارا مجھے دے دو

بھولی ہوئی یادوں کا سہارا مجھے دے دو

دشوار ہے منزل پہ پہنچنا مرا تنہا

اُنگلی سے لگا لے وہ سہارا مجھے دے دو

سب ٹوُٹے ہوئے رشتے تو منھ موڑ چکے ہیں

اندر سے مرے کس نے پکارا، مجھے دے دو

پھرتا ہے بھٹکتا ہوا جنگل کی نوا میں

نغمہ جسے میں نے تھا سنوارا، مجھے دے دو

جینے کی کسے فکر ہے، مرنے کا کسے غم

جو میرے مقدّر میں ہے تارا، مجھے دے دو

ساحل ہے نہ ساحل کی تمنّا مرے دل میں

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا تو دھارا مجھے دے دو

دیکھو تو مری آنکھوں میں پھر ڈال کر آنکھیں

پھر سرمگیں پلکوں کا اشارا مجھے دے دو

جلوؤں کی جڑیں پھوٹی ہیں خوابوں کے نگر میں

پلکوں پہ سجالوں وہ نظارا مجھے دے دو

ٹھہری ہوئی جھیلوں نے ڈبویا ہے کئی بار

بہتی ہوئی ندّی کا کنارا مجھے دے دو

لایا ہوں ضیا مانگ کے دل درد کا مارا

سودائے محبّت کا خسارا مجھے دے دو

مرہمِ جذبۂ احساسِ وفا دے جاؤ

دلِ پُردرد کے زخموں کی دوا دے جاؤ

گرمیِ بزمِ قیامت ہے تمھارے دم سے

جی میں جو آئے گناہوں کی سزا دے جاؤ

کوہِ ظلمت پہ کھُلی آنکھیں لیے آیا ہوں

دعوتِ روشنیِ ہوشربا دے جاؤ

عافیت کا یہ سکوں، دل کو لحد کا پیغام

شورشِ موجۂ طوفانِ بلا دے جاؤ

کھڑکیاں آکے نہ کھولو گے قفس کی کب تک

دم گھٹا جاتا ہے، اب تازہ ہوا دے جاؤ

قیمتِ شعر نہ پوشیدہ رہے دنیا سے

کورچشمی کو جو تم قدرِ ضیا دے جاؤ

ڈوبتے تاروں، شکستِ ساز کی باتیں کرو

چارہ ساز و ہمدم و ہمراز کی باتیں کرو

جس کے دم سے ہے دلوں میں تازہ زخموں کی بہار

اس آلِ شورشِ آغاز کی باتیں کرو

پانوں میں زنجیر، لیکن فکر تو آزاد ہے

بامِ گردوں پر اُڑو، پرواز کی باتیں کرو

کچھ تو غمہائے زمانہ کا بھی درماں چاہیے

مستیِ چشمِ سراپا ناز کی باتیں کرو

شور و شیون کا اُٹھا کر حشر، کیا تم کو ملا

اب کسی بیٹھی ہوئی آواز کی باتیں کرو

پتھّروں سے سر کو پھوڑو، جھیلو رسوائی کا غم

کس نے یہ تم سے کہا تھا راز کی باتیں کرو

پھر وہی نا صور کہنہ ہو گیا تازہ ضیا

پھر اسی دیرینہ چارہ ساز کی باتیں کرو

وہ برساتیں یاد کرو

بھیگی راتیں یاد کرو

بھُول بھی جاؤ میلے دن

اُجلی راتیں یاد کرو

تیشہ، پتھّر، نہرِ شیر

ہجر کی راتیں یاد کرو

جو اُتری تھیں آنگن میں

غم کی براتیں یاد کرو

عشق میں دل نے جیت کے بھی

کھائیں ماتیں یاد کرو

کس نے کہا تھا تم سے ضیا

بھُولی باتیں یاد کرو

آندھی چلی تو پیڑ جڑوں سے اُکھڑ گئے

ساتھی بنائے تھے جو، وہ مجھ سے بچھڑ گئے

دل سے لگا لیا انھیں، تھے آپ ہی کے دین

کچھ ایسے حادثے جو میرے پیچھے پڑ گئے

کرتا زمیں کو جُھک کے نہ کیوں آسماں سلام

میری غزل کے شعروں میں تارے سے جڑ گئے

دھو لوں انھیں ذرا عرقِ انفعال سے

دھبے لہو کے جو مرے دامن پہ پڑ گئے

جن کے وجود کا کوئی مصرف نہ فائدہ

کچھ ایسے بھی شمر تھے جو شاخوں پہ سڑ گئے

شاید ادھر سے گزرا ہے پھر کوئی زلزلہ

آباد تھے جو صدیوں سے وہ شہر اُجڑ گئے

اب کیا گلہ خرابیِ صحت کا اے ضیا

کہتا تھا جن کو اپنا وہی مجھ سے لڑ گئے

موجِ غم گل کتر گئی ہوگی

ندی چڑھ کر اُتر گئی ہوگی

غرق ہونا تھا جس کو وہ کشتی

ساحلوں سے گزر گئی ہوگی

ہم زمیں والوں کی جو پہلے پہل

آسماں پر نظر گئی ہوگی

آئینہ خانے میں بہ ہر صورت

آب و تابِ گہر گئی ہوگی

حادثوں، آفتوں، مصائب سے

زندگی کیا جو ڈر گئی ہوگی

اس سفر میں خلاؤں کے تا دُور

حسرتِ بال و پر گئی ہوگی

اے ضیا، بات عقل و دانش کی

دل کا نقصان کر گئی ہوگی

چھوڑا ہے جو اسلاف نے دھن کم تو نہیں ہے

یہ ورثۂ تہذیبِ کُہن کم تو نہیں ہے

کیا حشر اُٹھاتے ہیں ہوَا و ہوَس و حرص

دھرتی کے مٹانے کو گگن کم تو نہیں ہے

اُمید زیادہ کی تھی، مایوس ہوں ورنہ

اس شہر میں کچھ قدرِ سخن کم تو نہیں ہے

سورج کی تمازت ہو کہ ہو برف کی خنکی

آنکھوں کی نمی، دل کی جلن کم تو نہیں ہے

اتنی بھی ہے کیا مدح و ثنا زہرہ جبیں کی

بالا نظرو، غنچہ دہن کم تو نہیں ہے

خورشید کہ مہتاب، نمودار ہو کوئی

اب کالی گھٹاؤں کی گھُٹن کم تو نہیں ہے

بِکتا ہے ضیا اشکوں کی قیمت یہاں اخلاص

بازار میں دھوکے کا چلن کم تو نہیں ہے

وہ ایک پتہّ جو شاخِ شجر پہ تنہا ہے

اُسی کے قدموں پہ سر آندھیوں کا جھکتا ہے

حصارِ جسم سے باہر نکل کے دیکھ ذرا

یہ آب و خاک کا پیکر عجب تماشا ہے

تمام منظرِ عالم نگاہ کا ہے فریب

زمیں بھی وہم ہے اور آسماں بھی دھوکا ہے

اُسی کو میں لیے بیٹھا ہوں بند مُٹھّی میں

ہوا کا جھونکا جو گھر میں مرے در آیا ہے

کوئی مسیح، نہ منصور ہے زمانے میں

صلیب و دار کا لیکن ہنوز چرچا ہے

میں اپنی لاش لئے در بدر پھرا تو مگر

کسی نے پوچھا نہ تیرا بھی کیا ارادا ہے

کہاں اندھیرے میں کھو جاتا ہے نہ جانے ضیا

جو سایہ دھوپ میں ہر لہجہ ساتھ رہتا ہے

آئینۂ دل حُسنِ توازُن کی طرح ہے

یہ بھی تو ہوا خواہِ وفا اُن کی طرح ہے

آواز سی جو ٹوُٹنے کی آتی ہے دل کے

بے لفظ مہک بہکی ہوئی دھُن کی طرح ہے

بِکھرا ہوا، سمٹا ہوا، جانا نہ کسی نے

جو دائرہ ہے اصل میں وہ شُن کی طرح ہے

سمجھو تو ہے باطل، جو نہ سمجھو تو حقیقت

تہذیبِ رواں، رفتہ تمدُن کی طرح ہے

پتّوں سے گزرتی ہے ہوا سہمی ہوئی سی

لکڑی کو جو کھا جائے یہ اُس گھُن کی طرح ہے

دھرتی پہ جنم لینے ہی والا ہے کوئی کرشن

پھر دل میں مرے وسوسہ ارجُن کی طرح ہے

تشہیرِ وفا کر کے ضیا، ہم ہوئے رُسوا

اب اُن کا تعلُق بھی تعاوُن کی طرح ہے

بہار میں جو گریباں کے تار ہو کے چلے

وہ لمحے، شمعِ شبِ انتظار ہو کے چلے

مزہ تو جب ہے کہ میرے چمن کے آنگن میں

ہوائے خلد، نسیمِ بہار ہو کے چلے

جنوں کا جشن منایا بگولوں نے اُٹھ کر

فصیلِ شہر سے جب ہم فرار ہو کے چلے

جو سر اُٹھا نہ سکے بارِنا مرادی سے

وہی تو در سے ترے کامگار ہو کے چلے

اُنہی کی خیرگی ہے وجہ کورچسمیِ دہر

وہ شعلے طور کے جو آشکار ہو کے چلے

جو گھر سے نکلے شہادت کی مستیاں لے کر

صلیب اُٹھائے، ہوا خواہِ دار چلے

ضیا، فلک سے ستارے تو اشک پلکوں سے

شُمار کرتا رہا، بے شُمار ہو کے چلے

گلریز و بادہ بار گھٹا ساوانوں کی ہے

اے دستِ شوق، خیر کہاں دامنوں کی ہے

ریکھا ئیں لکشمن کی نہ ہیں بان رام کے

سیتاؤں پر نگاہ مگر راونوں کی ہے

ہر سمت زہر اُگلتا یہ ماحولِ بے شجر

شہروں کے آس پاس ضرورت بنوں کی ہے

خاموش شمعِ منزلِ مقصود ہے، نہ پوچھ

جو شکل رہبروں کی وہی رہزنوں کی ہے

خود اپنی آگ ہی میں ستی بھسم ہو گئی

کیا تابِ ضبط و صبر یہ شِو کے گنوں کی ہے

جھکنے سے عار، ٹوٹنے کا شوق ہے جنھیں

پھندوں سے آشنائی انھیں گردنوں کی ہے

آئنے کی تو بات ہی کچھ اور ہے ضیا

پتھّر بھی توڑ دے وہ نظر دشمنوں کی ہے

ہوا زنجیروں میں جکڑی گئی ہے

بڑی آوارہ تھی، پکڑی گئی ہے

پرندے بھی، درندے بھی پریشاں

کہاں جنگلات کی لکڑی گئی ہے

در و دیوار پر بُنتی تھی جالے

نہ جانے وہ کہاں مکڑی گئی ہے

ہوا اب جیل کی کھانی پڑے گی

ہماری چوری تو پکڑی گئی ہے

بدلتے موسموں سے کوئی پوچھے

کب آم آیا ہے، کب ککڑی گئی ہے

کلائی تک پہنچ جائے سلامت

بہن کی بھائی کو رکھڑی گئی ہے

ازل میں جو اُٹھائی تھی ضیا نے

اُتر کر سر سے وہ گٹھڑی گئی ہے

ٹُوٹا ہوا دل رقص میں مستی کی طرح ہے

اُجڑا ہوا یہ شہر، تو بستی کی طرح ہے

ساون کی گھٹا اُڑ کے جو آئی ہے چمن میں

میخانہ بکف شاہدِ مستی کی طرح ہے

کھائے ہی چلا جاتا ہے، ہچکولے بہ ہر موج

دل ڈوب کے اُبھری ہوئی کشتی کی طرح ہے

آکاش سمجھتا ہوں جسے ہے وہی پاتال

اب میری بلندی بھی تو پستی کی طرح ہے

کعبہ بھی صنم خانہ بھی ملتا ہے اسی میں

آرائشِ دل حُسن پرستی کی طرح ہے

چھیڑا ہے جسے شوخ نگاہی نے دمِ صبح

وہ گیت ضیا، نغمۂ ہستی کی طرح ہے

جب مجھے میرے غم کی خبر ہو گئی

اُڑ گئی نیند اور آنکھ تر ہو گئی

رات کے خواب دیکھا کیا عمر بھر

آنکھ کھولی تو سمجھا سحر ہو گئی

کورچشمی تو دُنیا کی مشہور تھی

پردہ اُٹھا تو وہ دیدہ ور ہو گئی

درد بڑھ کر ہوا آپ اپنی دوا

زخم کو حاجتِ چارہ گر ہو گئی

حیف، وہ اشک پلکوں پہ جو تھم گیا

ہائے، وہ آہ جو بے اثر ہو گئی

ان گنت دھڑکنیں دل کی سُنتا رہا

یہ طوالت اگر مختصر ہو گئی

وہ دیا لے کے آئے ہیں آخر ضیا

میرے مرنے کی اُن کو خبر ہو گئی

دلوں میں درد، سروں میں جو سودا رکھتے تھے

وہی تو پاس زیادہ وفا کا رکھتے تھے

نقاب اُٹھا کے جو آئے تھے انجمن میں، وہی

حجاب دار نگاہوں کا پردہ رکھتے تھے

صلیب و دار پہ ہیں ان کے خون کے بوسے

خدا کے بندے، بھروسہ خدا کا رکھتے تھے

گلی میں، کوچے میں، بازار میں تھی بارشِ نور

ہمیں تو گھر میں تھے، جن سے وہ پردہ رکھتے تھے

بہار آنے پہ ہم دے کے اپنا خونِ جگر

چمن کی شاخوں پہ کانٹوں کو تازہ رکھتے تھے

نہ تھی خبر کہ دلِ سنگ کب دھڑکنے لگے

توقعات کا دامن کشادہ رکھتے تھے

زمانہ سازیِ دنیا کو جان کر بھی تو ہم

ضیا اُمیدِ کرم بے ارادہ رکھتے تھے

کہو وقت کے کوہ سے اب وہ سرکے

ہواؤں کو لایا ہوں مُٹھی میں بھر کے

کھُلا چھوڑ کر میں گیا تھا، جو پلٹا

تو تھے بند دروازے میرے ہی گھر کے

سُناتی رہے شام اپنی کہانی

ابھی تو پیام آ رہے ہیں سحر کے

جبینوں کی تقدیر سجدے ہی سجدے

کہیں نقشِ پا تو کہیں سنگِ در کے

نہیں میں تو ہے کون شایانِ رحمت

گناہوں سے توبہ کی میں نے ہی ڈر کے

وہی اوج پرواز کی پستیاں ہیں

وہی حوصلے مرغِ بے بال و پر کے

وہ دل، درد جس کا ہے آپ اپنا درماں

اُٹھائے گا احسان کیا چارہ گر کے

اب اُلجھی ہوئی زلفیں سلجھا رہے ہیں

بہت خوش تھے وہ مجھ کو پریشان کر کے

خلاؤں کے تنہا اندھیروں میں مجھ کو

پُکارا ہے میری اَنا نے بِکھر کے

یہ دیوارِ حائل کی جادوگری ہے

نہ ہو تم اُدھر کے، نہ ہیں ہم اِدھر کے

بغیرِ بصیرت بصارت نہیں کچھ

ضیا سب تماشے ہیں حُسنِ نظر کے

تونے نظروں کو بچا کر اس طرح دیکھا مجھے

کیوں نہ کر جاتا بھری محفل میں دل تنہا مجھے

شاخ در شاخ اب کوئی ڈھونڈا کرے پتہّ مجھے

میں تو خود ڈرتا ہوں، آندھی نے نہیں توڑا مجھے

لغزشِ پا نے دیا ہر گام پر دھوکا مجھے

تا درِمنزل توُ ہی اے جذبِ دل پہنچا مجھے

صورتِ آئینہ حیرت سے وہ تکتا رہ گیا

آئینہ خانے میں جس نے غور سے دیکھا مجھے

اے کہ تیری رونمائی، میری ہستی کی دلیل

ہو کے خود روپوش توُنے کر دیا پیدا مجھے

چھین کر ساقی سے پیتا ہوں کہ دنیا دیکھ کر

چھین کر لے جاےگی مجھ سے کہاں صہبا مجھے

ایک جادہ، ایک منزل، ہمقدم ہمدم مگر

میں نہیں سمجھا تجھے، توُ بھی نہیں سمجھا مجھے

حادثوں کی پے بہ پے یلغار سے دلتنگ ہے

میں چلا، اے مستیِ جام و سُبو لینا مجھے

آنکھ اصنامِ خیالی نے جو کھولی صبحدم

پتھّروں کے شہر میں کھویا ہوا پایا مجھے

مار ہی ڈالےگی اکدن کاروبارِ زیست میں

تنگدامانی تری، اے وسعتِ دنیا مجھے

جلوۂ در پردہ کی تھی چشمِ بینا کو تلاش

کون اب جلوے کو ڈھونڈے، مل گیا پردا مجھے

دے کے دل خوش تھا کہ میں نے پالیا رازِ حیات

حیف، ارزانیِ غم، مہنگا پڑا سودا مجھے

عمر بھر ملتی رہی تیری عدالت سے نہ پوچھ

میری نا کردہ گناہی کی سزا کیا کیا مجھے

برگِ گل پر رقص شبنم کا یہ منظر اے ضیا

اب تو ہر قطرے میں آتا ہے نظر دریا مجھے

عشرتِ چارہ گری ہے درد سامانی مجھے

در پہ لے آتی ترے غم کی فراوانی مجھے

کاروانِ ابرِ رحمت اُترا آنگن میں ترے

شور اٹھا کوُ بہ کوُ "پانی مجھے" پانی مجھے

قیس آسا چھانتا پھرکون خاکِ دشتِ نجد

راس آ جاتی جو میرے گھر کی ویرانی مجھے

میری آوارہ سری تو بھی اجل سے سرکشی

لے ہی پہنچی تا حدِ ہستی پریشانی مجھے

گنگناتی رات کے سائے میں جب آنکھیں کھُلیں

خواب کی تعبیر تھی تحریرِ پیشانی مجھے

تھا خریدار آپ اپنا، آتے ہی بازار میں

جھُک گئیں نظریں سمجھ کر یوسفِ ثانی مجھے

قطرے قطرے، ذرّے ذرّے نے کیا اپنا حساب

وجہ ارزانی ہوئی میری گرانجانی مجھے

بن کے سائل ہاتھ پھیلایا تھا جس کے سامنے

سونپ دی اُس نے ترے در کی نگہبانی مجھے

چھوُ کے جو کلیوں کو آئی، اُس ہوائے باغ نے

دی قفس میں دعوتِ ذوقِ غزل خوانی مجھے

شاملِ حال اے ضیا، اُس کا کرم تھا، ورنہ کیوں

دل کی ہر مشکل نظر آئی اک آسانی مجھے

وہ آرتی بجلی کی اُتارا نہیں کرتے

جلتے ہیں مگر جگنو اُجالا نہیں کرتے

انمول ہے جو شے اُسے بیچا نہیں کرتے

دیوانے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے

جو پیشِ نظر رکھتے ہیں منزل کو شب و روز

پیچھے کی طرف مُڑ کے وہ دیکھا نہیں کرتے

پلکوں پہ سجا لیتے ہیں پیاس اشکوں کی ہم لوگ

چڑھتے ہوئے دریا کو تو رُسوا نہیں کرتے

سائے پہ ہم آ بیٹھتے ہیں دھوپ سے جل کر

کیا ہے پسِ دیوار، کُریدا نہیں کرتے

جلتے ہوئے سورج کی طرف دیکھنا ہے جرم

جلتے ہوئے سورج کو تو دیکھا نہیں کرتے

چلنے سے انہیں کام ہے، چلتے ہیں مسافر

رستہ کہاں جاتا ہے، یہ سوچا نہیں کرتے

ممکن نہیں باہر کو وہ اندر سے سمجھ پائیں

اندر سے جو باہر کا تماشا نہیں کرتے

زخموں پہ مرے چارہ گرو، رکھو نہ مرہم

یہ زخم ہیں وہ جِن کا مداوا نہیں کرتے

داغوں کے نشانات اُبھر آئے ہیں دل پر

اب سرمرے قدموں پہ جھکایا نہیں کرتے

میں چُپ ہوں ضیا، اِس لیے غیروں سے وہ مِل کر

کہتے ہیں بُرا مجھ کو، وہ اچھا نہیں کرتے

ہواؤں نے اُمڈتے بادلوں کو گدگدایا ہے

درونِ سینۂ گیتی اُتر کر مور ناچا ہے

تکلّف بر طرف، تابِ تماشہ کس میں ہے، ورنہ

دو آنکھوں پر پڑا ہے جو وہ پردہ کوئی پردہ ہے

تمنّا نے لگا دی آگ جو بُجھتی نہیں یارب

بلا نوشی کا یہ عالم، مگر دل اب بھی پیاسا ہے

بدلتے موسموں کا یہ شکست و ریخت کا عالم

مگر کیا ٹوُٹتا جو دو دلوں میں غم کا رشتہ ہے

پرستش چڑھتے سورج کی تو کرتے ہیں سبھی، لیکن

اُٹھا کر آنکھ کس نے ڈوُبتے سورج کو دیکھا ہے

نہ کچھ تیری خبر ہے اور نہ کچھ اپنا پتہ مجھ کو

بتا، کس کام کی پھر تو تماشہ گاہِ دنیا ہے

زوال آمادگی، تکمیلِ توفیقِ تمنّا کی

اُترتے پانیوں میں چڑھتی ندی کیا تماشہ ہے

جمود و کسل کا عالم، نفیِ زندگی ٹھہرا

نہ دل میں کوئی ارماں ہے، نہ سر میں کوئی سودا ہے

الگ چلتے کناروں کو جو اک رستے پہ لے آئے

کوئی ایسا بھی طوفاں، اے سکونِ سطح دریا ہے

مرے اندھے کنویں میں دوُر کی آواز تھی گویا

بھری محفل میں اُن کا پوچھنا – توُ بھی ضیا کیا ہے

پَرِ ہُما اک مہان پَر ہے

پرندہ اونچی اُڑان پر ہے

زمیں کو پامال کرنے والا

دماغ جو آسمان پر ہے

اُتر کے دھرتی پہ آ نہ جائے

وہ دھوپ جو سائبان پر ہے

تعاقبِ رادھیکا میں کب تک

وہ صبح جو شام بان پر ہے

کبھی تو آئے گی میرے دل میں

وہ بات جو ہر زبان پر ہے

وہ لمحہ لمحہ غمِ محبّت

جو شکوہ شکوہ زبان پر ہے

بگڑ کے جب سے گیا ہے کوئی

بنی ہوئی دل پہ، جان پر ہے

قدم حدّ لامکاں میں لیکن

نظر ابھی تک مکان پر ہے

کھُلے گا تو حرف و صوت ہی سے

جو قلقلِ ابجد زبان پر ہے

سمندروں سے کہاں بُجھے گی

وہ تشنگی جو اُٹھان پر ہے

ضیا یہ کیسی ہے بدگمانی

شک اُس کو میرے گُمان پر ہے

گلفشاں موج جو ئبار آئی

تشنگی کا لباس اُتار آئی

واہ وا، ذوقِ گلشن آرائی

خوں چھڑکتی رگِ بہار آئی

موت نے آ کے در پہ دی دستک

زندگی آج ساز گار آئی

قہقہوں میں نہ چینخیں کھو جائیں

ساتھ لے کر خزاں بہار آئی

دلکشی بیتے موسموں کی نہ پوچھ

یاد کیوں اُن کی بار بار آئی

خلشِ نوکِ خار کا احساس

کیا چمن زار میں بہار آئی

کوُے قاتل کو کر گئی باطل

وہ حقیقت جو سوۓ دار آئی

اُس جبیں پر ہے سورجوں کی چمک

سجدہ گا سے جو داغدار آئی

کیا قفس میں وہی چمن کی ہوا

لے کے پیغامِ نو بہار آئی

اہلِ دل دشمنوں سے پوچھیں تو

دوستی کس کو ساز گار آئی

دن کی رُسوائیوں سے ڈرتی ہوئی

رات در پردہ پردہ دار آئی

یاد اس ہموطن کی جانے کیوں

ایک بار آئی، بار بار آئی

سر چُھپاتے کہاں اندھیرے ضیا

عرش سے روشنی ہزار آئی

کیا ساون بھادوں کی جھڑی ہے

توبہ کی صورت بگڑی ہے

انگ انگ تو بول رہی ہے

گوری کیا خاموش گھڑی ہے

سب کچھ دل نے سہا لیکن اب

سر پہ مصیبت آن پڑی ہے

کانٹے بوئے، پھول اگائے

عشق عجب جادو کی چھڑی ہے

غزلیں کہیں اور نظمیں لکھیں

کہنے کی بات اب بھی پڑی ہے

سایہ کہاں مجنوں کو ڈھونڈے

ریگستاں کی دھوپ کڑی ہے

دھند میں سارا کمرہ کھویا

باہر شب بھر برف پڑی ہے

بھیج کوئی پھر میر و مرزا

پھر اُردو پر بھیڑ پڑی ہے

ٹھٹھر رہی ہے ساری دلّی

شملہ میں وہ برف پڑی ہے

آنکھیں کھول ضیا، دیکھ اُٹھ کر

دستک دروازے پہ کھڑی ہے

دلِ ناتواں تو کھلونوں سے بہل جاتا ہے

کوئی بھی سانچہ ہو، ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے

کارواں وقت کا تھمتا نہیں، تھمتا ہے اگر

غازۂ یاد رخِ زیست پہ مل جاتا ہے

واپس آتا نہیں "درباسا" کا جیسے کوئی شاپ

تیر اک بار کماں سے جو نکل جاتا ہے

شمع کے جلنے پہ ہوتا ہے اُجالا لیکن

رشک کی آگ میں پروانہ تو جل جاتا ہے

طائرِ فکر کی پروازِ سرافراز نہ پوچھ

آسمانوں سے بھی آگے یہ نکل جاتا ہے

کسے معلوم کہ سہما ہوا دل سینے میں

سُن کے شہنائی کی آواز مچل جاتا ہے

فصلِ گل آتی ہے گلشن میں لگاتی ہوئی آگ

کوئی دیوانہ سوئے دشت نکل جاتا ہے

آمد و رفت کا دنیا میں لگا ہے میلہ

آج آتا ہے ضیا، جو وہی کل جاتا ہے

راہزن راہنما ہو جیسے

نا خدا موجِ بلا ہو جیسے

محفلِ شعر میں پڑ جاتی ہے جان

داد بھی کوئی دوا ہو جیسے

پھیر لی آنکھ بھری محفل میں

میں نے کچھ مانگ لیا ہو جیسے

پھر دلِ سوختہ میرا شب بھر

صفتِ شمع جلا ہو جیسے

دیکھ کر بھی نہیں دیکھا اُن کو

پردہ آنکھوں پہ پڑا ہو جیسے

گلیوں کوچوں میں کوئی پھرتا ہے

کھو کے دل ڈھونڈ رہا ہو جیسے

یاد کرتا ہوں تجھے شام و سحر

تُو مجھے بُھول گیا ہو جیسے

دل شکستہ ہوں، کوئی ٹوُٹ کے پھر

شاخ سے پتّہ گِرا ہو جیسے

چلتا بازار میں دیکھا ہے ضیا

کھوٹا سکّہ بھی کھرا ہو جیسے

ہوئی صبح، پائے گئے بے سہارے

وہ جو رات بھر دیکھتے تھے سہارے

جئے کوئی کب تک کسی کے سہارے

بڑے جان لیوا ہیں جھُوٹے سہارے

سہاروں پہ جینا بھی جینا ہے کوئی

ہمیں ایک دن مار دیں گے سہارے

اندھیرے سے باہر نکل کر تو دیکھو

تمنّا نے کیا کیا اُجالے سہارے

زمانے میں دیں گے خوشی کیا کسی کو

سہارے ہیں خود غم کے مارے سہارے

سفینہ ڈبو ہی دیا بیچ دریا

بڑے تھے مگر نکلے چھوٹے سہارے

صلیبوں پہ رہزن چڑھا دیں گے ہم کو

اگر مِل گئے رہبروں کے سہارے

یہ کشتی شب و روز کی بہتی جائے

ہمارے سہارے، تمھارے سہارے

نظرکش، دل آرا ضیا کس قدر ہیں

کراں تا کراں پھیلے، بِکھرے سہارے

حُسن کی بارگاہ کیا کہیے

عشق سے رسم و راہ کیا کہیے

ہم نے سورج کو کر دیا ننگا

تب و تابِ نگاہ کیا کہیے

تختۂ دار پر چڑھا تو ہُوا

سرخرو روسیاہ کیا کہیے

دلِ شاعر کو زندہ رکھتی ہے

داد و تحسیں کی چاہ کیا کہیے

کوئی مر مر کے یوں بھی کرتا ہے

زندگی کو تباہ کیا کہیے

خود پرستی و پست کرداری

ہوسِ عزّ و جاہ کیا کہیے

بیگناہی کا کچھ جواز بھی ہے

نہیں کوئی گواہ کیا کہیے

دھوپ میں پانوں جلتے ہیں دن بھر

رات کو روسیاہ کیا کہیے

پُرسِشِ حال کو وہ آئے ضیا

اُن سے کہیے تو آہ کیا کہیے

پھول جب لے کے بجلیاں نکلے

شاخ در شاخ آشیاں نکلے

صبح تک میرے ساتھ ساتھ رہے

رات کے سائے مہرباں نکلے

دل نے چھیڑے جو گیت روزِ ازل

رگِ احساس پر گراں نکلے

کر دیا مجھ سے ہمکلام مجھے

آئنے میرے ہمزباں نکلے

جو چھڑکتے رہے نمک دل پر

وہی زخموں کے رازداں نکلے

زندگی کا سفر نہ ختم ہوا

آگے منزل سے کارواں نکلے

جس کو تھی تیری دید کی اُمید

اشک اُس آنکھ سے کہاں نکلے

اے ضیا، آپ بھی با یں غمِ دل

آشنائے غمِ جہاں نکلے

حُسن کے رُخ پر آنکھ گڑی ہے

چھوٹا منہ اور بات بڑی ہے

نوٹوں کے انبار لگے ہیں

چاندی کی دیوار کھڑی ہے

کون کسی کا دُکھ بانٹے گا

سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

تم نے مجھ سے پھیرلیں آنکھیں

کیسا لمحہ، کیسی گھڑی ہے

پیاسی دھرتی آگ بُجھالے

مدھماتی ساون کی جھڑی ہے

نورِ سحر کا رستہ روکے

سج دھج کر کیوں رات کھڑی ہے

بکھرا بکھرا، رشتہ رشتہ

ٹوٹی ٹوٹی، کڑی کڑی ہے

مصلوبی ہے جس کا حاصل

وہی ضیا انمول گھڑی ہے

میری دُنیا نے نگاہوں سے گرایا ہے مجھے

اے فلک، توُنے بہت سر پہ اُٹھایا ہے مجھے

پھاڑ کر کپڑے نکل آیا ہوں باہر گھر سے

ہوش اب میکدۂ زیست میں آیا ہے مجھے

دُور تک نجد کے صحرا میں نہیں کوئی درخت

دھوپ میں جائے اماں میرا ہی سایہ ہے مجھے

نفح و نقصان میں جو فاصلہ تھا ہو گیا طے

دل نے کھویا ہے اگر درد نے پایا ہے مجھے

کوئی آدم گری عہدِ محبّت دیکھو

اپنا آتا ہے نظر وہ جو پرایا ہے مجھے

خود پہ لے آیا ہوں ایمان یہی کیا کم ہے

اب یقیں اپنے سوا کس پہ خدایا ہے مجھے

یہ تری جلوہ نمائی، یہ ترا حُسنِ نظر

میں نمودار ہوا ہوں تو چُھپایا ہے مجھے

زندہ رہنا تو ہے اس بات کی کیا بحث ضیا

میں خود آیا ہوں یہاں یا کوئی لایا ہے مجھے

وہ تصوّر میں جو تصویر بنا بیٹھا ہے

لگتا ہے ماتھے کی تحریر بنا بیٹھا ہے

کرنے جاتا ہوں اُسی سے گلۂ بیخوابی

میرے خوابوں کی جو تعبیر بنا بیٹھا ہے

ختم ہوتا ہی نہیں یہ سفرِ منزلِ شوق

راستہ پانوں کی زنجیر بنا بیٹھا ہے

اے ضیا، بزمِ سخن میں یہ تماشہ دیکھا

کوئی غالب تو کوئی میر بنا بیٹھا ہے

دل میں پیدا کششِ دار و رسن ہوتی ہے

اور کیا چیز شہادت کی لگن ہوتی ہے

اللہ اللہ یہ ہوا خواہیِ اربابِ چمن

تا قفس دسترسِ سرد و سمن ہوتی ہے

آج بھی گرمیِ محفل ہے لہو سے دل کے

آج بھی دعوتِ تہذیب کہن ہوتی ہے

ظلمتِ یاس کے سینے میں اُترنے کے لیے

تیر بن جاتی ہے ایسی بھی کرن ہوتی ہے

میرے اشعار وہاں دیتے ہیں لو شمع صفت

اے ضیا، گرم جہاں بزمِ سخن ہوتی ہے

کیسے تھے عشق باز جو سر پھوڑتے رہے

ہم پتھّروں کے شہر میں دل جوڑتے رہے

گاڑی تھی پنکچول، اُسے مِس کر سکے نہ ہم

رستوں میں پیچ و خم تھے، مگر دوڑتے رہے

ہم نے دیے جلائے تھے جو راہ میں وہی

رخ آندھیوں کا اپنی طرف موڑتے رہے

بیکار زندگی سے لیا ہم نے انتقام

سِگریٹ کے کش لگا کے دھواں چھوڑتے رہے

مانگے سے بھیک رحم کی وہ دیں گے کیا ضیا

پا کے ہمیں جو تنہا، ستم توڑتے رہے

تڑپ سجدوں کی ہے ہر در کے پیچھے

کبھی اِس در کبھی اُس در کے پیچھے

زمانہ کارواں بنتا گیا ہے

کسی رہزن، کسی رہبر کے پیچھے

خلل خوابوں میں کیسا آ گیا ہے

بگولے اُٹھ رہے ہیں گھر کے پیچھے

فصیلِ شہر تک لے آیا تھا عزم

پلٹتے بھی تو کیا ہم ڈر کے پیچھے

نہ جانے کیوں تعاقب میں ابھی تک

اندھیرے ہیں شہہ انور کے پیچھے

یقینِ آبلا پائی سلامت !

پھر اُگ آئے ہیں کانٹے گھر کے پیچھے

ضیا صاحب! چلوگے بچ کے کب تک

کھڑی ہے موت ہر پتّھر کے پیچھے

متفرّق اشعار

ان سے اُمّید پاسدارئِ قول

واہ، زود اعتباریاں دل کی

جانتے پہچانتے بھی، بے تعلّق بے نیاز

اس دیارِ اجنبی میں کتنے ہیں اغیار لوگ

وہ کافر ادا جس پہ ایمان قرباں

خدا جانے کیوں آج یاد آ رہا ہے

منتظر نگاہوں کو منزلوں کا سودا ہے

بے چراغ راہوں پر گامزن اندھیرا ہے

کچھ نکھرا ہوا روپ ہے برسات سے پہلے

کچھ چمکی ہوئی دھوپ ہے برسات سے پہلے

جہاں تنہائیاں سر پھوڑتی ہوں

وہ شہر سنگ کیا آباد کرتا

آسماں سے ابر برسا رات بھر

آنسوؤں کو کوئی ترسا رات بھر

جمی تھی گردِ کدورت دلوں کی بستی میں

کسی کی یاد بھی آئی تو سوچ کر آئی

تمھارا دیکھنا آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں

مجھے اندھیرے میں اک روشنی نظر آئی

مجھ تک آتے آتے خالی مینا بھی پیمانہ بھی

کتنا مہنگا ہے یارو، یہ ساقی کا یارانہ بھی

شیشوں کے گھر میں رہ کر کھوئے ہیں کس نے ہوش و حواس

پتّھر سے پھوڑے سر اپنا، ہے کوئی دیوانہ بھی

باتوں باتوں میں ٹھنی بات کی بات

ایسی بگڑی، نہ بنی بات کی بات

خود اُتارے گی کسے تھا معلوم

بال کی کھال یہی بات کی بات

ڈرتا تھا جس کے تصوّر سے ضیا

چل گئی چال، وہی بات کی بات

آزاد غزل

حوادش کی ایسی چلی تُند آندھی، کمر جُھک گئی

گرانباریِ زخمہاے عبادت سے دیر و حرم کی کمر جُھک گئی

روشنی بُجھ گئی اور صحرائے ظلمت کے بے پیڑ سائے میں انسان گم ہو گیا

آنکھ حیرت کے دریا میں ڈوبی تھی ڈوبی رہی کمر جُھک گئی

کلی پھول بننے سے پہلے کٹی شاخ سے کانٹا بن کر گری خاک پر

جھپکتی پلک پر دمکتے ہوئے شبنمی آنسوؤں کی نظر کیا اُٹھی کمر جُھک گئی

ہجومِ مصائب نے ہر موڑ ہر گام پر اس طرح روکا ٹوکا

ابھی تک نہ ہو پائی تھی جو سیدھی کمر جُھوک گئی

آزاد غزل

سر بفلک کوہساروں پر/ سے چڑھتے / اُترتے زینے

برفانی ماحول سے گھبراتے، ڈرتے زینے

شور مچاتی، خنک ہواؤں سے پنجہ لڑاتے

پگڈنڈی کے سر اپنا الزام دھرتے زینے

لے جاتے اونچائی پر کبھی رہگیروں کو

اور کبھی ان کے ساتھ پستی میں گر کے بکھرتے زینے

صحرا صحرا، ذرّے ذرّے، کی خشکی نچوڑ کر

دریا دریا گھاٹ گھاٹ سے گیلا پانی بھرتے زینے

ٹوٹتے، وسعت کے رشتوں کو جوڑنے کی اُمیدوں میں

منزل کے بیگانہ دُھن کے نقوشِ پا سے سنورتے زینے